ماھنامہ
حنا
ستمبر 2022

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیات

انشاء نامہ

افسانے

ناولٹ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط وکتابت وترسیل زرکا پتہ، ماهنامه حنا پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

مستقل سلسلے

درجہ اول کے اشتہارات

انشاء نامہ

ابن انشا

درجہ وار اشتہارات اردو صفحات میں نووارد ہیں، ہم حیران ہوا کرتے ہیں کہ جب یہ نہ ہوا کرتے تھے تو لوگ بنگلے کیسے بیچتے یا خریدتے تھے، نام کیسے بدلا جاتا تھا کہ مجھے آئندہ گھسیٹا خاں کی بجائے مرزا صبغتہ اللہ بیگ کہا جائے، مشفق والدین، سعادت مند اولاد کو کیسے عاق کرتے اور ان کے لین دین سے بے تعلقی کا اظہار کرتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ شادیاں کیسے ہو جاتی تھیں؟ ہماری تحقیق یہ ہے کہ ان اشتہاروں میں سے اور کوئی پڑھا جائے یا نہ پڑھا جائے، ضرورت رشتہ کا اشتہار ضرور پڑھا جاتا ہے اور اس میں زید، بکر، بچے، بوڑھے، شادی شدہ، غیر شادی شدہ کی تخصیص نہیں۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سب ہی ایک ہوئے

عرضی نویسوں کی زبان کی طرح ضرورت رشتہ کے اشتہاروں کی عبارت بھی قریب قریب مقرر ہے، دوشیزہ ہمیشہ قبول صورت پابند صوم و صلوٰۃ اور سلیقہ مند ہوتی ہے اور اس کا ایک معزز گھرانے سے تعلق ہوتا ہے، مرد ہے تو پڑھا لکھا ہے، بی اے پاس لڑکی کے لئے ایم اے پاس شوہر ڈھونڈا جاتا ہے۔

ان اشتہاروں کا تجزیہ کرنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں شکل عقل کا ہونا ضروری نہیں، یہ آنی جانی اور فانی چیزیں ہیں۔

پرانے زمانے میں شادی کا مسئلہ بہت آسان تھا، دروپدی کے سوئمبر میں فقط اتنی سی شرط تھی کہ یہ جو اوپر چکر میں مچھلی گھوم رہی ہے، اس کا عکس پانی میں دیکھ کر تیر سے اس کی آنکھ پر نشانہ لگایا جائے، یہ کوئی نہ پوچھتا تھا کہ نشانہ لگانے والا کانا ہے یا لنجا ہے، کالا ہے یا گورا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی سے روایت ہے کہ لیلیٰ کی ماں نے بھی مجنوں کا حسب نسب، سکونت، ولدیت وغیرہ نہیں پوچھے تھے۔

بس یہی کہا تھا۔

کہ بیٹا تو جو کر لے ایم اے پاس

بلا دقت میں بن جاؤں تیری ساس

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے، ورنہ آج کل ایک ایک یونیورسٹی سے اتنے ایم اے نکل رہے ہیں کہ لیلیٰ کی ماں کے لئے بڑی مشکل ہو جاتی، اسی طرح فرہاد میاں نے رشتہ مانگا تو شیریں نے فقط یہ شرط کی کہ یہ سامنے والا پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر لے آؤ تو بندی کو عذر نہیں۔

پرانے لوگ بہت احتیاط کرتے تو سوجھ بوجھ کا امتحان لینے کے لئے پہیلیاں اور معمے دیتے، کبھی نہ پوچھتے کہ کیا تنخواہ ہے، کرائے کے

مکان میں رہتے ہو یا اپنا ہے، پنجاب کے ہو یا یوپی کے، شیعہ ہو یا سنی، ایسا ہی ایک شخص ایک بار کسی راج کماری سے شادی کا طلبگار ہو کر آیا، راج کماری کو بالعموم سخت پردے میں رکھا جاتا تھا، چشم فلک بھی اسے دیکھنے کو ترستی تھی، لیکن اس امیدوار نے اتفاقاً اس حسن جہاں سوز کو جھروکے میں کھڑے دیکھ لیا، بہت فرار کی کوشش کی لیکن پہرے کا انتظام سخت تھا، آخر وہ سوال و جواب کے لئے بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔

وزیر اعظم نے حسب دستور قابلیت جانچنے کے لئے سوال پوچھنے شروع کیے۔

''دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟'' امیدوار نے حساب لگا کر کہا۔

''سات''۔ وزیر اعظم نے کہا۔

''شاباش، اب دوسرے سوال کا جواب بھی ٹھیک دو تو تم کامیاب سمجھے جاؤ گے۔''

وہ کون سا جانور ہے جس کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں اور جو بھونکتا ہے؟'' امیدوار نے تھوڑا سا غور کرنے کے بعد کہا۔

''طوطا۔''

لیکن اس کی یہ ترکیب نہ چلی، درباریوں نے مبارک سلامت کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا اور دھوم دھام سے شادی کر کے راج کماری سے گلوخلاصی کرائی۔

شادی کے متعلق حکماء کا قول ہے کہ جو کرے پچھتائے جو نہ کرے، پچھتائے۔ یہ ایک حلقہ ہے کہ ہر باہر والے اندر جانے کے لئے بے چین ہیں اور اندر والے باہر نکلنے کے لئے مضطرب، عام لوگوں کے لئے شادی ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا ایک دن مقرر ہے، چاہے نیند رات بھر آئے یا نہ آئے، آج تم کل ہماری باری ہے۔

اشتہاری شادی میں شروع میں دونوں طرف خلوص زوروں پر ہوتا ہے۔ نہ صرف خط و کتابت بلکہ بیشتر حالات بھی صیغہ راز میں رہ جاتے ہیں، رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہے کہ دلہن صاحبہ ویسے ٹھیک ہیں، لیکن گنجی ہیں اور دولہا صاحب جو کالی عینک لگائے رہتے ہیں نقطہ نظر کے لحاظ سے موحد ہیں، ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں، بیوی بے شک کھری سید زادی ہے لیکن ان کے دادا کا بریلی میں ہیئر کٹنگ سیلون تھا، دولہا صاحب البتہ مغل ہیں، بیوی جن کو ان کے ظفر الملت والدین بے بی کہہ کر یاد کرتے ہیں، پہلی جنگ عظیم کے واقعات کی چشم دید گواہ ہیں اور میاں آٹھوں گانٹھ گریجوایٹ ہیں، لیکن ان کی ڈگری تقسیم کے ہنگامے میں ہندوستان میں رہ گئی، انگریزی بولنے، لکھنے پڑھنے سے احتراز ایسا اختیاری بھی نہیں جیسا کہ بتایا تھا، اردو کی محبت کے علاوہ اس کی اور وجہیں بھی ہیں۔

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے

زیست نے ہم سے بے وفائی کی

یہ خیال کرنا غلط ہوا کہ ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہو سکتیں، بلکہ زیادہ کامیاب یہی ہوتی ہیں، دونوں طرف آگ برابر لگی ہوتی ہے، دونوں کے خضاب کی مدت ایک وقت ختم ہوتی ہے، دونوں کے صیغہ راز سے ایک ساتھ پردہ اٹھتا ہے، نتیجہ یہ کہ داستانوں کے کردار کی طرح بقیہ عمر ہنسی خوشی گزار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

✦✦✦

ختم نبوت ﷺ زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد **پاکستان پائندہ باد**

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

ہونے والی قیمتی متاع جیسی لڑکی کو چھوڑ کر وہ بھی اس حال میں چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں رکھ تھا۔ وہ گری تھی تو اس کے چہرے سے حجاب سرک گیا تھا۔ محسن تو پاگل ہو گیا تھا۔ اس حالت میں اسے روبرو پا کے۔

وہ اسی کی گاڑی سے ٹکرائی تھی اور اتنی شدید زخمی ہوگئی تھی کہ وہ خون سے نہا گیا تھا چہرا لحموں میں گم خاک و خون میں لبریز اپنی بیلا کو وہ پھر بھی بخوبی پہنچان چکا تھا۔ گاڑی سے نکل کر وہ دیوانہ وار اس کی سمت ایسے لپکا کہ خود موٹر سائیکل سے ٹکراتا بچا۔ یہ بوکھلاہٹ فطری تھی۔

''محسن......''

پیچھے سے وہ چلائی رہ گئی مگر محسن نے آپ کی پکار سنی کہاں۔

''بیلا...... بیلا......''

وہ اس کے بے ہوش وجود کو بانہوں میں بھرے واپس گاڑی تک آیا تھا۔ آیت ششدر بیٹھی تھی، بھونچکی سی اسے دیکھتی تھی۔ تو یہ تھی بلا اس کی...... محسن نے اسے پچھلی سیٹ پہ ڈالا تھا۔ عجیب سی وحشت اس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

''اسے سنبھالیں بھابی...... ہمیں جلدی ہاسپٹل پہنچنا ہوگا۔''

وہ مضطربانہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ کی سمت بھاگا۔ آیت کے اپنے حواس مختل ہو چکے تھے۔ اس نے چونک کر بے ہوش لڑکی کی سمت نگاہ کی۔ جو ہر لمحہ سر سے بہتے خون میں نہا رہی تھی۔ اسے یہ صورت کچھ شناسا محسوس ہوئی۔ مگر ذہنی حالت کچھ اس طرح ناگفتہ بہ تھی کہ وہ پہچان کا مرحلہ طے نہ کر سکی۔

''دھیان سے چلاؤ محسن...... ٹیک اٹ ایزی......''

تیز رفتار کے باعث بار بار بریک لگاتا تو گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرا جاتے۔ آیت کو اس لڑکی کے ساتھ اپنی دو جانوں کی بھی فکر پڑ گئی۔ محسن بار بار پلٹ کر جس وحشت بھری اور بے تاب نظر وں سے دیکھتا تھا وہ اس کے نزدیک اس لڑکی کی زندگی کی قیمت کا اندازہ آیت کو بخوبی کروا رہا تھا۔ ہاسپٹل پہنچ کر بھی محسن کی کیفیت میں تبدیلی نہیں آسکی تھی۔

''پریشان مت ہو محسن...... بلکہ دعا کرو۔''

اسے بے چینی سے ٹہلتے پا کر آیت نے ہمدردانہ انداز میں تسلی دی۔ وہ محض نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ہونٹ ضبط کی کوشش میں سختی سے بھینچ رکھے تھے۔

''دعا کرتا ہوں...... اللہ میرے زندگی لے لے مگر اسے کچھ نہ ہو۔''

محسن کی آواز بھرا گئی تھی۔ آیت سکتے میں آ گئی۔ اندر زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا لڑکی کے نصیب پہ اسے ایک بار پھر رشک آیا۔ وہ بے دم انداز میں وہاں بنچ پہ بیٹھ گئی۔ محسن اسی طور بے قرار ٹہل رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی حسرت سے دیکھتی رہی۔

✧✧✧

گوشۂ ذہن میں بے ربط خیالوں کا ہجوم
چشمِ تنہائی سے چن کر وہی بے باک سے اشک
لمحۂ وصل کے اس عہد فراموش کو

یاد کرتا ہے سسکتا ہے بلکتا ہے بہت
آج بھی شدت مسافت کے کٹھن رستوں میں
جلتی بجھتی ہوئی بے نام رفاقت کی شعاع
عارضِ وقت کی سرخی پہ چھلک پڑتی ہے
پھر سے ملنے کی یہ موہوم طلب اور تڑپ
آج بھی ذہن کے گوشوں میں چمک اٹھتی ہے

حواس کی دنیا میں لوٹا تو خود سے بھی خفا نظر آیا۔ نشے کی شدید طلب اسے آپے سے باہر کرتی رہی۔

''آپ کدھر سے آگئیں......؟''

ماں کو دیکھ کر وہ اور ناراض ہو گیا۔

''میں کہاں ہوں......؟ کون لایا یہاں مجھے......؟''

وہ بھڑک بھڑک جا رہا تھا۔

''میں لائی ہوں...... خدارا اپنے اوپر رحم کرو سلو......''

اماں پھر سے رونے لگیں۔

''ابھی تو نہیں مرا ہوں...... پھر رونے کا مقصد......؟''

وہ اور برہم ہو گیا۔ جلال کچھ اور بڑھنے لگا۔ والدہ نے کلیجہ تھام لیا۔

''ایسی منحوس باتیں نہ کرو۔ اتنا شوق ہے مرنے کا تو پہلے ماں کی موت کی دعا مانگ لے۔''

انہوں نے شدید غصے میں اسے ڈانٹا۔

''میرا فون کہاں ہے...... سب نوکر کہاں مر گئے......؟''

''اب بس کر دو سلو...... جنون کی بھی حد ہوتی ہے کوئی...... تم اسپتال میں ہو۔ نوکر کدھر سے آ جائیں گے......''

والدہ نے خفگی سے اسے جتلایا۔ وہ یکدم ساکن ہو گیا۔ پھر زور سے اپنا ہاتھ تکیے پہ مارا تھا۔ ڈرپ کی سوئی اپنی جگہ چھوڑ گئی۔ نس لیک ہوئی تو خون کا فوارہ چھوڑ پڑا۔ والدہ کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

''سلو...... خدا کے لئے ایسا مت کرو...... نرس نرس......''

وہ گھبرا کر پہلے اس کی منت پھر نرس کو پکارنے لگیں۔

''کوئی میرے پاس نہ آئے...... ورنہ انجام کا ذمہ دار خود ہوگا۔ اماں...... اپنا فون دیں مجھے......''

یشفع جو راؤنڈ پہ ادھر ہی آ رہی تھی شور سن کر بھاگی آئی۔ وہ بپھرا ہوا شیر لگا اسے۔ کنٹرول سے باہر۔

''انس او کے...... شور بند کریں۔ یہ ہاسپٹل ہے۔''

اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پہ واپس کھینچتے ہوئے وہ اتنے بارعب انداز میں بولی تھی کہ سلمان نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا تھا۔

''کون ہو تم......؟''

وہ سرخ دہکتی آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔

''نظر نہیں آ رہا ڈاکٹر ہوں...... ادھر لیٹیں''

وہ نخوت سے بولی۔ اس سے قبل کہ سلمان کچھ سمجھتا اس نے انجکشن اس کے بازو میں گھونپ دیا۔ سلمان بے اختیار مزاحمت ترک کرتا بستر پہ ڈھیر ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا اسے......؟''

والدہ سہم کر کبھی سلیمان کو کبھی اسے دیکھنے لگیں۔

''فکر نہ کریں...... یہ ضروری تھا ماں جی...... ورنہ یہ خود کو لازماً نقصان پہنچاتے۔ بہت ہلکی ڈوز بے نشہ کی...... سمجھ لیں سو رہے ہیں موصوف۔''

وہ مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں تسلی دے رہی تھی۔ اماں نے سرد آہ بھری۔

''جیتی رہو بچی......''

انہوں نے دل سے دعا دی وہ سر جھکائے سلمان کو تکتی رہی۔

''انہیں ٹھیک ہونا ہو گا اینگری مین...... یہ ضروری ہے۔''

اس کی خمیدہ پلکوں پہ گہری نگاہ ڈال کر وہ آہستگی سے پلٹ گئی تھی۔ والدہ اسے ابھی بھی دعائیں دے رہی تھیں۔

+++

جو اداس ہیں تیرے ہجر میں جنہیں بوجھ لگتی ہے زندگی
سر بزم یوں انہیں دیکھ کر تیرا مسکرانے کا شکریہ
تیری یاد کس کس بھیس میں میرے شعر و نغمہ میں ڈھل گئی
یہ کمال تھا تیری یاد کا مجھے یاد آنے کا شکریہ
جو دنیا بھر کا اصول تھا وہ اصول تو نے نبھا دیا
یہ رسم تیری ہے معتبر تیرے بھول جانے کا شکریہ

مطلع صاف شفاف تھا۔ سورج کی کرنیں دھرتی پہ جس سے اتری تب ہی زیمل نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں اور گویا تب ہی محسن نے سکھ کا سانس بھرا تھا۔ ورنہ اس سے قبل جب ڈاکٹر نے آ کر بتایا تھا کہ چوٹ شدید نہیں ہے سر کے جس حصے میں چوٹ آئی وہ خطرناک نہیں۔ خون البتہ بہت ضائع ہو چکا ہے مگر ان کی بے ہوشی کی وجہ چوٹ سے زیادہ خوف ہے۔ کچھ یہ اپ سیٹ ہونے کی وجہ سے بھی طویل بے ہوشی میں چلی گئیں۔ ابھی حواس میں لوٹیں گی تو بالکل ٹھیک ہوں گی۔ بس آپ کو ان کی ڈائٹ کا خیال کرنا ہو گا یا پھر انہیں خوش رکھنے کی بہت کوشش کرنی چاہیے۔''

مگر محسن تو تب بھی ہاتھ پیر چھوڑے رہا تھا۔

''اب تو ریلیکس ہو جاؤ۔''

آیت نے اسے ٹہوکا۔ وہ مضطرب کا مضطرب ہی رہا۔

''جب تک یہ آنکھیں نہیں کھولتی کیسے ریلیکس ہو جاؤں......''

وہ منہ سے بولا بھی تو کیا۔ آیت نے گہرا سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''یہ بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے......؟''

وہ رشک سے پوچھ رہی تھی۔

''ہرگز نہیں...... بلکہ میری شکل دیکھ کے ایسے ڈرتی ہے گویا بہت خوفناک ہوں میں......''

محسن نے کھسیا کر حقیقت بتائی۔ آیت بے اختیار ہنس دی۔

''مگر وہ کیوں......؟''

''بہت ریزرو ہے۔ شاید دنیا سے بہت الگ تھلگ ہے اس لیے۔''

وہ جھینپ کر بتا رہا تھا۔

''تمہیں ملی کیسے......؟''

آیت کو دلچسپی پیدا ہوئی۔

''ابھی کہاں ملی ہے......''

محسن جیسے کہاں کھو گیا۔ آیت اس کی دیوانگی پہ عش عش کرنے لگی۔

''میرا مطلب ہے پہلی بار کہاں دیکھا تھا۔''

''ایسے ہی روڈ پہ...... گھبرائی ہوئی ہرنی جیسی لگی تھی مجھے...... جو جنگل سے بھٹک گئی ہو...... ایسا ہر اس آنکھوں میں رہتا ہے ہر دم...... معصومیت ختم ہے اس پر۔''

''ہوش میں آئی ہے تو اس کی فیملی کے بارے میں پوچھ کر انہیں خبر کرنی ہو گی۔ پھر ہم فارغ...... میز کا کتنی بار فون آ چکا ہے۔ میں نے نہیں بتایا تمہاری محبوبہ کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔''

وہ مزے لے کر بتا رہی تھی۔

''دعا کریں...... اسے جلدی ہوش آ جائے۔''

وہ پھر بے تاب ہونے لگا۔

''آ جائے گی...... مگر جو تم نے بتایا...... بہتر ہے تم فوراً اس کا سامنا نہ کرنا۔ مجھے ڈر ہے کہیں دوبارہ نہ حواس گم کر بیٹھے......''

آیت کی شرارت پہ محسن اسے مصنوعی ناراضگی سے دیکھنے لگا اور واقعی جب وہ ہوش میں آئی محسن نے اسے ہی اندر بھیجا تھا۔

''میں تو مذاق کر رہی تھی......''

آیت نے اسے ٹوکا مگر اس نے گردن نفی میں ہلا دی تھی۔

''مگر...... میں سنجیدہ ہوں۔ ابھی کم از کم میرا سامنا ٹھیک نہیں ہے۔''

آیت کاندھے اچکا کر اندر آئی تو پہلے مرحلے پہ ہی چونک گئی تھی۔

''تم......''

وہ غیر یقینی بھی تھی اور متحیر بھی۔ زیمل نے چونک کر گردن موڑی اور اسے روبرو پا کے کچھ لمحے ساکن نظروں سے تکتی رہی پھر جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''آئمہ......''

وہ اسے کبھی آیت نہیں کہتی تھی۔ ہمیشہ آئمہ کہا کرتی۔ اس وقت بھی اسے دیکھ کر خود پہ ضبط نہیں کر سکی۔ اس سے لپٹ کر بے ساختہ روتی چلی گئی۔

''تم...... کہاں سے آ گئیں...... تم یہاں کیسے آئمہ......''

خاصی دیر بعد خود کو سنبھالا تو یہ فطری سوال تھا۔ آیت بردباری سے مسکرائی۔

"بھول گئی تم...... میں تو اس شہر سے تھی۔ تم تھی پہاڑوں کی بیٹی۔ یہاں پرستان کی پری کا کیا کام......"

اس کے چھیڑنے کا انداز وہی بے تکلفانہ تھا۔ زیمل جواب میں سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

"بابا کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ وہاں سب میری جان کے دشمن تھے۔ بابا کی وصیت تھی یہاں نہ رہوں...... سو در در بھٹک رہی ہوں۔"

اس نے آنسو پونچھے۔ آیت عجیب ملال میں گھر گئی۔

"کب کی بات ہے...... تم نے مجھے کیوں یاد نہیں کیا زیمل......"

وہ خفا نظر آنے لگی۔ زیمل نے یاسیت سے سر جھکا لیا۔

"جن ناگفتہ حالات میں وہاں سے نکلنا پڑا تھا مجھے کچھ بھی ساتھ نہیں لا سکی۔ تمہارا کوئی کانٹیکٹ نمبر میرے پاس ہوتا تو تمہیں زحمت دیتی......"

سخت اور کڑا وقت یاد کرتی وہ انہی کرب انگیز لمحات میں مبتلا تھی۔

"یعنی...... اب تم بالکل اکیلی ہو...... یار...... بس بہت ہو گئی۔ میں تمہیں اور دکھ کھانے نہیں دوں گی۔ تم اب تک جہاں بھی جس حال میں بھی رہو...... اب میرے ساتھ چلو۔"

آیت نے اتنی محبت اتنی اپنائیت سے کہا تھا کہ زیمل مشکور ہوئے بغیر نہیں رہ سکی مگر وہ یوں اس پہ بوجھ بھی نہیں بننا چاہتی تھی۔

"پلیز...... آئمہ ایسے نہیں کرو۔ پتا نہیں تمہارے پیرنٹس کو یہ اچھا بھی لگے گا یا......"

"ارے......"

وہ اس گریز پہ بے ساختہ ہنسی۔

"کم آن زیمل...... میری شادی ہو چکی ہے۔ تم نے شاید غور سے نہیں دیکھا مجھے۔ میں تو اب اپنے صاحب کو اولاد کی بھی خوشی دینے والی ہوں...... دیکھ پہلے سے موٹی نہیں ہو گئی کچھ......"

وہ کچھ کھسیا کر کہہ رہی تھی۔ زیمل بے ساختہ چونک کر ٹھٹک کر اسے تکتی چلی گئی۔ پھر خود کو سنبھال کر سر نفی میں ہلایا تھا۔

"اگر تم شادی شدہ ہو تو پھر...... امپاسبل...... مائی ڈیئر تمہاری سسرال کا معاملہ ہے اور یہ معاملات بہت حساس ہوتے ہیں میری فکر نہ کرو تم...... میں جہاں قیام پذیر ہوں وہاں کوئی مسئلہ نہیں۔"

اسے تسلی دیتی وہ بظاہر بے فکری ظاہر کر رہی تھی۔ آیت نے جواب میں اسے گھور کر دیکھا۔

"اپنی بکواس بند کرو۔ جانتی ہوں ہمیشہ کی خودداری کی بیماری ہے تمہیں۔ کسی کا ایک دھیلا بھی خود پر خرچ نہیں کروایا کرتی تھیں۔ ہمیشہ خود سب کو زیر بار رکھتی بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی نا...... مگر اب وہ سچویشن نہیں۔ خبردار جو تم نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ بس کہہ دیا چل رہی ہو تو چل رہی ہو ساتھ میرے اوکے...... میرا سسرال ہرگز بھی روایتی نہیں ہے۔ میرے سگے تاؤ ہیں۔ بس بے فکر ہو جاؤ......"

وہ صرف بول نہیں رہی تھی۔ اس کا سامان بھی سمیٹ لیا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ وہ اب اس کی بس پیش نہیں چلنے دے گی۔ زیمل کے چہرے پہ ایسے تاثرات تھے گویا انتہائی بے بس ہو چکی ہو۔

"آ آئیم...... اندر آ سکتا ہوں خواتین......"

محسن جو دروازے کے پاس کھڑا سب سن رہا تھا۔ ہلکی شوخی سے کھنکارتا چوکھٹ میں ٹک گیا۔ جہاں آیت نے مسکرا کر تو زیمل نے پہلے حیرانی پھر گھبراہٹ میں مبتلا ہو کر اسے دیکھا تھا۔ اگلا تاثر جو چہرے پہ ابھرا وہ اضطراب کا تھا۔

"افوہ...... تم صبر نہیں کر سکتے بدتمیز لڑکے اگر میری سہیلی دوبارہ بے ہوش ہو گئی تو......"

آیت نے اس کے لتے لیے۔ وہ خجالت سے سر کھجاتا ہنسا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ اب آپ سے تعلق نکل آیا تو ہم پہ بھی اعتماد ہو جائے گا انشاء اللہ......"

وہ ترچھی نگاہوں سے زیمل کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔

"یہ محسن ہے...... مائی برادر ان لا...... موصوف لاء پڑھ رہے ہیں......"

آیت کے لہجے میں بہت محبت تھی۔ زیمل کا خوف بھلا کہاں کم ہوا۔

"یہ تمہیں پہلے سے جانتا ہے۔ زیمل...... مجھے بہت افسوس ہے میں نے بہت دیر کر دی تم تک پہنچنے میں......"

وہ پھر متاسف ہوئی۔ محسن ترچھی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"اب کیسی ہیں آپ......؟ اور بھابی آپ نے تعارف ادھورا کروایا...... ان کے متعلق بھی ہمیں فیض یاب کیا ہوتا......"

وہ مسکرا رہا تھا۔ آیت نے اسے ایک جھانپڑ لگا دی۔

"بہت پہنچے ہوئے ہو تم تو...... مجھ سے پہلے سے جانتے ہو۔ اب ڈرامے بند کرو۔"

محسن اس بات پہ بوکھلا سا اٹھا۔ پھر زیمل کو بالخصوص دیکھا جس کی رنگت میں زردیاں گھلنے لگی تھیں۔

"بخدا بھابی بیگم اسے الزامات عائد نہ کریں۔ جن کی تاب نہ لاتے ہوئے محترمہ پھر سے بے ہوش ہو جائیں۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے ہمیں تو......"

وہ مصنوعی خفگی سے بلبلایا تو آیت ہنستی چلی گئی تھی۔

"ایکسکوز می......"

محسن کا فون بجنے لگا تو معذرت کرتا کمرے سے نکلا تھا۔ آیت ہنستے ہوئے پھر سے زیمل کے پاس آ بیٹھی۔

"بہت شریر ہے یہ...... کئی دنوں سے میرے کان کھا رہا تھا کہ ایک لڑکی پسند آ گئی ہے بہت مگر مجھے دیکھتے ہی ڈر جاتی ہے۔ کیوں بھئی...... اچھا بھلا خوبرو ہے میرا دیور...... یہ تو بی یہ ڈیئر زیادتی ہوا۔"

اس سے قبل کہ زیمل کچھ کہتی محسن اندر آ گیا اور شور مچا کر رکھ دیا۔

"ابا کا فون ہے۔ بہت ناراض ہو رہے ہیں کہ ہم کہاں رہ گئے۔ بھائی بھی گرم ہو رہے تھے۔ دونوں کا خیال ہے کہیں آپ کی دوبارہ طبیعت تو نہیں خراب ہو گئی خدانخواستہ اب وہاں پہنچنے میں ہی

بھلائی ہے۔ سو ہری اپ پلیز......"

زیمل احتجاج کرنا اور کہنا چاہتی تھی مگر آیت نے چلنے کہاں دی۔ بس اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ کھینچتی لے گئی۔ محسن نے بصدِ احترام دروازہ کھولا تھا گاڑی کا زیمل گریزاں سی بیٹھی۔ پتا نہیں زندگی اس کے ساتھ آگے کیا کرنے والی تھی۔

+++

کبھی تو شہرِ ستم گراں میں
کوئی محبت شناس آئے
وہ جس کی آنکھوں سے نور چھلکے
لبوں سے چاہت کی باس آئے
چلے تو خوشیوں کے شوخ جذبے
ہماری آنکھوں میں موجزن تھے
مگر نہ پوچھو کہ واپسی کے
سفر سے کتنے اداس آئے
ہمارے ہاتھوں میں اک دیا تھا
ہوا نے وہ بھی بجھا دیا تھا
ہیں کس قدر بدنصیب ہم بھی
ہمیں اجالے نہ راس آئے

ایک گہری اور تکلیف دہ غفلت کا بالآخر انجام ہو گیا تھا۔ اس کی حواس جاگے پھر متحرک بھی ہو گئے۔ ذہن بھی جاگ اٹھا تھا اور ٹیس دیتا تھا۔ یہ یاد ایک ٹیس تھی۔ ہر احساس ایک کرب تھا۔ اس کا وجود ایسے اذیت محسوس کر رہا تھا گویا بلڈوزر کے نیچے آ کر پس گیا ہو۔

"صندلین......"

شیر خان اسے پکار رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کتنی دیر سفاک حقیقتوں سے بھاگ سکتی تھی۔ اسے سامنا کرنا تھا۔ اس نے جان لیا یہ اس کا نصیب ہے۔ نصیب سے مفر نہیں ہے بس۔ یہ اس کی آزمائش تھی۔ اگر سزا نہیں تو اسے یہ آزمائش سہنا تھی سزا قبول کرنا تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے......؟"

شیر خان کی نظروں میں فکرمندی تھی۔ اس نے محض سر اثبات میں ہلایا۔ بات کرنے کی تاب تھی نہ ہمت۔

"کچھ چاہیے......؟"

صندلین نے سر نفی میں جنبش دی۔

"تو پھر کچھ کھا لو...... کمزوری دور ہو گئی تو اٹھ سکو گی......"

"ہاں......"

وہ گردن موڑ کر کسی کو پکارنے لگا۔ صندلین نے آنکھیں پھر سے موند لیں،

"یخنی لا دو۔"

وہ کہتا باہر نکل گیا۔ ایک نسبتاً موٹی مگر بلا کی حسین درمیانی عمر کی عورت یخنی کا پیالا لیے دروازے پر آ ٹھہری۔

"پی لو گی...... یا میں پلاؤں......"

وہ جھجک رہی تھی۔ صندلین اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"رکھ دیں...... میں پی لوں گی......"

اس کی آواز بوجھل تھی۔ وہ اسے گھورتی رہی پھر پیالا رکھ کر وہیں جا کر کھڑی ہوئی۔

"میرے بیٹے نے تجھ میں کیا دیکھا۔ کیوں بیاہ کر لایا......"

اس کے انداز میں حقارت تھی۔ صندلین کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آسکا۔ کم از کم وہ اس سلوک پر ایسی بات کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

"اونہہ...... ہیرا چھوڑ کر کوئلہ پکڑ لیا ہے نمانے نے...... جلا نہ ہو۔"

غصے میں پیر پٹختی عورت باہر نکل گئی۔ صندلین کو لگا تھا۔ کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔ وہ شیر خان کو حقیر سمجھتی تھی اور یہاں اسے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا گیا تھا لمحوں میں...... اس سے سوچ نہیں پایا جاسکا۔ وہ بالکل شل ہو گئی تھی گویا۔

"پسند آئی تجھے اپنی نوں......(بہو)"

شیر خان کی آواز اس تک پہنچی۔

"کہاں سے اٹھا لایا ہے......"

وہ ناگواری سے بولی تھی۔ شیر خان ہنسنے لگا۔

"سمجھ لاٹری نکلی ہے ماں...... پرستان کی پری یا کسی محل سے شہزادی اٹھا لایا ہے تیرا بیٹا۔" وہ اپنا کارنامہ بتا رہا تھا۔

"کشمالہ سے زیادہ حسین نہیں۔ تو سمجھتا کیوں نہیں یہ بات پتر......"

ماں ناراض ہو رہی تھی۔ صندلین نے نم آنکھیں کرب آمیز انداز میں میچیں۔

"دل کی بات ہے ماں...... مجھے اس سے حسین کوئی اور لڑکی نہیں لگتی کیا کروں......"

"شاید تو ٹھیک کہتا ہے۔ دل اگر گدھی پہ آ جائے تو وہ بھی حسن رکھتی ہے۔"

ماں کا انداز تضحیک آمیز ہوا۔ شیر خان البتہ اس توہین آمیز بات پہ گرم ہونے لگا تھا۔ جس کے نتیجے میں ماں جھگڑنے لگی۔ ان کی آواز ہر لحظہ اونچی ہو رہی تھی۔ صندلین نے تکیہ منہ پر رکھ لیا...... اگر قسمت خراب ہو تو جگہ بدلنے سے فرق نہیں پڑتا۔ اسے اس بات کا یقین آ گیا تھا اچھی طرح سے......

+++

رات اوڑھے ہوئے آئی ہے فقیروں کا لباس
چاند کشکول گدائی کی طرح نادم ہے
دل میں دکھے ہوئے ناسور لیے بیٹھا ہوں
کون یہ وقت کے گھونگھٹ سے بلاتا ہے مجھے

کس کے معصوم اشارے میں گھٹاؤں کے قریب
کون آیا ہے چڑھانے کو تمناؤں کے پھول
ان سلگتے ہوئے لمحوں کی چتاؤں کے قریب
وہ تو طوفان تھی سیلاب نے پالا تھا اسے
اس کی مدہوش امنگوں کا فسوں کیا کہیے
رقص اب ختم ہوا موت کی وادی میں مگر

وہ کب سے بیڈ پر ایک ہی زاویے سے لیٹا ہوا تھا۔ اندر گم صم تھا۔ کسی قدر مضطربانہ...... اس کے لئے اپنے ملازم کے ذریعے کچھ بھی یہاں منگوانا قطعی دشوار امر نہیں تھا۔ سگریٹ کے کش لیتا وہ اپنے فون پر مصروف تھا والدہ نماز پڑھنے ابھی اٹھی تھیں کہ اسی پل یشفع اس سمت آ نکلی۔

"آپ کو کس نے کہا یہاں اسموکنگ الاؤ ہے۔"

سگریٹ اس کے ہاتھ سے اچک کر وہ سیدھی نہیں ہو پائی تھی کہ سلمان نے طیش میں اس کا ہاتھ صرف پکڑا نہیں موڑ کر جھٹکے سے کمر پہ لگاتے بالکل بے بس پوزیشن میں قابو کر لیا۔

"ہاورڈ پڑیو...... تم...... کون ہو آخر اتنا میری زندگی میں مدخالت کرنے والی...... ماں وہاں بیٹھی ہے میری...... بیوی تم ہو نہیں...... پھر اس جرات کا مطلب......؟"

وہ دبے ہوئے لہجے میں غرایا۔ اس کی سانسیں پھنکاریں مار رہی تھیں۔ یشفع کو کہاں توقع تھی اس سے اس درجہ درندگی کی وہ تو حواس باختہ ہی نہیں ہوئی اس درجہ گھبرائی کہ منہ سے آواز تک نہ نکال سکی۔

"مجھے چھوڑ دیں......"

وہ کراہ رہی تھی۔ نازک بیل جیسی لڑکی کہاں وہ کڑیل مضبوط مرد۔ وہ سہمی ہوئی زخمی چڑیا تھی گویا اس کے پنجے میں پھنسی۔

"کیوں......؟"

سلمان غرایا۔ یشفع کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اتنا شوق تھا چھوٹنے کا تو پنگا کیوں لیا......"

اس کے لہجے میں تنی ہی تنی تھی۔ یشفع نے ہونٹ تکلیف کے شدید احساس سمیت بھینچے۔

"سوری......"

آنسو گالوں پہ ڈھلک گئے۔ گویا گلاب پہ شبنم بکھری۔ سلمان ایک لمحے کو ساکن ہوا۔ غصہ حسن کی شعاعوں میں جل کر خاک ہوا تھا۔

"آئندہ اپنی حد میں رہنا...... ورنہ انجام کی ذمہ داری بھی تمہاری ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ"

اس کا ہاتھ جھٹکے سے چھوڑتا وہ دھتکار رہا تھا۔ یشفع ہل کر رہ گئی۔ بے اختیار بھیگا چہرا صاف کیا۔

"دفع ہو جاؤ......"

منہ پھیر کر وہ مشتعل انداز میں چیخا۔ یشفع سبکی کے احساس سمیت سرخ پڑ گئی تھی۔ کچھ کہے بغیر اپنا دوپٹہ جو ڈھلک گیا تھا سنبھالتی تیزی سے باہر بھاگ گئی۔ جب تک والدہ نے عجلت میں سلام پھیرا کام بہت خراب ہو چکا تھا۔

"سلو...... یہ کیا کیا تم......؟"

انہوں نے دل تھام لیا تھا۔

"آپ جو اسے سبق پڑھاتی ہیں نا...... سب پتا ہیں مجھے۔ منہ کی کھائے گی اگر اس نے میری زندگی میں مداخلت کی کوشش کی۔ سن لیں آپ بھی اچھی طرح......؟"

وہ ان پہ بھی بگڑنے لگا۔ والدہ نے اٹھ کر دروازے سے جھانکا۔ وہاں دور تک کوئی ذی روح نہیں تھا۔ وہ جیسے لمحوں میں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔

"اللہ سمجھے تمہیں سلمان...... تم مجھے مار کر ہی دم لوگے۔ پھر ہو جانا آرام سے برباد کوئی نہیں تڑپے گا تمہارے لئے......"

وہ رونے بیٹھ گئیں تھیں۔ سلمان کوئی تاثر دیتے اپنے من پسند مشغلے میں مصروف تھا۔ یعنی سگریٹ پھونک رہا تھا۔

✦✦✦

وہ کہتا ہے بتاؤ بے سبب کیوں روٹھ جاتے ہو
میں کہتی ہوں ذرا مجھ کو مناؤ اچھا لگتا ہے
وہ کہتا ہے میرا دل آخر تم سے کیوں نہیں بھرتا
میں کہتا ہوں محبت کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی
وہ کہتا ہے بتاؤ میں تمہیں کیوں بھا گیا اتنا
میں کہتی ہوں اچھے حادثے ہو ہی جاتے ہیں
وہ کہتا ہے اچانک تم کو رلا دوں تو
میں کہتی ہوں مجھے دکھ ہے کہ تم بھی بھیگ جاؤ گے

سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے۔ وہ محو انداز میں پڑھ رہی تھی۔ ہونٹوں پہ بہت دلفریب مسکان تھی۔ زیمل نے اس نظر سے دیکھا۔ اسے وہ بہت مکمل اور مطمئن لگی۔ جبکہ وہ محسن کی نظروں کے ارتکاز کے باعث ان کنفرنیل بھی تھی اور آنے والے حالات کے خیال سے مضطرب بھی۔

وہ کہتا ہے بتاؤ بے سبب کیوں روٹھ جاتے ہو
میں کہتی ہوں ذرا مجھ کو مناؤ اچھا لگتا ہے

مند پسند شعر دہراتی وہ بے ساختہ ہنس دیں۔ پھر ایک دم سے زیمل کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔

"تم نے پوچھا نہیں زیمل میرا میاں کیسا ہے۔ اور مجھ جیسی نخریلی لڑکی کو پسند بھی آیا کہ نہیں......"

اس سوال پہ زیمل نے گہرا سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

"ضرورت نہیں تھی۔ اگر تمہیں جانتی نہ ہوتی تو یہ سوال ضرور کرتی۔ آئمہ صاحبہ کے ساتھ کسی معاملے میں جبر نہیں کیا جا سکتا اگر تو اس معاملے میں تو قطعی نہیں۔ وہ صاحب جو کوئی بھی ہیں۔ آپ کے من پسند ہی ہیں۔ آپ کے محبوب بھی ہیں۔ ہاں مجھے یہ ضرور تجسس ہو رہا ہے کہ وہ ہی کہے...... رنگل دیکھنے کا شوق ہو رہا ہے بھائی کو......"

وہ واقعی ایکسائٹیڈ ہو گئی تھی۔ اس جواب پر آیت سر دھنتی مسکرانے لگی۔

''روڈ ہیں......ان رومینٹک ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر بلا کا حسین ہے۔ ظالم......بس میں ہی عاشق ہوں۔ انہیں کوئی محبت وحبت نہیں ہو سکی مجھ سے......اس کے باوجود میں ہوں کہ ان کے بغیر چین نہیں۔''

اس کا انداز عجیب سی یاس اور محرومی لیے تھا۔ محسن کو کھنکار کر مداخلت کرنا پڑی۔

''اب ایسے بھی نہ کہیں...... بھائی اچھی بھلی محبت کرتے ہیں آپ سے......'' آیت اس جواب پر مجروح سی ہنسی ہنسی۔

''وہ جو اچھی بھلی کرتے ہو نا...... وہ تم کرتے ہو تمہارے بھائی تو بس گزارہ ہی کرتے ہیں......''

اس نے منہ بسور لیا۔

''اتنی خوبصورت لڑکی کے ساتھ صرف گزارہ نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔'' زیمل نے اسے چھیڑا وہ ہنستی چلی گئی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو......اب ہی ایسا ہو جائے......''

اس کے انداز میں حسرت تھی۔ پھر آہ بھر کے بولی۔

''تمہاری کھوج میں جو بھی ملا ہے دل کو قبول

وہ نوکِ گل ہو یا نوکِ خار

وہ بار بار میرے دل کو توڑنے آئے

اک میں کہ کہوں بار بار بسم اللہ

آیت کا موڈ اچھا تھا۔ وہ بات بات پہ شعر لڑھکا رہی تھی۔ راستوں میں شام گہری ہونے کے ساتھ دھند بھی اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ جب وہ لوگ گاؤں پہنچے مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ اماں کے علاوہ ابا اور خاندان کے دیگر لوگ بھی موجود تھے استقبال کو ماسوائے معیز کے۔ آیت کا چہرا اسے موجود نہ پا کر اتر گیا تھا۔

''پتر ساتھ والے پنڈ میں بہت خوب خرابہ ہوا ہے۔ پانی سے لڑائی ہوئی اور گولیاں چل گئیں۔ ادھر ہی گیا ہے، ڈاکٹر کی ضرورت تھی نا وہاں......آ جائے گا۔''

اماں اس کی کیفیت سمجھتی تھیں۔ محبت سے ساتھ لگا کر ڈھارس دی۔

''یہ کون ہے......نرا پھل گلاب دا......''

یہ چچی تھیں۔ زیمل کا حسن و جمال دیکھ کر انگلی منہ میں دبالی۔ ردعمل اتنا نیچرل تھا کہ آیت کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''میری دوست ہے۔ میرے پاس مہمان ٹھہرے گی۔ کتنی پیاری ہے نا چچی جان...... یہ ہمیشہ سب کی ٹور مار دیا کرتی تھی۔''

وہ خوش دلی سے کہہ رہی تھی۔

''جی آیاں نوں پتر...... جگ جگ رہو۔ تیرا اپنا گھر اے......''

اماں زیمل کو پیار سے گلے لگا کر اپنائیت سے جس پل کہہ رہی تھیں۔ چچی اس کے کان میں گھسیں۔

''دو دو جوان مردوں کی موجودگی میں تو ساری دنیا کا حسن سمیٹ کر ساتھ لے آئی۔ پاگل ہوئی ہے لڑکی......آگ سے بڑھ کر خطرہ ہے اس میں......'' ان کا انداز ایسا تھا کہ آیت کو پھر گدگدی سی ہونے لگی۔

''کم آن چچی جان...... معیز ایسے نہیں ہیں۔''

وہ مسکراہٹ ضبط کر کے جس اعتماد سے کہہ رہی تھی اس پہ چچی جان جل کر خاک ہوئیں۔

''خام خیال نہ ہو تیرا دھیئے......بہرحال مرضی تیری......''

وہ اٹھ گئیں۔

''اپنا خیال رکھنا اپنے مرد کا خاص کر......''

جاتے جاتے نصیحت کرنا تو بھولیں۔ آیت نے سر جھٹک دیا۔

''انہیں کیا خبر یہ محسن کی پسند ہے۔''

وہ مسکرائے گئی تھی۔

''پتر تو زیادہ ایسے یہاں نہ بیٹھ......اپنے کمرے میں چل ٹھنڈ بھی چڑھ گئی ہے۔ آرام کر......''

اماں نے اسے ٹوکا۔ آیت نے اٹھتے ہوئے زیمل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تم میرے ساتھ ہی آ جاؤ کمرے میں......''

زیمل اس سے پہلے کہ کچھ کہتی محسن نے مداخلت کر دی تھی۔

''کچھ خوف خدا کریں بھابی...... بھائی سے ڈانٹ کھانے کا ارادہ ہے۔ اگر سمجھیں تو یہ آپ لوگوں کی گولڈن نائٹ ہی ہے۔ اتنے عرصے بعد تو اکٹھے ہوئے ہی۔ اپنی دوست کو کباب میں ہڈی نہ بنائیں۔''

اس کا انداز شرارتی تھا۔ آیت بری طرح جھینپ گئی تھی۔ بے باک تبصرے پہ۔ پھر اس پر چڑھائی کر دی۔ زیمل کا چہرہ تپ گیا۔ کان دھواں چھوڑنے لگے وہ بے ساختہ رخ پھیر گئی۔

''تم کچھ زیادہ اوور نہیں ہو رہے دیور جی......تم سے میری سہیلی کو اچھا بھلا خطرہ ہے۔ جبھی ساتھ لے جا رہی ہوں۔ تمہارے بھائی جب آئیں گے تب میں زیمل کو اس کے کمرے میں بھیج دوں گی۔ اب تم نو دو گیارہ ہو جاؤ تو بہتر ہے'' وہ اس کی طبیعت صاف کر رہی تھی۔ محسن سر کھجا کر رہ گیا۔

''آپ تو برا ہی مان گئیں۔ کھانا پیش کرتا ہوں......''

وہ پلٹ کر چلا گیا۔ زیمل نے جس پل آیت کے کمرے میں قدم رکھا خوشگواریت میں گھر گئی۔ ہر سمت پھول ہی پھول تھے۔ بیڈ پہ کارپٹ پہ اور سب سے بڑھ کر دیوار پہ گلاب کی پتیوں سے لکھا دونوں کا نام۔

''یہ سب کیا ہے......اور تم کہہ رہی تھیں وہ رومینٹک نہیں ہیں۔''

وہ اسے چٹکی کاٹ کر بولی۔ آیت خود مبہوت تھی۔ خواب آنکھیں احساس سے دو چار یہ سب دیکھ رہی تھی۔

''سب بھائی نے کروایا ہے آپ کے لیے مادام......''

محسن ٹرے لیے حاضر تھا۔ دونوں چونک گئیں۔ زیمل مزید محتاط تو آیت کچھ جھینپ سی گئی تھی۔

"زیمل......؟"

اسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا میں آپ کے ساتھ کھانا تناول فرما سکتا ہوں...... بی کوز بھائی تو جانے کب آئیں۔"

وہ سوال آیت سے کر رہا تھا مگر دیکھ زیمل کو ہی رہا تھا۔ زیمل بے چین ہونے لگی۔ اسے محسن کی نظروں سے اس کی موجودگی سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اور کچھ نہیں کم از کم آیت کو ضرور اپنے اس نکاح کی حقیقت ضرور بتا دے گی تاکہ محسن اس سے وابستہ اپنی توقعات سمیٹ لے۔

"جی نہیں...... آپ کباب میں ہڈی بنیں گے۔"

آیت کے جواب پہ محسن کا چہرا اتر گیا تھا۔

"آپ نے ماتھے پہ آنکھیں رکھ لی ہیں بھرجائی۔"

وہ منہ بنا کر بولا۔

"کوئی بات نہیں شادی کے بعد یہ کام تم بھی کرنے والے ہو"

آیت نے پرواہ کیے بغیر بڑی جھنڈی ہی ہلائی۔

"دیکھ لیں...... بعد میں مجھ سے گلہ نہیں کیجیے گا۔"

وہ آخری کوشش کے طور پر لجاجت سے بولا۔ آیت ہنستے ہوئے اسے دروازے کی راہ دکھائی تھی۔

"دراصل مجھے زیمل سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ جو تمہارے لئے بھی فائدہ مند ہوں گی...... سو میرا بھائی آپ جا کے اپنے لئے دعا مانگو......"

وہ پچکار کر بولی تھی۔ محسن سرد آہ بھرتا پلٹ کر چلا گیا تو آیت نے مسکراتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر اسے پاس بٹھالیا تھا۔

"مجھے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا زیمل یہ تم ہو...... اف تمہیں یاد ہے انتہائی خود پسندی ہونے کے باوجود میں تمہاری سب سے بڑی فین ہوا کرتی تھی۔ تمہارا نام میں نے ہی کشمیری سیب رکھا تھا نا......؟"

وہ اسے انتہائی محبت سے دیکھ رہی تھی۔ زیمل اچھی خاصی خفیف ہوگئی۔

"زندگی میں میں نے جن بہت کم لوگوں سے محبت کی ان میں ایک تم بھی شامل ہو۔"

کھانے کی ٹرے اس کی جانب سرکاتی ہوئی وہ پھر گویا تھی زیمل نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

"بس کرو آیت...... مجھے کیوں شرمندہ کر رہی ہو۔"

"اچھا بھئی...... ٹھیک ہے کھانا کھاؤ تم...... معیز تو جانے کب آئیں۔"

زیمل اس نام پہ بے طرح چونکی اور ٹھٹھک کر اسے تکنے لگی۔

"آیت......!!!"

اس کی آنکھوں میں سوچ کے رنگ تھے۔ عجیب سا وہم اتر آیا۔

"کون معیز......؟"

اس کا انداز کھٹکا ہوا تھا۔ چہرے پہ کتنے رنگ آ جا رہے تھے۔

"اوہ سوری یار...... معیز ہی ہے نا میرے ہزبنڈ کا نام...... تمہیں خود سمجھ جانا چاہیے تھا نا......"

وہ مسکراتی ہوئی بتا رہی تھی۔ انداز وہی بے تکلف تھا۔ زیمل کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔

"معیز......"

اس کے لب کانپے اور رنگت پیلی پڑتی چلی گئی۔ معیز نے بار بار مرتبہ اس کے سامنے آیت کا نام لیا تھا۔ جو اس کی بیوی تھی۔ وہ پھر بھی نہیں سمجھی۔ یہ سامنے کی بات نہیں سمجھی۔ اسے لگا اس کے اوپر سے تیز رو ٹرین گزر رہی ہے۔ اسے روندتی۔ اسے مسلتی۔ پرخچے اڑاتی ہوئی۔

یہ کیا غضب ہو گیا تھا۔ یہ کیا ستم بپا تھا۔ ذہن میں طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔

"ہاں بھائی معیز...... مائی لونگ ہزبینڈ...... میرا عشق...... تمہیں پتا ہے یہ میرے بچپن کے منکوح تھے۔ ہمارا نکاح ہمارے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ مگر معیز نے مجھے مجال ہے جو کبھی ذرا سی بھی اہمیت سے نوازا ہو۔ بلکہ ہمیشہ اتنے روڈ رہتے کہ میں روہانسی ہو جاتی۔ پتا نہیں وہ کون سا خاص لمحہ تھا جب میں نے انہیں دیکھا اور بس پھنس گئی۔ ایسی ہی محبت ہو گئی تھی اس بندے سے...... پھر تو مت پوچھو جو اس شخص نے مجھے رلایا کھپایا...... مگر میں نے بھی جان نہیں چھوڑی۔ سوچ لیا تھا اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو گزارنی ہے۔ ماما نے بہت شور مچایا مخالفت کی۔ ادھر یہ موصوف بھی کہاں کوئی حوصلہ افزائی کرتے تھے مگر صد شکر پپا اور تاؤ کی فیور حاصل تھی۔ میں نے تمہیں پتا ہے...... اتنا بڑا اسٹیپ لیا تھا اس شخص کے حصول کی خاطر...... اپنا گھر چھوڑ کر یہاں چلی آئی تھی اور واپس جانے سے انکار کر دیا تھا اور یہ محترم...... پھر بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے...... مگر میں نے بھی سیدھا کر کے دم لیا...... اب یہ سب دیکھ رہی ہو......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر کھلکھلائی۔

"کیا یہ سب ان کی محبت کو ظاہر نہیں کر رہا زیمل......"

وہ رک کر اچانک بہت معصومیت سے سوال کر رہی تھی مگر اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی پریشان ہو اٹھی۔

"زیمل......"

زیمل نے اسے دھواں ہوتی نظروں سے دیکھا۔

"کیا ہوا تمہیں......؟"

آیت کے انداز میں فکرمندی تھی۔ تشویش تھی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں...... تم برا نہ مناؤ تو...... میں آرام کر لوں......؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ وہ سرتاپا سہمی ہوئی تھی۔

(یہ کیا ہو گیا...... یہ...... کیوں ہو گیا)

اس کا دل رو رہا تھا۔ اب وہ کیا کرے گی۔ صورتحال کی گھمبیرتا اس کے بس سے باہر کی بات تھی۔ اسے لگا وہ خود کو سنبھال نہیں سکے گی۔ گر جائے گی۔

"ہاں ہاں...... بالکل...... لیکن تم نے کھانا نہیں کھایا......"

آیت کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"مجھے...... بھوک نہیں ہے......"

زیمل کے حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک رہا تھا۔

(جاری ہے)

جل تھل

قرۃ العین رائے

دوسری قسط

''کہاں رہ گئی یہ؟'' لیپ ٹاپ پر کچھ ضروری کام کر کے وہ اب فارغ ہوا تھا کافی وقت گزر گیا تھا۔ وہ ابھی تک کمرے میں نہیں آئی تھی۔

''ویسے تو خطرہ ٹل گیا ہے لیکن پھر بھی ارشام اس کا خیال کرنا، فیملی ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ میں تمہارے والد کا دوست بھی ہوں اسے کوئی ذہنی دباؤ ابھی نہیں آنا چاہیے۔ وہ بہت بڑے صدمے سے دو چار ہوئی ہے اور پھر اچانک یوں اتنا بڑا Change۔ اسے وقت دو سنبھلنے کا خیال کرنا۔'' ڈاکٹر ارشاد کے جملے اُس کے ذہن میں گونج رہے تھے جو انہوں نے اکیلے میں ارشام سے کہے تھے۔ افراح کے چیک اپ کے بعد۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور اُسے دیکھنے کے لیے کمرے سے باہر چلا آیا تھا اُس کا رخ اپنے پپا کے کمرے کی طرف تھا اس وقت تو وہ وہی ہو سکتی ہے جبھی اس کی نظر نیچے کھلے کچن کی طرف گئی تھی اُسے اس کی جھلک وہاں نظر آئی تو وہ ادھر چلا آیا۔ دبے پاؤں چلنا اس کی عادت تھی افراح کچن میں سنک کے پاس کھڑی برتن دھو رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟ خادم حسن یا پروین کہاں ہیں تم برتن کیوں دھو رہی ہو؟'' اس کے سر پر پہنچ کر اس نے سوالات کی بوچھاڑ کی تھی اور وہ جو اپنے خیالات میں گم کام میں مصروف تھی اُچھل ہی پڑی تھی اور تیز چھری جو وہ دھو رہی تھی اُس کی انگلی پر کٹ لگا گئی تھی۔ گلابی پور یک دم خون سے سرخ ہوئی تھی ارشام نے خون بہتے دیکھا تو فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر چلتے نل کے نیچے کیا تھا تاکہ خون رک سکے درد سے بے ساختہ اُس کے منہ سے ''سی امی جی!'' نکل گیا تھا خون رک نہیں رہا

مکمل ناول

تھا اور وہ آنسو پینے کی کوشش میں تھی اتنی سی بات پر کمزور ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے آنکھیں بھینچیں کھڑی تھی اور وہ جو اسے کوئی سخت جملہ کہنے لگا تھا اُس کے صبیح چہرے پر نظریں ٹکی تھیں گھنی پلکیں زور سے بند کیے اور گلابی ہونٹوں کو سختی سے دبائے وہ ایک معصوم شہزادی کی مانند لگی تھی۔

''کمرے میں چلو میں پٹی کر دوں۔'' نرم لہجے میں بولا تھا ہنوز اُس کی انگلی کو اپنی بھاری ہتھیلی میں دبائے کچھ لپیٹنے کے لیے اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تھی جب سمیر پانی پینے کے لیے کچن میں آیا اور افراح کا ہاتھ ارشام کے ہاتھ میں دیکھ کر ذو معنی شرارتی انداز میں کھانسا تھا وہ کافی نٹ کھٹ اور شرارتی لڑکا تھا۔ ساتھ میں کافی پر اعتماد بھی اپنے اعتماد کی وجہ سے وہ ارشام کے غصے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا ویسے بھی اُسے زبیر بھائی سے زیادہ ارشام بھائی پسند تھے وہ انہی کی طرح پولیس آفیسر بننا چاہتا تھا۔

''ہوں...... ہوں پیاس لگی تھی پانی پینے آیا تھا۔'' ارشام کے گھورنے پر معصوم بنتا بولا تھا اور فریج کی طرف بڑھ گیا تھا ارشام افراح کا ہاتھ تھامے کچن سے نکل گیا تھا اور اپنی پشت پر اُسے سمیر کی گنگناہٹ سنائی دی تھی جو قدرے بلند تھی۔

دھیرے دھیرے پیار کو بڑھانا ہے
حد سے گزر جانا ہے

☆☆☆

ارشام نے فرسٹ ایڈ بکس کھول کر اُس کی بنڈیج کر دی تھی معمولی زخم تھا لیکن وہ بے حد ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔

''مجھے خون سے ڈر لگتا ہے میں خون نہیں دیکھ سکتی نارمل فوبیا ہے مجھے اس کا''۔ ارشام کی بڑی بڑی آنکھوں کو اپنی جانب دیکھتے وہ جلدی سے بولی تھی۔ وہ ابھی بھی اپنی پٹی میں بندھی انگلی کی طرف دیکھنے سے اجتناب برت رہی تھی۔

''مجھے چکر آنے لگتے ہیں، بابا کو بھی دو دن ہسپتال میں دیکھا تھا تو بہت بری حالت تھی اندر سے''۔

''Hemophobia!'' ارشام بولا تھا۔

''جی؟!'' ناسمجھی سے اس نے کہا تھا۔

''Hemophobia جس میں انسان خون کو دیکھ کر ڈرتا ہے تمہیں وہ ہے''۔ ارشام نے گویا اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

آرام کرو مجھے پپا کی کال آئی ہے میں ان کی بات سن کر آتا ہوں اور یہ بائی داوے تم کچن میں برتن کیوں دھو رہی تھی۔'' اُس کے قریب سے اٹھتے ہوئے وہ بولا تھا اور یاد آنے پر پلٹ کر پوچھا تھا۔

''کچھ کرنے کو تھا نہیں پانی پینے گئی تھی تو سوچا دھو دوں کل باجی پروین نے میرے ساتھ پیکنگ میں کافی مدد کروائی سوچا اس طرح ان کی مدد کر دوں۔'' نظریں جھکائے جواب دیا تھا۔

''ہوں، تو محترمہ کسی کا احسان رکھنا پسند نہیں کرتی'' ارشام نے دل میں سوچا اور دل نے فوراً سرگوشی کی تھی ''تمہاری طرح'' جسے ان سنی کیے وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

''کھانا کھالیا۔ میڈیسن لے لی؟'' کمرے میں آکر اُس نے سٹڈی ٹیبل کی کرسی پر بیٹھتے رسمی انداز میں پوچھا تھا اور باسط صاحب نے اپنے گھبرو جوان بیٹے کو ایک نظر دیکھا تھا اشفاق بتا کر گیا تھا کہ وہ کوئی ولیمے وغیرہ کی تقریب نہیں چاہتا اس اڑیل گھوڑے پر کاٹھی ڈالنا تقریباً ناممکن ہی ہے دل میں سوچا تھا انہوں نے۔

''تم نے کھالیا؟'' اثبات میں سر ہلاتے انہوں نے اس سے سوال کیا تھا۔

''نہیں بھوک نہیں ہے۔'' اپنی مطلب کی کتاب کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''اور تمہاری بیوی نے؟'' اس سوال پر وہ ٹھٹھکا تھا۔

''پتہ نہیں'' اور پھر کندھے اُچکا کر جواب دیا تھا۔

''کسے پتہ ہونا چاہیے؟'' پھر سوال کیا گیا تھا جس پر اب وہ چڑ گیا تھا۔

''میں بہت تھکا ہوا ہوں سیدھی بات کریں۔''

''ہوں، سیدھی بات، تو برخوردار سیدھی بات یہ ہے کہ تمہارا اس سے نکاح ہوا ہے، وہ تمہاری بیوی ہے شادی ہو چکی ہے تم دونوں کی''۔ وہ رکے تھے۔

''پتہ ہے'' وہ کوفت زدہ گویا ہوا تھا۔

''اگر یہ پتہ ہے تو یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ ہمیں اس شادی کا اعلان کرنا ہے ولیمے کی صورت میں''۔ انہوں نے تھیلے میں سے آخر کار بلی نکالتے ہوئے کہا تھا۔

ارشام کے چہرے پر بیزری کے تاثرات اُبھرے تھے۔

''ارشام میرے بیٹے! تم اسے اس گھر میں اپنی بیوی بنا کر لائے ہو کن حالات کے تحت یہ سب ہوا ہم جان چکے ہیں لیکن ایک سچائی یہ بھی ہے کہ وہ تمہاری بیوی ہے اور جہاں تک میں تم دونوں کے تعلق کو دیکھ پایا ہوں مجھے نہیں لگتا کہ تم نے اسے اس رشتے میں قبول کیا ہے تم ہمیشہ اس سے لاتعلق سے رہتے ہو یہ لاتعلقی کا رشتہ نہیں اور نا ں ہی اسے تمام عمر لاتعلقی سے نبھایا جاسکتا ہے ایسا کر کے تم اس کے لئے مشکلات کو جنم دو گے۔''

''آپ جانتے ہیں مجھے شادی سے نفرت ہے مجھے شادی کبھی نہیں کرنی یہ تو جان محمد نے......''

''میں جانتا ہوں لیکن وہ تو نہیں جانتی بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتی تو تمہاری اس بے رخی اس لاتعلقی کا مطلب وہ کچھ اور ہی لے گی ناں اور تم نے اس کے مرتے باپ سے اس رشتے کو نبھانے کا وعدہ کیا ہے تو توڑ تو سکتے نہیں''۔ اس کے جملہ ادھورا چھوڑ دینے پر وہ بولے تھے۔

''کیا چاہتے ہیں آپ!'' وہ زچ ہوا تھا۔

''میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ اس معصوم اور بے خبر لڑکی کو اپنے سازہر کا شکار مت ہونے دو جو تمہارے اندر بھرا ہوا ہے۔ مناسب لفظوں میں اسے بتاؤ اپنے احساسات تا کہ وہ تم سے کوئی آس لگا کر ایسی غلط فہمی ناں پال لے جس کے بڑھ جانے پر وہ ختم ہو جائے''۔ انہوں نے دوٹوک انداز اختیار کیا تھا۔

''جی!'' مختصر جواب دے کر وہ ان کے کمرے سے نکل گیا تھا انہوں نے سینے سے لمبی سانس خارج کرتے ہوئے آنکھیں موندھ لی تھیں ایک شبیہ تھی جو بند آنکھوں پر لہرائی تھی۔ اک درد اور اک کرب سا جاگا تھا جس میں وہ مبتلا تھے۔

''یہ زہر جانے انجانے میں میں نے تمہارے اندر بھرا ہے اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ قدرت نے جس طرح یہ لڑکی تمہارے نصیب میں لکھی ہے اس زہر کا تریاق ثابت ہوگی''۔ وہ ہلکے سے بڑبڑائے تھے۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟ اتنی جفا کہاں سے آگئی تمہارے اندر زہر زہر کر دیا تم نے ہمیں''۔ کسی انجان ہستی سے مخاطب ہوتے تھے وہ اور اتنے سالوں سے جو وہ ہر روز یہ سوال دہرانے

تھے پھر دہراتے چلے گئے۔ آج رات تنہائی میں اُس کی یادیں پھر انہیں تڑپانے کو بے تاب تھیں۔ اور انہیں اپنے ضبط کو آزمانا تھا۔ ٹوٹ کر بکھرا۔

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزمِ رات یہ کیا ہوا
میری آنکھ کیسے چھلک گئی مجھے رنج ہے یہ بُرا ہوا

+++

برا تو اس کے ساتھ ہوا تھا لیکن کسی نے کیا تھا وہ آج تک سمجھ نہیں سکی تھی اس نے خود، اس کے رشتوں نے یا پھر اس کی تقدیر نے جس نے بھی کیا تھا بہت برا کیا تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں بہت زیادہ پڑھوں بہت زیادہ لیکن کوئی کالج یونیورسٹی ہی نہیں یونیورسٹی جانا میرا خواب ہے"۔ ایک آواز یاد کے گنبد میں گونجی تھی۔

"ہوں پرائیوٹ بی۔ اے کرلیا وہ کیا کم ہے یونیورسٹی کے نام پر اماں تمہیں بعد میں اور مجھے پہلے قتل کردے گی"۔

"ہوں!" اُس نے منہ بنایا تھا۔

"اس پورے علاقے میں شاید تم واحد لڑکی ہو جو اتنی پڑھی لکھی ہے اور مجھے اس پر فخر اور خوشی ہے۔" اس نے بہلایا تھا۔

"آپ کا فخر ہی تو مجھے یہاں تک لے آیا ہے میں اپنے بیٹے کو بہت زیادہ پڑھاؤں گی آپ سے بھی زیادہ افسر بنے گا آپ دیکھ لینا۔" وہ پختہ ارادے سے بولی تھی۔

"کہاں ہوں تم کہاں ہو!" رات کے اندھیرے میں اس کی پیاسی نظروں نے اسے دیوانہ وار ادھر اُدھر تلاش کیا تھا اپنے پہلو میں ہاتھ مارا تھا اور خالی پاکر وہ بلکنے لگی تھی۔

+++

"نایاب! جنید رات کو آن لائن تھا ویڈیو کال کر رہا تھا تمہارا پوچھ رہا تھا۔"

"کیسا ہے؟" ناشتے کی میز پر ہی عموماً ان تین افراد کی ملاقات ہوتی تھی اس لیے سب باتیں وہیں کی جاتی تھیں۔

"ٹھیک ہے تمہارا پوچھ رہا تھا، اس کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ سوچ رہی ہوں جب تک سلمان کا پروگرام نہیں بنتا میں ہی کچھ دنوں کے لیے اس کے پاس ہو آؤں۔ بچوں کی طرح ضد کر رہا ہے"۔ اپنی نازک لمبی مخروطی انگلیوں سے جوس کا گلاس پکڑے وہ بولی تھیں۔

"ہوں یہ ٹھیک رہے گا آفرین میرے ابھی کچھ معاملات یہاں دیکھنے والے ہیں میں اتنی جلدی وقت نہیں نکال سکوں گا اختر سے کہوں گا تمہاری سیٹ کنفرم کروادے"۔ پروقار شخصیت کے حامل سلمان صاحب بھی بولے تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے نایاب؟!"

"بالکل ٹھیک ہے آفرین بھابھی آپ بے فکر ہو کر جائیں میں دیکھ لوں گی پیچھے سے۔" اس نے تائید کرتے ہوئے تسلی کروائی تھی۔

"اس کی مجھے فکر نہیں تم آگے بھی سب کچھ اچھی طرح سے ہی سنبھالتی ہو جاب کرنے کے باوجود چلو میں سوچتی ہوں بناتی ہوں۔ پروگرام بہت اصرار کر رہا ہے۔ جنید شاید مس کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک بچہ کا باپ بن گیا ہے اور خود بچہ ہے ابھی۔" انہوں نے کہا تھا ممتا سے چور لہجے کے ساتھ۔

"پانی اور سلمیٰ کیسے ہیں ان سے بھی بات ہوئی؟" نایاب نے جنید جو سلمان صاحب کا اکلوتا بیٹا تھا اور جرمنی میں رہائش پذیر تھا کے تین سالہ بیٹے اور بیوی کے متعلق پوچھا تھا۔

"نہیں وہ شاید باہر گئے ہوئے تھے اکیلا تھا گھر پر تو بات کر رہا تھا۔"

"اس کی ہاؤس جاب کیسی جا رہی ہے؟ بتایا تھا اس نے۔" سلیمان صاحب نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ رات ایک میٹنگز میں تھے دیر سے آئے تھے۔

"جی سلیان ٹھیک جا رہی ہے۔" آفرین نے جواب دیا تھا۔

"اور اُس کا ننھیال کیسا ہے آئی مین نانو اور ماموں ممانی وغیرہ؟"

مزید پوچھا تھا۔

"جی سب ٹھیک ہیں"۔ وہ پھر بولی تھی اس دوران نایاب یونیورسٹی جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کرونا کی وجہ سے کلاسز آف ہیں اور تم......؟"

"فیری بھابھی لائبریری میں کام ہو رہا ہے ہیڈ ڈیپارٹمنٹ نے میری ڈیوٹی لگائی ہے اپنی نگرانی میں کام کرنے کی اس وجہ سے آپ کو آگے بھی بتایا تھا۔" اس نے پیار سے آفرین کا نام لیکر بتایا تھا۔

"تمہاری فیری بھابھی بوڑھی ہوتی جا رہی ہیں memory loss کا مسئلہ درپیش ہے"۔ سلمان صاحب شرارتی ہوئے تھے۔

"اللہ نہ کرے جو میں بوڑھی ہوں" آفرین جھٹ بولی تھی اور نایاب دونوں کو خدا حافظ کہتی چلی گئی تھی۔

"اگر یہ مان جائے تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں جانتی ہوں روگ لگائے بیٹھی ہے خود کوئی ماحول بدلے تو شاید کچھ سنبھل جائے"۔

اُس کے جاتے ہی وہ سلمان صاحب سے بولی تھیں۔

"وہ ہرگز نہیں مانے گی اتنے سال بیت جانے کے بعد بھی اُس کا دکھ ویسے کا ویسا ہی ہے کئی بار دیکھا ہے اس کے کمرے کی لائٹ رات بھر جلتے جانتا ہوں روتی اور بلکتی رہتی ہے اور اس خیال سے باہر جاتی ہے جن چہروں کی اُسے تلاش ہے شاید نظر آجائیں حالانکہ وقت کی دھول پڑ چکی ہر چیز پر۔" سلمان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دکھ سے کہا تھا۔

"دکھ بھی تو بہت بڑا ہے دھوکہ فریب اس کے ساتھ ہوا اور سب سمجھتے ہیں کہ اس نے دھوکہ کیا۔ صفائی کا موقع بھی تو نہیں ملا۔ جب کرب میں مبتلا ہوتی ہے تو بس یہی کہتی ہے کہ ایک بار تقدیر اُسے موقع دے دیں تو وہ اپنی ذات پر لگا بدنامی کا داغ مٹا دے۔" آفرین بولی تھی۔

"اچھا میں ذرا آج لیٹ آؤں گا میری ڈی آئی جی سے بھی ملاقات ہے کافی دنوں سے کہہ رہا تھا کہ مل آؤں دوست ہے، ٹرانسفر ہوئی ہے اور میں ملنے نہیں گیا اور کچھ ضروری معاملات ہے جو اُسے بتانے ہیں نواب پیلس کے ملحق زمین کے متعلق۔"

"ڈی آئی جی یاسر!" آفرین نے پوچھا تھا۔

"ہاں وہی" سلمان نے جواب دیا تھا۔

"تو آپ ان کی فیملی کو کسی روز کھانے پر بلالیں ان کی مسز سے ملے مجھے بھی کافی دیر ہو گئی ہے۔" آفرین نے کہا تھا۔

"ہوں ٹھیک ہے کہہ دوں گا۔" سلمان نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

+++

"مے آئی کم ان سر" اجازت لیکر وہ ان کے آفس آیا اور مودب انداز میں سلیوٹ مار کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"بیٹھو!" انہوں نے اشارہ کیا تھا۔

"یہ ہمارے ینگ آفیسرز میں شمار ہوتے ہیں CSS کیا ہے اور پولیس ڈیپارٹمنٹ میں

ایک ایماندار، مستعد اور جوشیلے آفیسر کے طور پر جانے جاتے ہیں کافی نڈر بھی واقع ہوئے ہیں۔ موصوف ان جگہوں پر بھی بے دھڑک گھس جاتے ہیں جہاں کوئی بھی ایک بار جانے سے پہلے سوچے دلاور شاہ کا کیس بھی ان کے سر لے جاتا ہے"۔ ڈی آئی جی یاسر نے ارشام کا تعارف سامنے بیٹھی بارعب اور ایک جاذب نظر حضرت سے کروایا تھا۔

"دلاور شاہ جو بارڈر پر غیر قانونی سرگرمیوں میں انوالو ہے اور جو لینڈ مافیا سے بھی تعلق رکھتا ہے۔" انہوں نے قدرے حیرت سے پوچھا تھا اور ڈی آئی جی کے اثبات میں سر ہلانے پر ڈائریکٹ ارشام سے مخاطب ہوئے تھے۔

"ارے واہ نوجوان پھر تو تم واقعی دلیر ہو تالاب میں رہ کر مگر مچھ سے بیر باندھ لیا اس کے بندے مجھے بھی آج کل tees کر رہے ہیں اسی سلسلے میں میں آیا تھا"۔

"تمہارا مسئلہ بھی دیکھیں گا بس ٹائم نکال کر اسے بریف کر دینا۔" ڈی آئی جی بولے تھے۔

"ٹائم کیا نکالنا ہے کل شام تم آ ہی رہے ہو اپنی فیملی کے ساتھ میرے گھر مجھے خوشی ہوگی نوجوان اگر تم بھی اس محفل میں شریک ہو"۔ وہ بولے تھے۔

"نہیں سر......!" ارشام نے نفی میں سر ہلایا تھا کہ ڈی آئی جی یاسر صاحب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے تھے۔

"ارے یہ ٹھیک رہے گا موصوف کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور اس کا پہلا پیار اس کی جاب ہے اس کی ٹریننگ میرے انڈر ہوئی ہے میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں اس کی بیوی تو اپنی قسمت پر نالاں ہوگی ارشام تم اپنی مسز کے ساتھ کل شام ان کے گھر مدعو ہو باقی باتیں وہیں ہوں گی"۔ ڈی آئی جی صاحب نے پروگرام ڈن کرتے ہوئے ارشام کو فیصلہ سنایا تھا وہ ارشام سے بہت اچھی طرح واقف تھے انہوں نے اسے کبھی کسی گرل فرینڈ وغیرہ کے چکر میں بھی نہیں پایا تھا وہ اسے پسند کرتے تھے جن حالات میں اس نے اپنے ماتحت جان محمد کی بیٹی سے شادی کی تھی وہ اس سے بھی واقف ہو چکے تھے اور ارشام کو مزید پسند کرنے لگے تھے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ایسے ہی نڈر اور ایماندار نوجوان آفسرز کی ضرورت تھی وہ خود بھی ایک نڈر اور جانباز آفیسر تھے۔

"لیکن سر!" ارشام جھجکا تھا۔

"تو لیکن ویکن برخوار آپ ہمارے نوابی خون کو اکسایئے مت ہماری خواہش اور درخواست ہے کہ کل شام کا کھانا آپ ہمارے گھر اپنی مسز کے ساتھ آ کر تناول فرمایئے ہمیں بے حد خوشی ہوگی۔" انہوں نے پھر دعوت کی باقاعدہ پیش کی کی تھی۔

"ارے میں ان سے تمہارا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا یہ نواب سلمان خان ہیں جدی پشتی نواب ہیں بے حد باذوق، نفیس اور پڑھے لکھے انسان ہیں میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ دلاور کے کچھ ٹٹو انہیں نواب پیلس کے قریب زمین کے متعلق تنگ کر رہے ہیں چونکہ وہ حصہ خالی پڑا ہے تو کبھی وہاں ٹرک لا کر کھڑے کر دیتے ہیں اور آج کل خانہ بدوش بستی لا بسائی ہے۔ پیپر وغیرہ ہیں ان کے پاس باقی کی تفصیل تم کل ان کے گھر جا کر جان لینا۔" ڈی آئی جی نے ارشام کا سلمان صاحب سے تعارف کراتے ہوئے کہا تھا اور ارشام میٹنگ برخاست ہونے پر "جی او کے سر" کہتا ان کے آفس سے باہر نکل آیا تھا۔ برا پھنسا تھا گھر والے اس کا ولیمہ کرانا چاہ رہے تھے اور وہ باہر والوں نے اسے دعوتیں دینا شروع کر دی تھیں اور وہ جو اس رشتے کو کوئی نام نہیں دے پایا تھا تعلق جوڑنا نہیں چاہتا تھا اور توڑ نہیں پا رہا تھا عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ یہ عورت ذات جس مرد کی زندگی میں شامل ہوئی ہے سمجھو اس کا آرام اور سکون رخصت ہوا اس کی زندگی سے۔

ایک ٹھنڈی سانس سینے سے خارج کرتا ہوا وہ گھر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے بڑا مسکرا رہی ہو۔" زبیر جو بیڈ پر نیم دراز تھا بیوی کو کمرے میں مسکراتا ہوئے داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"ارشام بھائی کچن میں آئے تھے۔" نائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارشام سے مل کر کون مسکرا سکتا ہے!" زبیر نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"نئی نئی باتوں کی عادل ڈال لیں جناب! کل ان کی اپنی مسز سمیت دعوت کسی آفیسر کے گھر اس میں ان کو میری مدد چاہئے۔ افراح کو تیار کرنے اور شاپنگ وغیرہ کروانے کے لئے تو بہ یہ دو تین جملے بولنا ارشام بھائی کے لئے مصیبت ہو رہے تھے۔ پسینہ آ گیا تھا انہیں اور جب دعوت پر جائیں گے تو نہ جانے کیا حال ہوگا دونوں کا۔" نائلہ نے ارشام کی حالت کو یاد کرتے ہوئے ہنستے ہوئے زبیر کو بتایا تھا۔

"اللہ کرے اس پتھر کو بھی جونک لگ جائے"۔ زبیر نے دھیرے سے کہا تھا۔

"آمین!!" نائلہ نے خلوص دل سے کہا تھا۔

✣✣✣
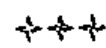
تیار ہو کر وہ لاؤنج میں چلا آیا تھا اور افراح کا انتظار تھا جو نائلہ کے روم میں ہی تیار ہو رہی تھی بلکہ نائلہ کر رہی تھی وہ صبح ہی اُس کے ساتھ جا کر آج کی دعوت کے لئے ڈریس خرید لائی اور باقی کے لوازمات پر بھی ارشام نے اچھی خاصی رقم دی تھی۔ شاپنگ کے لئے افراح بس نائلہ کے ساتھ گھسیٹتی شاپنگ کرتی رہی تھی۔ شاید وہ ذہنی طور پر ان سب باتوں کے لئے تیار نہیں تھی۔ کتنے روکھے پن سے کہا تھا کل تیار ہو جانا دعوت پر جانا ہے مجبوری ہے ورنہ میں اکیلا چلا جاتا سر نے فیملی کا خاص طور پر کہا ہے۔ اصل میں اس کے والد کو گزرے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے وہ جانتا تھا کہ وہ صدمے میں ہے لیکن مجبوری تھی اور افراح کو لگا کہ اسے اپنے ساتھ لے جانا بیوی کے طور پر تعارف کرانا مجبوری ہے وہ خاموش تھی اور دل بیزار تھا۔

"بھائی کس پر بجلیاں گرانے جا رہے ہیں؟" کانوں پر ہیڈ فون لگائے اور کسی گانے پر جھومتے سمیر اُدھر آیا تھا رائل بلیو پینٹ کوٹ کے نیچے سفید شرٹ پہنے بالوں کو سلیقے سے جمائے اپنی گھنی لمبی مونچھوں کے سروں کو تاؤ دیتے وہ اچھا خاصا وجیہ لگ رہا تھا اُس کا دراز قد اور کسرتی جسم اس ڈریس میں جاذب نظر اور پرکشش نظر آ رہا تھا۔

"دعوت پر" ارشام نے مختصر جواب دیا تھا اس گھر میں اگر تھوڑا بہت ارشام سے بے تکلف تھا تو وہ سمیر تھا اور سمیر تو اپنے تایا جان کا بھی بڈی (Buddy) تھا وہ کافی شرارتی اور نٹ کھٹ سا لڑکا تھا مگر دل کا بہت خالص دونوں بھائیوں کی عادات اپنے پاپا پر گئی تھیں نور اپنی ماں پر تھی۔

"اچھا میں سمجھا کسی کے ولیمے پر!" اب کی بار وہ شرارتی ہوا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے اس کی لُک کو سراہتے ہوئے گڈ کیا تھا۔

"ارشام نے اُسے گھورا تھا"۔ جبھی افراح تیار ہوئی اوپر سے اُترتی ارشام کی جانب چلی آئی تھی۔

سفید لباس میں وہ کوئی حور لگ رہی تھی سفید کلیوں کی لمبی فراک تھی جس پر ہلکا سا سلور کام تھا اور ساتھ ہی لمبا دوپٹہ تھا اس کے لمبے گھنے سلکی بال نائمہ نے کھول کر سٹریٹ (Strait) کیے تھے اور نیچے لوز کرل ڈالے تھے۔ لمبی گھنی پلکوں پر مسکارا اور آئی لائنر نے اس کی آنکھوں کو مزید خوبصورت کر دیا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک اور کانوں میں قدرے بڑے سلور کندن کے جھمکے اتنی سی تیاری سے ہی وہ جگمگا اٹھی تھی۔ بے حد معصوم اور حسین نظر آرہی تھی ارشام کی نظروں نے واپس مڑنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ موبائل وغیرہ پکڑے وہ آگے بڑھا تھا باہر جانے کو کترا گیا تھا وہ اس کی تیاری پر دل کی دھڑکن بھی اچھی نہیں لگی تھی اُسے آخری زینے پر اس کا پاؤں تھا جب ارشام اس کے پاس سے ہو کر گزرنے لگا۔ سلور ہائی ہیل میں اس کا سفید گلابی پاؤں مڑا اور وہ گرنے کو تھی جب ارشام نے بے اختیار اُس کے بازو کو تھاما تھا وہ جلدی سے سنبھلی تھی۔

"اف خدایا یہ شخص پرفیوم چھڑکتا نہیں نہاتا ہے۔" اس کے پرفیوم کی خوشبو جو اس کے بے حد قریب بھی سونگھ کر وہ مزید نروس ہوئی تھی گال بلش ہو کر گلابی ہو کر دہکنے لگے تھے ہاتھ اس کے ہاتھ میں کانپا تھا۔

"چلیں!" ارشام نے جلدی سے ہاتھ چھوڑا اور نظریں چراتا آگے بڑھ گیا تھا افراح اُس کے پیچھے تھی۔

دھیرے دھیرے پیار کو بڑھانا ہے
حد سے گزر جانا ہے

اپنی پشت پر سے ارشام کو سمیر کے گنگنانے کی آواز سنائی دی تھی۔

"تمہیں تو میں آکر پوچھوں گا"۔ ارشام نے سمیر کے کان کھینچنے کا ارادہ کیا تھا اور نسان فرنیٹر کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی جب وہ اس کے ساتھ ہوتی تو گارڈ پیچھے کیبن میں لگی کرسیوں پر بیٹھنے کی بجائے دوسری گاڑی میں فاصلہ رکھ کر ان کے ساتھ جاتے تھے یقیناً یہ ارشام کی ہدایت تھی۔ افراح نے نوٹ کیا تھا اپنے سلکی بالوں اور لمبے اور آرگنیزا کے دوپٹے کو سنبھالتی وہ فرنٹ سیٹ پر آن بیٹھی تھی گاڑی ایک دم جھٹکے سے سٹارٹ کر کے اس نے سپیڈ سے دوڑانی شروع کر دی تھی۔

"اُف کس قدر ریش ڈرائیونگ کرتا ہے یہ"۔ افراح مضبوطی سے بیٹھتے ہوئے سوچا تھا۔

✦✦✦

"ارے افراح تم اور یہاں What a pleasent surprise"۔

خوشگوار حیرت کا اظہار ہوا تھا یہ ایک نہایت ہی پرتعیش بنگلہ تھا جہاں ارشام اُسے لیکر آیا تھا یہاں کے مقیم کافی ایجوکیٹڈ، رکھ رکھاؤ اور پروقار لگے تھے پہلی نظر میں۔ نوکر انہیں ڈرائینگ تک چھوڑ کر گیا تھا جہاں پر افراد خانہ موجود تھے ارشام نے آگے بڑھ کر سب سے ہاتھ ملایا افراح اُسکی سنگت میں نروس سی آگے بڑھی تھی جبھی اُسے میم نایاب کی آواز سنائی دی۔

"میم آپ!!؟" حیرت اُسے بھی ہوئی تھی۔

"فیری بھابھی یہ افراح ہے میری بہت ہی اچھی سٹوڈنٹ ماشاءاللہ بہت ذہین اور پر اعتماد بچی ہے۔" نایاب نے اپنی تک سک سی تیار آفرین بھابھی کو مخاطب کرتے افراح کا تعارف کروایا تھا۔

"ارے بھئی فیری تو اس کا نام ہونا چاہئے سفید پری لگ رہی ہے she is so pretty ماشاءاللہ۔" آفرین نے اُس کے گال کو ہلکے سے چھوتے ہوئے تعریف کی تھی جس پر وہ بلش کر گئی تھی۔ ارشام نے یہ منظر دلچسپ نظروں سے دیکھا تھا واقعی وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کالے لباس میں بھی اس کی صورت من موہنی تھی اور سفید لباس میں بھی وہ پاکیزہ حور نظر آ رہی تھی۔ دل اُس کی سوچ پر کھنکارا تھا جس پر اس نے فوراً نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔

"بھئی! یہ میری مسز آفرین ہیں اور یہ میری چھوٹی بہن نایاب درانی ہے۔" سلمان صاحب نے تعارف کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

"اور یہ ارشام، اے۔ ایس۔ پی ارشام ہیں کل یاسر بہت تعریف کر رہا تھا ان کی بہت نڈر اور ایمان دار آفیسر ہیں اور مجھے ایسے نوجوان بہت پسند ہیں خوشی محسوس ہوتی ہے ایسے لوگوں سے مل کر بار بار تبھی تو انہیں اپنی محفل میں دعوت دی اور انہوں نے ہمیں شرف بخشا قبول کر کے۔" سلمان نے دونوں خواتین کو بتایا۔

"اور یہ مسز ارشام ہے۔" ساتھ ہی انہوں نے ارشام کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے افراح کا تعارف نبھایا ارشام نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نایاب کو وہ قدآور نوجوان اچھا لگا تھا دل کی ایک لے جیسے مس ہوئی تھی۔

"لیکن اس کا نام تو ارشام ہے۔" دل نے اُسے خوش گمانی سے سرگوشی کر کے نکالا تھا ارشام کو بھی لگا جیسے وہ گریس فل سی خاتون کو جانتا ہے، ملا ہے لیکن ایسا ناممکن تھا وہ پہلی بار مل رہے تھے انجان لوگ انجان جگہوں پر۔

"ویسے یاسر بھائی یمنیٰ نے زیادتی کی ہے ناں آکر کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی ان سے"۔ آفرین نے ڈی آئی جی یاسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ایک بار پھر معذرت اُسے واقعی بہت بری طرح سے فلو ہو رہا تھا ٹسٹ کروایا تھا الحمدللہ کرونا نہیں لیکن احتیاطاً وہ بھی ملنے ملانے سے پرہیز ہی کر رہی ہے جیسے ہی ٹھیک ہوگی پھر حاضر ہو جائیں گے۔" یاسر صاحب نے بتایا تھا اُن لوگوں نے اپنی نشستیں سنبھال لی تھیں نوکروں نے اشتہا آور کھانوں سے بھی ٹرالی لانی شروع کر دی تھی۔

"آؤ افراح ہم اِدھر بیٹھتے ہیں ان لوگوں نے اپنی بوری گفتگو کرنی ہوگی جو ہمارے مطلب کی نہیں"۔ نایاب نے افراح کا ہاتھ تھام کر قدرے فاصلے پر رکھے دوسری جانب اشارا کیا تھا اور وہ تینوں خواتین وہاں جا کر بیٹھی تھیں ساتھ ہی ایک ملازم ٹرالی اُدھر لے آیا تھا۔

"تم نے کبھی بتایا نہیں تمہاری شادی ہو چکی ہے"۔ نایاب نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

تب افراح نے مختصر الفاظ میں اچانک اپنے ہو جانے والے نکاح اور والد کی وفات کا بتایا تھا ان کا ذکر کرتے ہوئے آنکھیں بھیگ سی گئی تھیں۔ میم نایاب پورے ڈیپارٹمنٹ میں اپنی گریس فل اور ہیلپ فل شخصیت کی بناء پر دل عزیز تھیں کسی بھی سٹوڈنٹ کو کوئی بھی مسئلہ ہوتا وہ بلا جھجک میم نایاب کے پاس چلا جاتا مسئلہ حل ہوتا یا ناں ہوتا حوصلہ ضرور مل جاتا افراح کو وہ بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ ان کافی سمجھدار، سوبر اور ذہین سٹوڈنٹ تھی عجیب و غریب فیشن سے مبرا سادہ اور پروقار سی لڑکی۔ اُس کے حالات جان کر انہیں دلی دکھ ہوا تھا۔

اپنے جملوں سے انہوں نے اُسے کافی حوصلہ اور تسلی دی تھی اور ملازم نے آکر ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کا آکر بتایا اور وہ سبھی لوگ ایک پرتعیش کمرہ کھانے چلے آئے تھے۔

''یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں سر، ابھی میں اپنے پیچھا آدی سمجھوں گا ان سے بات کرنے کے لئے گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو پھر میں انگلیاں ٹیڑھی کرنا جانتا ہوں۔'' کھانے سے لطف اندوز ہوتے ارشام نے کسی بات پر سلمان سے کہا تھا نایاب نے اپنے بالکل سامنے بیٹھے نوجوان کی بات پر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''ارشام بیٹا یہ حربہ آپ ادھر تو استعمال نہیں کرتے ناں، بھئی یہ میری بیٹیوں کی طرح ہے آپ کی ایک شکایت پر آپ کو لائن حاضر کیا جاسکتا ہے۔'' نایاب نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کیا انہوں نے میری کوئی شکایت کی میم؟'' پراعتماد انداز میں مسکراتے ہوئے اُس نے نایاب کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا ''یہ آنکھیں'' اور پھر انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے خیالات کو بھی جھٹک دیا تھا۔

''خوش رہو! بہت سویٹ اور کیوٹ کپل ہے ماشاء اللہ، آتے جاتے رہنا۔'' آفرین انہیں رخصت کرتے ہوئے بولیں۔

''جی شکریہ اور ضرور۔'' ارشام نے جواب دیا تھا۔

''افراح سے تو ملاقات رہے گی یونیورسٹی کھلنے کے بعد لیکن چھٹیاں مزید بڑھا دی گئیں جانے کب یونیورسٹی کھلے۔'' نایاب نے بھی گفتگو میں حصہ لیا ارشام انہیں بے حد پیارا اور سوبر لگا تھا۔

''جی یونیورسٹی کھل جائے تو افراح اپنی ماسٹر ڈگری کمپلیٹ کرے گی۔'' اب کی دفعہ بھی جواب ارشام کی طرف سے آیا اور افراح کے دل کو اطمینان ہوا شاید اُس روز اُس نے اسی لیے یونیورسٹی کے متعلق جواب نہیں دیا تھا مزید چھٹیاں ہوگئیں افراح نے سوچا۔

شام ڈھل چکی تھی مونچھوں کو تاؤ دیتے وہ خوشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

''بہت حسین لگ رہی ہو آج تو میرا ان رومانٹک دیور بھی رومانٹک ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ ڈرائیونگ آج بھائی کے بس کی بات نہیں جب اتنی خوبصورت بیوی پہلو میں بیٹھی ہو۔'' تیار کرنے کے بعد نائلہ نے افراح سے کہا تھا۔

''جو نہ انہیں تو شاید میں نظر بھی نہیں آتی زبردستی تھی جو کردی گئی ہوں۔'' گاڑی سے اتر کر اُداس سی اپنی سوچوں میں گم وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

''کیوں سننا چاہتی ہوں اپنی تعریف اُس سے؟'' دل نے پوچھا تھا۔

''کیونکہ میں ان کی......'' بے ساختہ جواب دیتے دیتے وہ چپ ہوگئی تھی۔

''کیونکہ تم ان کی کیا......؟'' دل نے جواب پہ اُکسایا تھا۔

''کیونکہ میں ان کی کچھ بھی نہیں ہوں۔'' حقیقت بھرا جواب دیا تھا۔

اور انہی سوچوں میں اُلجھی وہ اپنے بڑے سے دوپٹے کے پاؤں میں اُلجھ جانے پر اپنا توازن کھو کر آخری سیڑھی سے گرنے لگی تھی جب پیچھے آتے ارشام نے دو سیڑھیاں پھلانگ کر فوراً اُسے تھام لیا تھا۔

''دیکھ کر'' وہ بولا تھا۔

''جاؤ جا کر Change کرلو جتنی تمہاری تعریف ہوئی ہے نظر لگوا کر کوئی چوٹ ناں کھا لینا۔'' مزید گویا ہوا تھا اُس سے قدرے پرے ہوتے ہوئے پلکیں جھپکتی وہ اپنے کمرے کی جانب مڑ گئی تھی جبکہ وہ وہیں کھڑا اُسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اپنی پشت پر دو نظروں کو محسوس کرکے وہ تھوڑا سا پلٹی تھی وہ سٹپٹا کر چپا کے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

''کیا یہ تعریف نہیں؟'' دل نے پھر سوال کیا تھا۔

''اُس کھڑوس سے ایسی تعریف کی ہی امید ہوسکتی ہے''۔ دل کی خوش گمانی کو اس نے یکسر نظر انداز کرتے وارڈ روب کا رخ کیا تھا۔

+++

''کیا سوچ رہے ہو؟!'' نظریں تو اس کی بک شیلف پر تھیں لیکن سوچ کہیں اور وہیل چیئر کو ہاتھوں کی مدد سے چلاتے ہوئے وہ اس کے پاس آکر بولے تھے وہ چونکا تھا اک شبیہ سی دماغ پر لہرائی تھی محض ایک نام ہونا اتفاق کے سوا کچھ ناں تھا خیالات کو جھٹکا تھا اُس نے۔

''اپنا شہر چھوڑ کر اس شہر میں ہی کیوں آ کر بسے کوئی اور شہر بھی تو ہوسکتا تھا۔'' اُس نے باسط صاحب سے سوال کیا تھا۔

''یہاں پر میرا ایک دوست رہتا تھا جس کی مارکیٹ میں بڑی اچھی جان پہچان تھی نئے نئے کاروبار کو یہاں پر قدم جمانا مجھے آسان لگا تھا اور ویسے بھی میں اس شہر آتا جاتا رہتا تھا، کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تھا۔

''ایسے ہی'' اُس نے ٹال دیا تھا۔ لمبی بات کرنے کا موڈ نہیں تھا جو وہ کرتا بھی نہیں تھا لفظوں کے خرچ ہونے کا ڈر ہی رہتا تھا اُسے۔

''زبیر آیا تھا کچھ سٹور کے متعلق تم سے ڈسکس کرنا چاہتا تھا شاید وہ ہیں منٹ کو Establish کرنا چاہ رہا ہے۔'' باسط صاحب نے بتایا تھا۔

''وہ جو کرنا چاہتا ہے کرے کاروباری سوجھ بوجھ بہترین ہے اس کی وہ اور چاچو اس میگا سٹور کو بہترین طریقے سے رن (چلا) کر رہے ہیں ہم نے تو بس رقم لگائی ہے۔'' ارشام نے گویا اجازت دی تھی۔

''ہاں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو میرے یوں بیٹھ جانے پر تو وہ باپ بیٹا ہی اتنے سالوں سے کاروبار دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس کا آئیڈیا اچھا لگا تھا تفصیلات سن کر اوکے کر دوں گا۔'' باسط صاحب نے تائید کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں چلتا ہوں'' اپنے اندر کی بات اندر ہی رکھے وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے چل پڑا تھا جب انہوں نے پکارا تھا اور کہا تھا۔

''ارشام بیٹا بہتر ہوگا کہ تم افراح کو کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونے دو۔''

وہ کچھ بھی کہے بغیر کمرے سے چلا گیا تھا اور وہ پھر سے ایک انجانے بوجھ تلے خود کو دبا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

+++

وہ جب کمرے میں آیا تو وہ نماز پڑھ کر دعا کر رہی تھی۔

''یہ عورتیں بھی ناں انسان تو انسان خدا کو بھی فریب دینے سے نہیں ڈرتی۔'' سر کو جھٹکا تھا اس نے اور کپڑے تبدیل کرکے وہ لیپ ٹاپ لئے بیڈ پر آن بیٹھا تھا اس کا اپنی جاب کا ہی اچھا خاصا برڈن تھا۔ آج کل وہ ایک خبر کے پیچھے خفیہ طور پر لگا ہوا تھا۔ افراح جائے نماز تہہ کرکے خاموشی سے صوفے پر جا کر لیٹ گئی تھی اور پھر کچھ دیر بعد ہی وہ گہری نیند سو گئی تھی ارشام

نے کام کرتے کرتے نظر اٹھائی تو وہ سامنے بے خبر معصوم بچے کی طرح سو رہی تھی اس کا سر ہمیشہ کی طرح کنارے پر ڈھلک آیا تھا۔

کیسے بتاؤں اسے کہ میں عورت ذات کو بھروسے کے قابل نہیں سمجھتا یہ تو اس کی نہ کریدنے والی اچھی عادت ہے جو میں اس کے خاموش وجود کو ابھی تک اس کمرے میں برداشت کیے ہوئے ہوں لیکن آخر کب تک اُلجھا اُلجھا سا لائٹس آف کر کے وہ بھی سونے کے لئے لیٹ گیا تھا افراح کی سائیڈ پر پڑا لیمپ کا بلب اُس نے روشن رہنے دیا تھا اندھیرے سے وہ گھبراتی تھی وہ جانتا تھا۔

رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا جب افراح کی آنکھ کچھ غیر مانوس آواز پر کھلی تھی اس نے غور سے سننا چاہا تو یہ آواز ارشام کے بیڈ کی طرف سے آ رہی تھی جیسے کوئی ہلکی ہلکی سسکیاں لے رہا ہو کسی کو پکار رہا ہو لیکن یہ آوازیں بہت ہلکی تھیں افراح فوراً اٹھ کر ارشام کے بیڈ کے پاس آئی تھی وہ تکیہ نیچے لئے اوندھا ہو کر بیڈ کے چوڑائی رخ سویا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ تکیے میں چھپا ہوا تھا اور وہ نیند میں سسک رہا تھا بچوں کی طرح شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا اتنے لمبے چوڑے مرد کو یوں نیند میں سسکتے دیکھ کر افراح حیران رہ گئی تھی۔

''ارشام اٹھیں۔ کیا بات ہے ارشام، ارشام!!'' اُس نے بیڈ کے قریب آ کر اُسے پکارا تھا لیکن وہ اٹھا نہیں تھا۔ افراح پریشان ہو کر آگے ہو کر اس پر جھکی تھی تا کہ دیکھ سکے کیا بات ہے اور اسے اٹھا سکے اس کی لمبی موٹی چوٹیاں اچانک ارشام کے کندھے پر آن گری تھی اور اس نے ارشام کو دوبارہ پکارتے ہوئے اب کی بار اس کا کندھا بھی ہلایا تھا اور دوسری بار قدرِ زور سے ہلایا تھا جبھی اچانک ارشام نے بیدار ہو کر اچانک افراح کو نیچے گرا کر اپنے ان دیکھے دشمن کو زیر کرنا چاہا تھا اب صورتِ حال یہ تھی کہ افراح بیڈ پر چاروں شانے چت تھی اور ارشام اس پر جھکا بس اُسے مکا رسید کرنے ہی والا تھا کہ افراح کی چیخ پر رک گیا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' غصے سے بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ اس کی دونوں کلائیوں کو اب بھی اس پر جھکے جکڑے ہوئے تھا۔

''آپ...... آپ نیند میں کچھ بول رہے تھے تو میں آپ کو جگا رہی تھی۔'' افراح اس کے نیچے کسمسائی تھی اچانک دونوں کو اپنی حالت کا ادراک ہوا تھا ارشام یک سرعت پلٹ کر بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا افراح بھی فوراً دوپٹہ درست کرتی جھکی نظروں کے ساتھ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھی تھی۔

''کافی Cheep (گھٹیا) حرکت تھی یہ اگر تم یہاں پر سونا چاہتی ہو تو......'' ارشام نے اپنے سے بات ہٹانے کے لئے الٹا افراح پر الزام لگایا تھا وہ جانتا تھا بچپن سے ہی اُسے نیند میں بڑبڑانے کی عادت ہے پپا اُسے بتایا کرتے تھے کہ رات نیند میں وہ یہ کہہ رہا تھا نہ جانے آج رات وہ کیا بول رہا تھا اس سے توجہ ہٹانے کے لئے اُس نے جان بوجھ کر افراح کو اُکسایا تھا طیش میں آنے کے لیے اور وہ آ بھی گئی تھی۔

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے یہاں پر سونے کا جانتی ہوں یہ زبردستی کا رشتہ ہے آپ کے لئے لیکن مجھے کسی کی زندگی میں زبردستی رہنا پسند نہیں میں اپنی اس مقام اور حیثیت پر مطمئن ہوں۔ آئندہ مرے ساتھ ایسی گھٹیا بات مت کیجیے گا کہ آپ کے احسان کو بھلا کر میں کچھ ایسا کہہ دوں جس سے آپ کی دل آزاری ہو۔'' افراح یکدم بیڈ سے کھڑے ہو کر اُسے بات مکمل کیے بغیر غصے سے بولتی چلی گئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اُس کا منہ توڑ دے ایسی بات سوچنے اور بولنے پر۔

وہ غصے سے بول کر پلٹنے لگی تھی جب اچانک غیر ارادی طور پر ارشام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا تھا۔

''روکو میرا مطلب......''

''آپ کا جو بھی مطلب تھا پلیز مجھے نیند آ رہی ہے۔'' ہاتھ چھڑا کر بات کاٹتے ہوئے وہ بولی تھی اور خفا سی اپنے صوفے پر جا کر لیٹ گئی تھی اس کی جانب سے اس نے غصے سے کروٹ لے لی تھی۔

ارشام کندھے اُچکا کر رہ گیا تھا جانتا تھا وہ سوئے گی نہیں۔ اب روئے گی توجہ ہٹانے کے چکر میں وہ واقعی نہایت ہی فضول بات کہہ گیا تھا اُسے۔

''نہ تو ناں سہی'' شانے اچکاتے وہ سونے کے لئے لیٹ گیا تھا اب تمہیں منانے تو میں لگا نہیں خواہ مخواہ سر پر چڑھوں گی۔ دل میں کہتے ہوئے وہ سونے کی کوشش کرنے لگا جس میں وہ تھوڑی دیر بعد یہ کامیاب ہو گیا تھا افراح کی نیند اُڑا کر وہ بھی نہ جانے روتے روتے کس وقت نیند کی گہری وادی میں اُتر گئی تھی۔

+++

بات چیت تو ان کے درمیان آگے بھی ناں ہونے کے برابر تھی خاص طور پر بیڈ روم میں لیکن ارشام اس کے باوجود اس کی خاموشی میں چھپی ناراضگی محسوس کر رہا تھا۔

''ویسے تو خطرہ ٹل گیا ہے اسے کوئی ذہنی دباؤ نہیں آنا چاہیے۔'' ڈاکٹر ارشاد کا جملہ پھر اس کے ذہن میں گونجا تھا۔

وہ عموماً ناشتہ کمرے میں کرتا تھا اور وہ بھی اس کی وجہ سے وہی کرتی تھی لیکن آج نماز پڑھ کر وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔ اور وہ جو محسوس کرتا تھا کہ کوئی انکھیوں سے اُسے تیار ہوا اُسے تیار ہونے کا جائزہ لے رہا ہے آج وہ نہیں تھا بے دلی سے تھوڑا بہت ناشتہ کیا اور کمرے سے نکل آیا تھا۔ متلاشی نظروں نے یونہی نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں تھیں اور پھر وہ پپا کے کمرے میں چلا آیا تھا وہ یہیں پر تھی اور ان کی بک شیلف میں سے کوئی کتاب تلاش کر رہی تھی اُسے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

''انکل میں آپ کا ناشتہ دیکھ کر آتی ہوں۔''

ارشام کو اس کے انداز پر غصہ آیا تھا جی چاہا تھا آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے اس کا دماغ درست کر دے۔ پپا سے ایک دو باتیں کر کے وہ آفس کے لئے نکل آیا تھا۔ نیچے آ کر وہ اُسے سامنے کچن میں نظر آ گئی تھی۔ نائلہ بھابھی کے ساتھ کوئی بات کرتے ہوئے پانی پینے کے لئے وہ کچن میں چلا آیا تھا اور وہ جو ٹرے میں ناشتہ سجا رہی تھی اُس کی آمد پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نائلہ بھابھی سے یہ کہتی ہوئی کچن سے نکل گئی تھی کہ ''بھابھی خادم حسین سے کہیے گا کہ دو کپ چائے بنا دے میں ابھی آئی۔'' ارشام کو اس کے انداز پر اب واقعی غصہ آنے لگا تھا باقی کے لوگ ناشتہ کر کے جا چکے تھے اور جو تھے وہ لیٹ کرتے تھے۔ لاؤنج خالی پڑا تھا دندناتا ہوا وہ اُس کے پیچھے آیا تھا اور پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے ہی اس کا بازو دبوچ کر اپنی طرف کیا اس اچانک حملے کے لئے وہ بالکل تیار نہیں تھی۔

تو جھٹک کر اس کے سینے سے آ لگی تھی اور پھر ایک جھٹکے سے اس سے دور ہوئی تھی۔

"کیا ہے یہ سب؟؟" وہ غصے سے آواز دبا کے بولا تھا۔

"کیا ہے؟" انجان بنتے اس نے الٹا پوچھا تھا منہ اب بھی پھولا ہوا تھا۔

"چاند میرا ناراض ہے نہ بات کرے نہ ملتا ہے کیسے اس کو سمجھاؤں نہ سمجھے رشتہ دل کا ہے" اچانک سمیر اپنے کمرے میں سے بلند آواز گنگناتا ہوا سیل فون میں مگن نکلا تھا وہ فوراً پیچھے ہٹ کر انکل کے کمرے کی طرف چلی گئی تھی اور باقی کا غصہ ارشام کو سمیر پر اتارنے کا موقع مل گیا تھا۔

"یہ تم کیا ہر وقت مراثیوں کی طرح گاتے رہتے ہو پڑھائی سے فارغ ہونے کا مطلب یہ بھانڈ بنے رہنا ہے ہر وقت۔" سمیر اس اچانک دھاوے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا فوراً سیل بند کرتے ہوئے بولا تھا۔

"تنگ نہ کریں بھائی آپ جانتے ہیں اس کے لئے گا رہا تھا اور میں ویڈیوز بناتا ہی رہتا ہوں آپ نے کبھی منع تو نہیں کیا"۔

آخری جملہ سمیر نے دھیرے سے کہا تھا لیکن ارشام نے سن لیا تھا۔

"ہوں تم سے میں آکر بات کرتا ہوں۔" سمیر کو گھورتے ہوئے وہ لاؤنج سے چلا گیا تھا۔

"جن سے کرنی چاہیے ان سے کرتے نہیں۔" سمیر پیچھے سے بڑبڑایا تھا اور یہ بڑبڑاہٹ اتنی بلند نہ تھی کہ ارشام نے سن لی تھی۔

"ابھی تو صحیح کھنچائی ہونے والی ہے اس کمبخت کی۔" دل میں سوچتا وہ پورچ کی جانب چلا گیا تھا اور سمیر کا رخ تایاجان کے کمرے کی طرف تھا ارشام بھائی کے عتاب سے اب اُسے تایاجان ہی بچا سکتے تھے۔

سارا دن مختلف کاموں اور میٹنگز میں بے حد مصروف گزرا تھا سلمان صاحب کے کام کے سلسلے میں بھی اُس نے ناصر کو بریف کرتے ہوئے بذاتِ خود ان کا مسئلہ حل کرنے کو خاص ہدایت دی تھی اور پھر شام کو گھر کے لئے نکل پڑا تھا گھر آکر وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تھا۔ جہاں ہمیشہ وہ اس کی منتظر ہوتی تھی لیکن کمرہ خالی تھا نیچے بھی وہ دیکھتا آیا تھا وہاں پر بھی نہیں تھی۔ وہ پپا کے کمرے میں چلا آیا۔ سلام دعا اور حال چال کے بعد وہ واپس کمرے میں آکر کپڑے تبدیل کر کے فریش ہو کر خادم حسین کو بلیک کافی لانے کا فون پر کہا تھا۔

"خادم حسین!!" جاتے ہوئے خادم حسین کو اس نے روک کر افراح کے متعلق پوچھنا چاہا کہ وہ کچن میں ہے لیکن اُس نے کبھی اس کا نام نہیں لیا تھا۔

"کچھ نہیں جاؤ۔" خادم حسن کو جانے کا اشارہ کیا تھا کمرے سے نکل کر وہ نیچے چلا آیا تھا نظریں اِدھر اُدھر دوڑاتے وہ کچن میں آیا تو وہاں نائلہ بھابھی پروین کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری میں مشغول تھیں۔

"کچھ چاہیے تھا ارشام بھائی؟" وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔

"آں ... ہاں وہ پانی، پانی پینا تھا۔" بہانہ بناتا ہوا وہ فریج کی جانب آیا اور بوتل سے دو گھونٹ پی کر باہر نکل آیا تھا۔

"آخر کہاں جا سکتی ہے باقی گھر کے افراد کے ساتھ اتنی فری تو نہیں کہ وہ ان کے کمرے میں جا بیٹھے۔" اسے تلاش کرتا وہ لان میں چلا آیا تھا نورا نے لان کی کرسی پر تنہا سیل فون میں مگن نظر آئی تھی تو گویا وہ نور کے ساتھ بھی نہیں۔

اچانک دل کو ایک خدشہ لاحق ہوا تھا وہ پریشان ہو اٹھا تھا۔ پلٹ کر وہ پپا کے کمرے میں آیا تھا۔ لیکن کمرہ خالی تھا پھر اس کے ذہن میں کوندا لپکا اور وہ فوراً اپنے کمرے میں آکر سیل فون سے افراح کو کال کی تھی۔ باسط صاحب اُس کے اچانک آنے اور جانے پر کندھے اچکا کر رہ گئے تھے۔ بیل جارہی تھی اور کچھ دیر بعد افراح نے فون ریسیو کیا تھا۔

"کہاں ہو!؟" چھوٹتے ہی سوال کیا تھا۔

"نیچے گارڈن میں" بھاری آواز کے ساتھ وہ بولی تھی۔

"گارڈن میں کہاں میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں تم وہاں نہیں تھی۔" اس نے پوچھا تھا۔

"پیچھے والے گارڈن میں"۔ وہ دھیمے سے بولی تھی۔

"اوپر کمرے میں آؤ"۔ لہجے میں تحکم نمایاں تھا۔

"میں ابھی یہیں کچھ دیر...."

"کہاں ناں اوپر کمرے میں آؤ۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ فوراً بولا تھا دوسری طرف سے فون بند ہوگیا تھا کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر وہ اس کا انتظار کرنے لگا تھا کچھ دیر بعد وہ کمرے میں چلی آئی تھی۔

دو بڑے قدم اٹھاتا وہ اس کے سر پر آن پہنچا تھا اور پوچھا۔

"کیا یہ سب؟" لہجے میں غصہ نمایاں تھا۔

"کیا؟" پھولے منہ اور بھیگی پلکوں کے ساتھ اُلٹا اُس نے سوال کیا تھا۔ چھوٹی سی نوز نے اس کے رونے کا فوراً بتایا تھا۔

"تم اچھی طرح سے جانتی ہو میں کیا پوچھ رہا ہوں کیوں صبح سے منہ پھلائے گھوم رہی ہو اور اب ذعلتی شام کو پچھلے گارڈن میں رونے کا شوق کیوں پورا کر رہی تھی۔"

وہ اس سے انجان نہیں تھا دل کو حیرانگی ہوئی۔

"آپ اتنے پڑھے لکھے اور اچھے انسان ہو کر اتنی گری ہوئی بات کیسے کر سکتے ہیں مجھ سے، مجھے اپنی خودداری بہت عزیز ہے میں جانتی ہوں میں آپ کو ناپسند ہوں زبردستی تھوپی گئی ہوں آپ کے سر، آپ کسی اور سے شادی کرنا چاہتے تھے اور گلے میں ڈال دی گئی لیکن میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی جیسا آپ نے میرے بارے میں سوچا۔" آنسوؤں کا گولہ حلق میں اُتارتے ہوئے اُس نے آخری جملے ادا کیے۔

"ایک بات ابھی اور اسی وقت اپنے دل و دماغ میں کلیئر کر لو کہ میں کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا میری جاب ہی میری محبت ہے جو میں نے بے حد محنت کر کے حاصل کی ہے اور اسی سے میری زندگی کے مقاصد جڑے ہوئے تھے۔ میں شادی جیسی بیکار چیز میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا اور بس فضول کی باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں کو اس حقیقت اور رشتے کو سمجھنے اور نبھانے کے لئے وقت درکار ہے میں تمہارے بابا سے کیے وعدے کا تمام عمر پابند ہوں اور یہ عہد میں نے ہوش و حواس کے ساتھ لیا تھا لیکن یہ سب بہت اچانک ہوا ہے اور میں اس عہد کو باخوشی نبھاؤں گا لیکن ابھی مجھے وقت چاہیے۔" ارشام نے کھڑے کھڑے اپنے دل کی بات کی تھی۔

"جس طرح تم سوچ رہی ہوں میں بھی تو سوچ سکتا ہوں کہ تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی اور....."

"کوئی نہیں" افراح نے ارشام کی بات کاٹتے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

’’آپ سے پہلے میری زندگی میں کوئی نہیں یہ فیصلہ اول روز سے میرے والدین کے سپرد تھا میری زندگی کا مقصد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تھا اور بس۔‘‘

ارشام روزانہ بہت سے لوگوں سے ملتا تھا کئی ملزم اور کئی مجرم اور وہ اپنے تجربے کی روشنی میں جان جاتا تھا کسی کی آنکھوں بے گناہی کی سچائی ہے افراح کی آنکھوں میں واضح سچائی وہ بھلا کیوں ناں دیکھ پاتا دل کو اطمینان ہوا تھا وہ شاید افراح سے یہی سننا چاہتا تھا۔

’’جیسے آپ کے لئے یہ رشتہ نیا اور اچانک ہے میرے لئے بھی تو ہے اور ساتھ میں اپنوں کو کھونے کا غم بھی ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے لیکن میرے لئے اس رشتے کو نبھانے کی وجوہات واضح ہیں میرے بابا نے مرتے ہوئے مجھے آپ کے ساتھ منسلک کیا تھا اور ایک ایسا شخص جس نے اپنا عہدہ دیکھا ناں اپنی زندگی کے مقاصد محض اپنے مرتے ہوئے ماتحت کا احسان اتارنے کے لئے فوراً اس کی بیٹی سے شادی کرلی اور پھر اس کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا اُسے چھت دی اپنا نام دیا عزت دی اور اس سے بڑی بات آپ سے یہ رشتہ تمام عمر دل و جان سے نبھانے کے لئے میرے نزدیک اور کیا ہوگی کہ آپ نے مجھ سے منافقانہ رشتہ نہیں رکھا۔ آپ کے دل میں جو ہے وہی ظاہر کیا اسی لئے کبھی اس رشتے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا کہ دل میں جس کے لئے کوئی جذبات نہ ہوں اس سے چند لمحے کی جذباتی وابستگی بھی کیوں اپنی نفسانی خواہشات پوری کرنے کے لئے بھی، میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں ارشام۔ آپ اگر اس رشتے کو بے نام رکھنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کی چوائس ہے میری نہیں میں آپ کو اور اس گھر کے افراد کو اپنانے کا فیصلہ کرچکی ہوں میں آپ کو جس طرح مجبور نہیں کرسکتی ہوں اس تعلق کو اپنانے کے لیے اسی طرح آپ بھی مجھے روک نہیں سکتے اس تعلق کو ناں اپنانے کے لئے۔‘‘

پراعتماد لہجے کے ساتھ اُس نے ارشام کو اپنا فیصلہ سنایا تھا اور ارشام بس شانے اچکا کر رہ گیا تھا۔

’’رات بہت ہوگئی ہے سو جاؤ۔‘‘ بس اتنا کہہ کر وہ اپنے بیڈ کی جانب چلا گیا تھا۔

وہ بس کمرے کے وسط میں خاموش کھڑی رہ گئی تھی اُس نے اپنے طرف کی گئی اس کی چوڑی پشت کو دیکھا تھا بظاہر یہ شخص بہت اکھڑ مزاج، غصیلہ نظر آتا ہے لیکن اپنے نرم احساسات پوشیدہ رکھتا ہے اگر میرے منہ چھلانے کی پرواہ نہیں ہوتی تو میرے خرچے بغیر سو جاتے ارشام تمہاری زبان جو کچھ کہہ رہی تھی نظریں نہیں وہ کہہ پائیں یہ سوچتی ہوئی وہ صوفے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ایک اس رشتے میں تمام عمر بندھا تو رہا لیکن نبھانے کو تیار نہیں تھا اور ایک تمام عمر اس رشتے میں بندھنے اور نبھانے کے لئے تیار تھا۔ فیصلہ کر کے اور سنا کر وہ دونوں پرسکون نیند میں کھو گئے تھے۔

+++

لیکن کوئی اور بھی تھا جو ابھی تک جاگ رہا تو جیسے یہ رشتہ کسی صورت منظور نہیں تھا اس رشتے کے بننے یا اس میں بندھے رہنے سے ان کا سب کچھ چھن جائے گا انہیں کچھ تو ایسا کرنا تو لیکن یہ تعلق پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے اور ایسا کرنا ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل تو بس پھر سے بساط بچھائی تھی اور پھر سے مہرے چلانے تھے۔ اور بازی پھر سے جیت جانی تھی اس کا انہیں یقین تھا۔

+++

اک نئی زندگی کا آغاز اُس نے خود کو ہمت دلاتے ہوئے اور اللہ سے مدد مانگ کر کر دیا تھا رات بھر وہ بڑبڑا رہا تھا اب کی بار وہ قریب ضرور تھی لیکن جگانے کی غلطی نہیں کی تھی۔ ہاں وہ اس کی گہری نیند میں بولے گئے جملے سن کر حیران تھی۔ اسے بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہوگا وہ اس گھر کے لوگوں کی فطرت سے آگاہ نہیں تھی پہلے اسے خیال آیا کہ موقع دیکھ کر وہ تائی بھابھی سے پوچھے گی۔ رخشندہ چچی اسے قابل بھروسہ نہیں لگی تھیں اس گھر کی بڑی تھیں گھر کے سارے معاملات اُن کے پاس تھے لیکن ان سے براہ راست بات کرتا ہے وہ جھجکی تھی نہ جانے وہ آگے سے کیا کہہ دے اور بات کو کوئی اور رنگ دے دیں تائی بھی ان کی بہو تھی ہوسکتا ہے اس کی چھان بین کا ذکر وہ چچی رخشندہ یا کسی اور سے کر دیں اس طرح اُس کی ذات سب کی نظروں میں آجائے گی تو پھر انکل باسط ہوں وہ مناسب تھے ان سے بات کرنا اُسے آسان لگا تھا ان کا دوستانہ اور پرشفیق رویہ اس کے سوالات کے لئے بالکل ٹھیک تھا۔ ارشام تیار ہو چکا تھا اور شاید خادم حسین کو فون کرنے لگا تھا ناشتے کے لئے وہ عموماً کھانا کمرے میں ہی کھاتا تھا باقی گھر والوں سے اُس کا انداز کھچا کھچا سا تھا وہ اپنے چچا سے بھی ایک دو جملوں سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا بہت کم گو اور گریز پسند سا تھا۔

’’انکل کے کمرے میں ناشتہ کرلیں؟!‘‘ اُس نے دو قدم بڑھ کر سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

’’میرا مطلب وہ اکیلے ہی ناشتہ کرتے ہیں نیچے سب کے ساتھ مل کر تو کرنہیں سکتے تو اُدھر کرلیں ناشتہ۔‘‘ قدرے جھجکتے ہوئے اس نے وضاحت کی تھی۔

’’خادم حسین! میرا ناشتہ چچا کے کمرے میں لے جاؤ، ہاں ان کے ساتھ ان کے کمرے میں کروں گا۔‘‘ فون پر خادم حسین کو ہدایت دیتا وہ بولا تھا اور اپنی ضروری چیزیں ڈریسنگ ٹیبل سے لیتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ افراح نے بھی خاموشی سے اس کی پیروی کی تھی۔

ناشتہ کرتے ہی وہ عجلت میں انہیں ہی آف کر کے چلا گیا تھا۔

’’ہوں یقیناً یہ تم نے کہا ہے اس سے؟‘‘ وہ دونوں بھی ناشتہ کرچکے تھے اب چائے پی رہے تھے باسط صاحب اس وقت وہیل چیئر پر ان کے پاس ہی کافی ٹیبل کے پاس بیٹھے ہوئے انداز لگاتے ہوئے بولے تھے۔

’’میرے ساتھ ناشتہ کرنے کو کیونکہ وہ تو ایسے تکلفات سے مبرا ہے۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے اور پھر کچھ لمحے کچھ سوچتے ہوئے افراح سے پوچھا تھا جس نے چائے ختم کرلی تھی اور ان کے سوال پر ہلکا سا سر اثبات میں ہلایا تھا۔

’’پتھر کو انسان بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے تم جیسی پیاری اور سمجھدار لڑکی سے مجھے یہی توقع تھی۔‘‘

’’جی! آپ میری مدد کریں گے؟‘‘ اُس نے باسط صاحب سے پوچھا تھا۔

’’پیاسے کے پاس کنواں چل کر آئے اور وہ پیاس نہ بجھائے اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوگی۔‘‘ انہوں نے مثبت انداز میں جواب دیا تھا۔

’’انکل اگر آپ براناں مانے تو ایک بات

اُس نے سوال کیا تھا۔

''دیکھو بیٹا اگر تم اس طرح مجھ سے پوچھو گی تو شاید دل کی بات نہ کر سکو اور نہ پوچھ سکو گی بغیر ہچکچائے پوچھو جو پوچھنا ہے میں تمہارے کسی سوال کا برا نہیں مانوں گا اور مجھے تم پر اعتماد ہے۔'' انہوں نے اسے اعتماد دلایا تھا اور اس کی ہچکچاہٹ کو دور کیا تھا جو کہ واقعی ان کے بات کرنے کے بعد دور ہوگئی تھی۔

''میں اکثر ارشام کو گہری نیند میں سوئے بڑبڑاتا سنتی ہوں، بعض دفعہ وہ بالکل بچوں کی طرح خواب میں سسکیاں لے رہے ہوتے ہیں کل رات بھی وہ نیند میں اپنی امی کو پکار رہے تھے ایک دفعہ پوچھا تھا میں نے والدہ کے متعلق بہت بری طرح سے ڈانٹ دیا تھا۔ مجھے اس دن آپ نے سب سے میرا تعاف کروایا لیکن ارشام کی امی کا کوئی ذکر کیا نہ بتایا کہ وہ حیات ہے یا...''

''میں نہیں جانتا وہ زندہ ہے یا مر گئی ہم لوگوں کے لئے تو وہ اُس روز مر گئی تھی جب وہ اپنے چھ سال کے بچے اور مجھے زندہ درگور کر کے اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی ایک قیامت ہے جو ہم پر گزر چکی ہے آج تک اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہا ہوں۔ آخر اُس نے ایسا کیوں کیا وہ ہمارے ساتھ بہت خوش تھی۔ ہم ایک اچھی اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ پہلی نظر میں ہی مجھے اُس سے محبت ہوگئی تھی وہ رخشندہ کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ والدین اُس کے وفات پا گئے تھے۔ اکلوتی تھی اور ماموں نے ہی اپنی بیٹی بنا کر پرورش کی تھی میری بات رخشندہ سے پکی کی گئی تھی اور جب میں دیکھنے گیا۔ اماں سے ضد کر کے کیونکہ ہمارے میں اس زمانے میں بی۔ اے پاس نوجوان تھا میرے سسر مجھے جانتے تھے اور میری عادات اور خاندان سے واقف تھے اور پسند کرتے تھے مجھے پہلی نظر میں ہی وہ پسند آ گئی تھی اور پھر گھر والوں کو منا کر چھوڑا تھا شادی کروں گا تو رخشندہ کی پھوپھی زاد بہن سے ابا اماں نے اس مسئلے کا حل یوں نکالا کہ میرا رشتہ ا[illegible]م کی ماں کے لئے مانگ لیا اور رخشندہ کا رشتہ اشفاق کے لئے رخشندہ کے والد کو کوئی اعتراض نہیں تھا یوں ہم دونوں کی شادی ہوگئی اُس روز ہم سب ایک رشتے دار کی شادی پر دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے ارشام بھی میرے ساتھ تھا۔ رخشندہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی نور ہونے والی تھی ابھی وقت تھا لہٰذا ارشام کی ماں اپنی بہن کے پاس رک گئی تھی اس کی دیکھ بھال کے لئے کوئی مسئلے والی بات نہیں تھی رات جب ہم سب گھر واپس آئے تو پتہ چلا کہ وہ جا چکی ہے۔ دہلیز اور حد پار کر کے زیور اور کچھ نقدی بھی ساتھ لے گئی تھی ایک خط میرے نام لکھ کر چھوڑ گئی تھی۔ جسے آج بھی میں سنبھالے بیٹھا ہوں بار بار پڑھ چکا ہوں اور بار بار خود کو مار چکا ہوں وہ ہمارا ہمسایہ تھا دیکھنے میں بہت سلجھا اور شریف لڑکا بچپن سے اُس کا ہمارے گھر آنا جانا تھا، سوائے ایک بوڑھی نانی کے اُس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا انہیں زمین کھا گئی یا آسمان پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا رہتا تھا۔ میں اُسے بس ایک بار مل جائے تو پوچھوں کیوں اس نے ایسے کیا، کیا کمی رہ گئی تھی میری محبت میں سارے خاندان، سارے زمانے سے لڑ کر ہر خواہش پوری کرتا تھا میں اس کی اُسے پڑھنے کی بہت خواہش تھی میں نے سب سے لڑ کر اسے پرائیویٹ بی اے

کروایا اس کی زندگی میں ایک جنون تھا اور وہ تھی تعلیم یہ میری غلط فہمی تھی میں آج بھی بے یقین ہوں وہ ایسی ہرگز نہیں لگتی تھی۔ ذات برداری ہماری بھی ایسی نہیں تھی رخشندہ کے والدین بھی فوت ہو چکے تھے جو لوگ تھے انہوں نے ہمارا جینا حرام کر دیا تھا۔ خاندان والوں کا اکٹھ ہوا تھا میں اس کے کردار پر اٹھنے والی انگلیاں برداشت نہیں کر سکا۔ بات تو تو میں میں سے بڑھ کر دست و گریباں تک پہنچ گئی۔ مجھے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ خاندان والوں نے ہم سے حقہ پانی بند کر دیا میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور اشفاق میرے چچا کا بیٹا ہے یتیم تھا اور میرے ابا اسے اپنے پاس لے آئے اور ہم دونوں کی پرورش کی تھی اشفاق بہت نیک، ایماندار اور مخلص انسان ہے ابا نے وہ گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے چند ہی دنوں میں اپنی تھوڑی بہت جائیداد بیچ کر اپنے گاؤں سے بہت دور اس شہر میں آ کر آباد ہو گئے۔ یہ بڑا سا گھر خرید لیا اور یہی پر ایک جنرل سٹور بنا لیا مجھے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوانی تھی افسر بنانا تھا اور مہنگے ترین سکولز میں پڑھانا تھا یہ جنون ہوگیا تھا مجھے اس لیے دن رات کاروبار کو ترقی دینے میں لگا دیئے۔ وقت گزرتا گیا پھر آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے بازار جاتے ہوئے یونہی لگا جیسے میں نے اُس کی جھلک دیکھی ہے۔ دیوانہ وار میں اس کے پیچھے بھاگا اور سامنے سے آتی کار سے بری طرح ٹکرا گیا ایک بار پھر وہ مجھے اذیت اور تکلیف میں مبتلا کر گئی تھی میرا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ نیچے کے مہرے فریکچر ہو گئے اور میرا نچلا دھڑ بیکار ہو گیا۔ اتنے سالوں کے علاج معالجے اور فزیوتھراپیز کے بعد میں اس قابل ہو سکا کہ خادم حسین کا سہارا لیکر ویئر چیئر پر بیٹھ جاتا ہوں اپنے ضروری کام سرانجام دے لیتا ہوں مجھ جیسے بدنصیب کے لئے یہ بھی اللہ کی نعمت ہے ارشام نے ان تمام حادثات کا اثر لیا لیکن کبھی ظاہر نہیں کیا وہ شروع سے ہی بہت کم گو ہو گیا تھا لیکن غصہ اس کے اندر بھرتا چلا گیا اور اب تو لگتا ہے اُس کی رگوں میں خون نہیں غصہ دوڑتا ہے۔ دن رات ایک کر کے اس نے CSS کی تیاری کی اور اے۔ ایس۔ پی بن گیا اور اپنے ہی شہر میں اس کی پوسٹنگ ہوگئی اس کی زندگی میں خوشی، شوق، مشغلہ سب کچھ اس کی جاب ہے اور بس عورت ذات سے وہ نفرت کرتا ہے ماں کی بے وفائی کا زخم اُس نے دل میں چھپایا ہوا ہے لیکن بہت گہرا ہے۔ اس میں اس کا قصور نہیں میں جب تنہا ہوتا تھا اور سوچوں کے زہریلے ناگ مجھے ڈستے تھے تو جانے انجانے میں ارشام کے آگے اپنی زہریلی زبان کا زہر اُگلتا تھا یہ سوچے جانے بغیر کہ یہ زہر میرے معصوم بیٹے کے دل و دماغ میں بھر چکا ہے۔ جب میں نے اسے شادی کا کہنا شروع کیا تب مجھے پتہ چلا کہ وہ عورت کو بھروسے کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس کی وفاشعاری اس کے نزدیک محض فریب ہے۔ اپنی ماں کی غلطی کی سزا وہ شاید لاشعوری طور پر سارے جہان کی عورتوں کو دینا چاہتا ہے ان پر یقین نہ کر کے وہ خائف تھا اور قسم کھائی کہ تمام عمر شادی نہیں کرے گا۔ ہوتا ہے میرے بچے ایسے بھی ہوتا ہے والدین کی ناکام زندگی کے پہلو بچے یوں اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور ان کے ناکام تجربات کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں ارشام بھی اپنی ماں کی بے وفائی کی بھینٹ چڑھ گیا وہ اس کا ذکر تو کیا اس گھر میں نام تک لینے کی اجازت نہیں دیتا وہ بہت ڈر گیا ہے افراح اُسے ڈر لگتا ہے کہ اگر عورت کو مت

جیسا جذبہ بے وفائی سے نہیں روک سکا تو پھر یہ وہ مخلوق ہے جس کی خاطر اپنی زندگی بے مول کر کے زندہ درگور نہیں ہونا چاہئے تقدیر نے پھر بھی اس کی زندگی میں تمہیں لکھ دیا اور مجھے تم سے مل کر اول روز یہ یقین ہوگیا کہ تم وہ روشنی ہو جو میرے ارشام کی زندگی کے اندھیرے مٹادے گی تم واقعی اُسے اپنے نام کی طرح خوشی دینے کا سبب بنوگی اور میں اپنے رب کے آگے شکر گزار ہوں جس نے ارشام کو تم جیسی بیوی سے نواز دیا۔" آنسوؤں سے لبریز انہوں نے اپنی گزشتہ زندگی کا ورق ورق افراح کو آگے کھول کر رکھ دیا تھا وہ خاموش ان کی دکھ بھری داستانِ حیات سنتی چلی گئی تھی۔ عورت جفا کار ہوسکتی لیکن ماں! ماں تو نہیں افراح کے دل کو یقین نہیں آیا تھا عورت کی ہی نہیں ایک ماں کی بے وفائی پر۔ چند لمحے ان دونوں کے بیچ خاموشی سے سرک گئے تھے اور پھر افراح گلا صاف کرکے بولی تھی۔

"انکل ارشام بہت اچھے ہیں ایمان دار اور پرخلوص ہیں میرے بابا یقیناً ارشام کی خوبیوں سے واقف تھے جبھی تو مرتے ہوئے وہ مجھے انہیں سونپ گئے میں نے اپنے باپ کے کئے گئے اس فیصلے کو اول روز سے ہی قبول کیا تھا مجھے ان کو یقین دلانا ہے عورت کی وفا پر، ان کا بھروسہ انہیں واپس لوٹانا ہے خود پر بھروسہ دلا کر میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں یہ ارشام کو ثابت کرکے چھوڑوں گی کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہے تو یقیناً میں انہیں ایک روز یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوجاؤں گی کہ عورت وفا کا پتلا بھی ہے۔"

"انشاء اللہ مجھے یقین ہے تم ایسا کرلو گی ارادے کی پکی لگتی ہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں میری بچی۔" نم آنکھوں سے انہوں نے افراح سے کہا تھا اور دل میں ارشام کی زندگی کے پھیکے رنگوں کو قوس وقزح میں بدلنے کے لئے۔ اپنے پروردگار کے آگے دعا گو تھے وہ ہمیشہ سے اور پروردگار نے افراح کی صورت میں ان کی دعائیں قبول کرلی تھیں افراح کو دیکھ کر ان کے دل کو یقین اور حوصلہ ملا تھا۔

"خادم حسین چچا کل سے صاحب کا ناشتہ میں خود بناؤں گی۔ آپ پلیز مجھے گائیڈ کردیں وہ کس طرح کا ناشتہ پسند کرتے ہیں"۔ باسط صاحب سے بات کرکے وہ سیدھی کچن میں چلی آئی تھی جہاں پر خادم حسن کچن سمیٹنے میں مصروف تھا اور نائلہ اُسے کچھ ہدایات دے رہی تھی۔

نائلہ کو سلام کرنے کے بعد اُس نے براہ راست خادم حسین سے کہا۔

"ہوں، ویری گڈ" نائلہ نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔

"جی بی بی جی میں بتادیتا ہوں کہ صاحب کیا ناشتہ لیتے ہیں۔ ذرا یہ برتن دھولوں ہاتھ گیلے ہیں"۔ خادم نے مؤدب انداز میں افراح کو بتایا تھا۔

"ہاں، ہاں آپ فارغ ہوکر مجھے تفصیل سے سمجھا دیجئے گا۔" افراح فوراً بولی تھی اور واپس جانے کے لئے مڑی تھی جب نائلہ نے اسے پیچھے سے پکارا تھا اور اس کے ساتھ ہی لاؤنج میں چلی آئی تھی۔

"افراح اب جبکہ تم نے یہ رشتہ نبھانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو میری بات ایک بڑی بہن کی طرح سنا میں نے اول روز سے ہی تمہیں چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھا ہے ارشام بھائی دیکھنے میں بہت سخت مزاج کے لگتے ہیں لیکن اصل میں وہ ایسے ہے نہیں زبیر کو یا انکل کو کچھ بھی مسئلہ ہو

ارشام ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ وہ حل کرنے کے لئے ہم سب کا بہت خیال کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر نہیں کرتے۔ میری اور زبیر کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ بھی اپنا گھر بسالیں کیونکہ ہم وہ سب کچھ جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں جو تم نہیں جانتی اور تاں اس کی ضرورت ہے۔" نائلہ ایک پل کے لئے بات کرتے کرتے رک گئی تھی۔

"آپ کہئے میں سن رہی ہوں، میں بھی آپ کو بڑی بہن ہی سمجھتی ہوں۔" افراح نے فوراً کہا تھا۔

تمہاری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ حالات جو بھی رہے ہوں، ایک بڑا صدمہ بھی جھیلا ہے جس کا دکھ تمام عمر رہے گا۔ لیکن زندگی رک جانے کا نام نہیں غم کو سینے سے لگا کر جیا نہیں جاسکتا۔ تم اتنے سادہ سے حلیے میں رہتی ہو خود کو سنوارا کرو۔ ارشام کے آنے تک تھوڑا سا بنک سنک سے تیار ہوکر ان کی منتظر رہا کرو۔ تمہارا اچھے سے تیار ہونا انہیں اچھا لگے گا۔ دنیا کے 99 فیصد مرد اپنی بیوی کی تعریف بے شک کھل کر نہ کرسکتے ہوں یا کرنا نہیں جانتے لیکن دل ہی دل میں وہ اُسے نوٹ ضرور کرتے ہیں۔" نائلہ افراح کو سمجھایا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے آپی لیکن میں ہمیشہ سے ہی سادہ مزاج رہی ہوں۔ سجنے سنورنے، میک اپ، جیولری یا ویسے کپڑے میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے......"

"کوئی مسئلہ نہیں آج ہی شاپنگ کرلیتے ہیں نور جو ان کی باتیں سنتی ہوئی ان کے پاس چلی آئی تھی افراح کی بات اُچکتے ہوئے فوراً بولی۔

"بھابھی آپ کو مما بلا رہی ہیں۔" ساتھ ہی نائلہ کو اپنی مما کا پیغام دیا تھا اور وہ فوراً چچی کی بات سننے چلی گئی تھی۔

"آپ کے پاس اورنج کلر کا سوٹ ہے آج شام وہ پہن کر تیار ہونا، ارشام بھائی کو وہ رنگ بہت پسند ہے۔" نور نے ارشام کے ساتھ بھائی کا صیغہ بمشکل لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"دراصل ارشام بھائی جب بھی مجھے شاپنگ کراتے ہیں اورنج کلر ضرور لیتے ہیں۔" نور چہکتی بولی تھی۔

"نہیں میرے پاس یہ رنگ نہیں مجھے اورنج کلر پسند نہیں۔"

افراح نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو تم میاں بیوی کی پسند ناپسند بھی نہیں ملتی خیر ہاں یاد آیا میرے پاس نیا نکور سوٹ پڑا ہے ابھی کچھ دن پہلے ہی لائی تھی۔ شاید تمہاری قسمت میں لکھا تھا اس لئے ایک بار بھی نہیں پہنا تم وہ پہنو شام کو اپنے میاں صاحب کو اچھا سا سرپرائز دینا۔" نور نے افراح سے کہا اور اس کے نفی پر سر ہلانے پر معصوم صورت بناتے بولی۔

"ہم سب نے تمہیں اس گھر میں قبول کرلیا ہے ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں مجھے خوشی ہوگی اگر تم اور ارشام بھائی اچھی زندگی گزارے تو اس لئے میں تمہاری ہیلپ کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر شاید تمہیں پسند نہیں آیا میرا آئیڈیا"۔ منہ لٹکاتے ہوئے نور نے کہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں بھی تمہیں اپنی چھوٹی نند مانتی ہوں۔ بابا اور جیسا تم کہو لاؤ دو مجھے وہ سوٹ میں شام کو پہن لوں گی۔ اب خوش۔" اُداس چہرہ بنائے نور سے افراح نے اُسے خوش کرتے ہوئے کہا تھا۔ نور جھٹ اُسے اپنے کمرے میں لیکر آئی اور الماری میں سے ہینگ کیا ہوا ایک تیز اورنج رنگ کا فراک نکال کر

افراح کو دیا وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی افراح نے اُس کا دل رکھنے کے لئے وہ فراک تھام لی۔

+++

اُس کی گوری رنگت پر یہ رنگ کافی بچ رہا تھا۔ اُسے زیادہ تیار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ قدرت کا شاہکار تھی۔ بڑی لمبی پلکوں والی بادامی آنکھیں لمبے گھنے ریشمی بال، نازک اندام سراپہ اور گوری گلابی رنگت نازک پنکھڑیوں سے ہونٹ اور چھوٹی تیکھی سی ناک اس فراک کے ساتھ کنٹراسٹ میں جامنی اور اورنج دھاریوں والا دوپٹہ تھا۔

''ہاں ناصر وہ خانہ بدوشوں والی رپورٹ مجھے ای میل کر دو۔ میں آرام سے بیٹھ کر اُسے چیک کروں گا۔'' فون پر بات کرتے ہوئے ارشام اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا جب اُس کی نظر افراح پر پڑی تھی ایک پل کو وہ ٹھٹھک گیا تھا اور دوسرے ہی پل اُس کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے بڑی آنکھوں میں غصہ اترنے لگا تھا اپنی مونچھوں کو ایک ہاتھ سے تاؤ دیتا ہوا وہ اُس کے سر پر آ پہنچا تھا۔

''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے!''۔ لہجہ کاٹ دار تھا۔

''فوراً بدلو یہ کپڑے آئندہ تم مجھے ان کپڑوں میں نظر نہ آنا۔''

اس کے کندھے کو ہلکا سا وارڈ روب کی طرف دھکا دیتے ہوئے اُسے تنبیہ کی تھی۔

افراح کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ پڑ گیا تھا تعریف تو دور کی بات ہے اچھی خاصی بے عزتی کر ڈالی تھی ارشام نے۔ وہ کچھ نہیں کہے گا اس کی توقع تو افراح کو تھی لیکن اتنا غصہ کرنے کی بالکل امید نہیں تھی۔

واش روم میں آ کر اس کی آنکھوں سے احساسِ توہین سے آنسو ٹپک پڑے تھے۔

''ابھی سے بہت ہار گئی ابھی تو آغاز ہے۔'' دل نے آواز دی تھی جلدی سے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتی وہ باہر چلی آئی تھی اس نے ہلکے سے گرین رنگ کا قمیض شلوار زیب تن کیا ہوا تھا۔

''آپ کافی انکل کے روم میں پیئے گا یا یہاں بنا کر لے آؤں؟''

خود کو سنبھالتے ہوئے وہ اُس سے پوچھنے کو بڑھی جو سٹڈی ٹیبل کی دراز میں سے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ راستے میں پڑے اس کے جوتے پر افراح کا دھیان نہیں گیا جن سے اُلجھ کر وہ گرنے لگی تھی جبھی مڑتے ارشام نے تیزی سے اُسے آگے بڑھ کر گرنے سے روک لیا تھا اور بے اختیار بولا تھا۔

''سنبھل کر!'' اب لہجہ نرم تھا شاید وہ اس کی گلابی آنکھوں کو دیکھ چکا تھا جو اُس کے رونے کا پتہ دے رہی تھیں۔

''عجیب شخص ہے یہ دل پر چوٹ لگاتا ہے اور چوٹ لگنے سے بچاتا ہے۔'' افراح نے دل میں سوچا تھا۔

اُسے چھوڑ کر وہ پرے ہوا تھا۔

''خادم حسین کہاں ہے؟'' اُس کے کافی کا پوچھنے پر ارشام نے پوچھا تھا۔ افراح نے فوراً جواب دیا تھا۔

''نیچے کام کر رہے ہوں گے لیکن آج سے آپ کے سارے کام میرے ذمے میں خادم چاچا انکل کو سنبھالے گے اور......''

''اور تم مجھے!!'' اُس کی بات اچکتے ہوئے اُس نے جملہ مکمل کیا تھا وہ اپنی شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا۔ افراح نے اس کے اِدھر اُدھر پھیلائے سامان کو نظریں جھکائے اٹھاتے ہوئے ''جی'' کہا تھا۔ ارشام وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''بلیک کافی اور پپا کے کمرے میں۔'' واش روم جاتے ہوئے بولا تھا اپنے غلط رویے کا شاید اُسے احساس ہوا تھا۔ جبھی سیدھے طریقے سے جواب دیتا وہ واش روم چلا گیا تھا۔

''کیا میں انہیں اس رنگ میں اچھی نہیں لگی یا تیار ہوئی اچھی نہیں لگی۔'' افراح خود سے الجھتی کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ نور نے اُسے کچن میں سادہ کپڑوں میں جاتے دیکھا تو اپنی کمینی مسکراہٹ روک نہ پائی۔

ارشام کی اس رنگ کے ساتھ کوئی تلخ یاد وابستہ تھی ایک بار نور نے اورنج کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا جب بھی ارشام نے اُسے بری طرح جھڑک دیا تھا اور سختی سے منع کیا تھا کہ آئندہ اورنج رنگ اس پورے گھر میں کہیں نظر نہ آئے۔

''ارشام کی محبت میں حاصل نہیں کر پائی تو تمہیں کیسے حاصل کرنے دوں گی اتنی آسانی کے ساتھ افراح بی بی۔'' حسد سے سوچتی ہوئی وہ اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئی تھی۔

+++

کافی لیکر جب وہ باسط صاحب کے کمرے میں آئی تو سبھی وہاں موجود تھے ایسا کم ہی ہوتا تھا اس گھر کے ہر فرد کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ زبیر اور اشفاق چچا چونکہ میگا سٹور سنبھالتے تھے تو اُس میں ہی بے حد مصروف رہتے تھے۔ رات گئے تک واپسی ہوتی تھی ان کی نائلہ کی زبانی افراح کو پتہ چلا تھا کہ انکل باسط کے ایکسیڈنٹ کے بعد کاروبار محدود ہو گیا تھا ارشام تو اپنی سٹڈی پر فوکس تھا جبھی زبیر نے آگے بڑھ کر اس کاروبار کو نئے سرے سے بڑھانے کا سوچا تھا۔ تب ہر ایک کو اس کی صلاحیت پر شبہ تھا کہ کمائی کے اس ذریعہ سے بھی جائے گے۔ چچا اشفاق اور چچی رخشندہ نے بہت کھل کر مخالفت کی تھی تب ارشام نے زبیر کا ساتھ دیا اور اس پر اعتماد کیا تھا اور اپنی سیونگ اُس کے حوالے کر دی تھی کہ زبیر ذہین، محنتی اور کاروباری سوچ رکھتا ہے۔ وہ ضرور ڈیلی میں ترقی کرے گا اور زبیر نے یہ کر دکھایا تھا وہ ہمیشہ ارشام کا ممنون اور احسان مند رہتا تھا اگرچہ اُن میں بے تکلفی نہیں تھی لیکن وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے بظاہر یہ سارا کاروبار باسط صاحب اور ارشام کا تھا لیکن اس کی ترقی اور دیکھ بھال اشفاق صاحب اور زبیر کے ذمے تھی اور وہ دونوں باپ بیٹا اس کاروبار کو امانت کے طور پر لیتے تھے اور خیانت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے ارشام نے ہی زبیر کو چالیس فیصد اس کاروبار میں اپنا پارٹنر بنایا تھا حالانکہ رقم اور سٹور سب ارشام کا تھا لیکن وہ زبیر پر اعتماد کرتا تھا اور زبیر نے بھی اُس کے بھروسے کو کبھی رتی بھر آنچ نہیں آنے دی تھی ہر مہینے وہ سارا کھاتہ شام کو چیک کرواتا تھا اگر وہ فارغ نہ ہوتا تو باسط صاحب کو پوری تفصیل دیتا اور جہاں ضرورت ہوتی ان سے مشورہ لیتا وہ انہیں بہت احترام دیتا تھا۔

افراح نے اپنے سر پر دوپٹے کو جماتے ہوئے کافی کا مگ صوفے پر بیٹھے ارشام کے پاس ٹیبل پر رکھ دیا تھا اُس کا اُترا چہرہ ارشام نے ایک نظر میں بھانپ لیا تھا۔

''خیر سے نئی نویلی دلہن نے خود ہی کچن سنبھال لیا بہت اچھی بات ہے۔''۔ رخشندہ چچی نے میٹھی چھری کی طرح بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ویسے تو کھیر پکوائی کی رسم ہوتی ہے لیکن تمہاری آگے کونسی رسمیں ہوئی ہیں جو یہ بھی ہوتی

"تم آکر مجھے بتا کر یہ کام شروع کرتی تو میں یہ رسم ضرور کرواتی۔" رخشندہ چچی نے ارشام کو ایک نظر دیکھتے ہوئے شیریں لہجے میں کڑواہٹ گھولی تھی۔ کڑوی کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے ارشام نے خاموش افراح کو دیکھا تھا۔

"چچی آپ کو تو شوگر ہے میٹھے کی رسم آپ کے لئے زہر ثابت ہوتی۔" ارشام نے براہ راست رخشندہ چچی سے کہا تھا۔

"ارے بیٹا یہ زہر، یہ شوگر بھی تو اپنوں کا دیا روگ ہے ایسا غم کا پہاڑ گرا مجھ پر کہ کم بخت شوگر جیسا مرض لگ گیا۔ ہائے..... ہائے....."

"امی نائلہ کی بہن کی شادی قریب آرہی ہے وہ لاہور دس پندرہ دن پہلے جانا چاہ رہی ہے۔" زبیر نے ارشام کے سرخ پڑتے چہرے کو ایک نظر دیکھتے چچی رخشندہ کی بات کاٹتے اپنی جانب متوجہ کیا اور سب جو ایک دوسرے سے رخشندہ کی بات سن کر نظریں چرانے لگے تھے۔ سکھ کا سانس لیا تھا۔ اشفاق نے اپنے بیٹے کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا تھا کہ ابھی خاصی محفل کو گھمسان کا رن بننے سے بچالیا تھا۔ زبیر نے ورنہ ارشام اور رخشندہ دو دھاری تلوار ہی تھے ایک دوسرے کے لئے۔

"ہائے ہائے ابھی پورے بیس دن پڑے ہیں اتنی جلد جا کر کیا کرنا ہے۔" وہ فوراً ہی متوجہ ہوئی تھیں۔ نائلہ جو سب کے خالی چائے کے کپ ٹرے میں رکھ رہی تھی خاموش رہی۔

"نہیں جی نہیں گھر کون دیکھے گا اتنے دن"۔ فوراً انکار کیا تھا۔

"امی اس کی سب سے چھوٹی اور آخری بہن کی شادی ہے۔ شادی بیاہ کا کام ہے۔ آنٹی سے اکیلے سب نہیں ہو پا رہا کئی بار فون کر کے ریکوئسٹ کر چکی ہیں کہ میں نائلہ کو پہلے بھیج دوں۔" زبیر نے کہا تھا۔

"ہاں ہاں یہ تمہارا نی وہاں کے کام نبٹا لے اور میں شوگر کی ماری نوکروں کے ساتھ پورے گھر کو کیسے دیکھوں آفرین ہے۔ تم پر زبیر جورو کے غلام کبھی ماں کی بھی فکر کر لیا کر"۔ رخشندہ چچی نے کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر جواب دیا تھا باسط صاحب نے اشفاق چچا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"امی کچھ دن کی تو بات ہے پلیز۔" زبیر نے منانا چاہا ارشام زبیر کالا یار جسٹر دیکھنے میں منہمک رہا تھا وہ ان کی معاملات میں بہت کم پڑتا تھا۔

"نہیں بھئی نہیں"۔ نائلہ کا چہرہ اتر گیا تھا خاموش بیٹھی افراح نے دیکھا وہ شاید پلکیں جھپک کر اپنے آنسو بھی چھپا رہی تھی۔

"چچی جان اگر آپ برا ناں مانے اور مناسب سمجھیں تو میں دیکھ لیتی ہوں گھر کو آپی مجھے سمجھا دے گی سب اور پھر آپ بھی ہے گائیڈ کرنے کے لیے۔" افراح نے کہا تھا اور ارشام نے فوراً سر اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا تھا۔

"ہوں یہ ٹھیک رہے گا رخشندہ جانے دو نائلہ بیٹی کو افراح دیکھ لے گی"۔ باسط صاحب نے فوراً افراح کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"حد کرتے ہیں بھائی صاحب آپ بھی اسے کیا معلوم گھر گرہستی کے معاملات کا پانچ سال ہو گئے نائلہ بی بی یہ ڈھنگ سے نہیں کر پاتی اور اسے تو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے اس گھر میں آئے۔" رخشندہ چچی نے فوراً جواب دیا تھا۔

"نائلہ بیٹی سمجھا دے گی اور تم بھی ہو سب سمجھانے کے لئے ہو جائے گا۔ سب نائلہ کی والدہ کا مجھے بھی فون آیا تھا۔ وہ بے چاری واقعی

اکیلی گھبرائی ہوئی تھیں۔ شادی کے سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ دو تو ان کی بیٹیاں ہیں بیٹا تو ابھی کم سن ہے نائلہ ہی اُس گھر میں بڑی ہے۔ نائلہ بیٹا تم جانے کی تیاری کرو اور افراح کو سب اچھی طرح سے سمجھا دینا ویسے بھی پروین اور خادم حسین بے پرانے ملازم ہیں سب کام سمجھتے ہیں اتنے دن تو ہم تمہارے بغیر نکال ہی لیں گے۔" اشفاق صاحب نے نائلہ کو اجازت دیتے ہوئے کہا اور رخشندہ چچی نے غصے سے منہ پھیرا تھا۔

"تم نے یونیورسٹی نہیں جانا سٹڈی کے ساتھ گھر کیسے دیکھو گی"۔ اس سارے معاملے میں ارشام پہلی بار بولا تھا وہ بھی براہ راست افراح سے سوال کیا تھا۔ گویا اُسے افراح کے پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں اور وہ اُسے اپنا لاسٹ سمسٹر پورا کرنے کی اجازت دے رہا تھا۔ افراح کا چہرہ ارشام کی بات سن کر کھل اٹھا تھا ارشام نے اس کے چہرے پر اترتی خوشی کو قدرے دلچسپی سے دیکھا تھا۔

"کرونا کی وجہ سے تعلیمی اداروں کی چھٹیاں مزید بڑھا دی گئیں ہیں تقریباً ایک ماہ تو سارا دن میں فارغ ہی ہوں ویسے بھی نائلہ آپی نے میرا اتنا خیال رکھا ہے اگر مجھے موقع مل رہا ہے تو میں کچھ دنوں میں سمجھ جاؤں گی گھر کے نظام کو"۔ افراح نے اطمینان سے جواب دیا تھا اُس کا اعتماد لوٹ آیا تھا بظاہر تو وہ ارشام سے ناراض تھی اور اس کا اظہار اس نے ارشام کی بجائے باسط صاحب کو دیکھتے ہوئے ارشام کے سوال کا جواب دیا تھا۔

"بھئی سب کچھ طے ہو چکا مجھ سے تو رسماً پوچھا جا رہا ہے اب یہ بھی بتا دو برخوار کہ آپ کی بیوی اکیلی بہاولپور سے لاہور کا سفر کرے گی یا پھر آپ بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سسرال میں سالی صاحبہ کی شادی کے معاملات سنبھالے گے"۔ چچی نے طنزیہ انداز میں زبیر سے پوچھا تھا۔

"نہیں امی میرا جانا ابھی ممکن نہیں سمیر آج کل فارغ ہے یہ چلا جائے گا نائلہ کے ساتھ"۔ زبیر نے جواب دیا تھا۔

اور موبائل میں سر دیئے چھوٹے بیٹے کی جانب، چچی نے دیکھا تھا۔

"ہوں تو اس لئے تم سب لوگ آج یہاں اکٹھے ہوئے ہو سارا پروگرام طے کر کے مجھے تو رسماً پوچھا جا رہا ہے۔" چچی رخشندہ نے موڈ آف کئے ہوئے کہا تھا۔

"چھوڑیے بھی چچی آپ کو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔ تفتیش برائے تفتیش پر چلتی ہیں آپ ملزم کو سانس بھی نہیں لینے دیتی اور ایک بات یہ اس گھر میں نئی ہے آپ کا فرض بڑوں کی طرح آرام سے اور پیار سے گھر کے کام سمجھانا ہے۔" ارشام نے اب کی بار مداخلت کی اور بات نبٹا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سمیر تم نائلہ کو چھوڑ کر دوسرے دن ہی واپس آجاؤ گے سمجھے۔"

چچی نے ارشام کی بات کا جواب ناں دینے کے لئے سمیر کو مخاطب کیا تھا جس کا منہ بن گیا تھا وہ لاہور میں اپنے ہی پروگرام ترتیب دیئے بیٹھا تھا یہ سن کر کہ نائلہ بھابھی کو وہ چھوڑنے جا رہا ہے۔

"او کے امی ڈن" سمیر نے ان کے گھورنے پر بسورتے ہوئے کہا تھا۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں سر میں درد ہونے لگا ہے۔" رخشندہ چچی بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی افراح کو لگا جیسے ان کی دلچسپی اس محفل سے ختم ہو گئی ہو۔ وہ شاید ارشام کو افراح کے سامنے دھمکائے رکھنا چاہتی تھیں وہ کوئی نہ کوئی

ایسا جملہ ضرور کہہ جاتی جو ارشام کی والدہ کے حوالے سے ہوتا اگر افراح کو انکل باسط سے ساری کہانی معلوم ناں ہوئی تو وہ ان کے ڈھکے چھپے جملوں پر چونکتی ضرور۔

''تو کیا ارشام ڈرتے ہیں کہ مجھے ان کی والدہ کے متعلق کچھ پتہ نہ چلے، مجھے ان کا ڈر ختم کرنا چاہئے پر شاید ابھی نہیں اگر میں نے یہ ظاہر کر دیا کہ میں ان کی والدہ کے متعلق جانتی ہوں تو وہ بھڑک اُٹھے گے اور میری محبت کو خودترسی سمجھ کر ٹھکرا دے گے۔'' افراح نے دل میں سوچا۔

''اوہ تو تمہیں محبت ہوگئی ہے اس لئے غصیلے نوجوان سے''۔ دل نے شرارتی سا سوال کیا تھا جس کے جواب پر افراح کے لبوں کو ہلکی سی شرگیں مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

''تھینک یو سوچ افراح'' نائلہ کی آواز پردہ چونکی تھی جو اُس کے قریب آکر بولی تھی زبیر بھی پیچھے کھڑا تھا۔ اشفاق، چچی، ارشام اور سمیر جا چکے تھے افراح کو اپنی سوچوں میں پتہ بھی نہ چلا تھا ان کے جانے کا۔

''کس بات کے لئے آپی آپ نے مجھے جانے بغیر میرا اسپتال میں اتنا خیال رکھا اور اول روز سے میرے ساتھ بڑی بہنوں جیسے پیش آتی ہیں آپ کی محبت کے لئے اتنا تو کر سکتی ہوں آپ بے فکر ہو کر جائیں اور اپنی بہن کی شادی کو خوب انجوائے کرے''۔ افراح نے محبت سے نائلہ کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''ہوں تو محترمہ نرم دل واقع ہوئی ہیں''۔ ارشام جو دوبارہ ایک ضروری کام یاد کرنے پر واپس کمرے میں آیا تھا افراح کی بات سن کر دل میں سوچا تھا۔

''پھر بھی شکریہ افراح اگر تم ہامی نہ بھرتی تو میں شاید اسے امی سے اتنے دنوں کی اجازت نہ دلوا پاتا''۔ زبیر نے بھی افراح کا شکریہ ادا کیا تھا۔

''اِٹس او کے زبیر بھائی ایسے کہہ کر شرمندہ نہ کریں۔ پلیز ویسے آپ میری مدد کا بدلہ اتار سکتے ہیں''۔ کچھ خیال آنے پر افراح نے کہا تھا۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ ارشام دروازے کے قریب کھڑا ہے اس کی دروازے کی طرف پشت تھی۔

''وہ کیسے میری چھوٹی بہنا؟'' زبیر نے قدرے حیرانگی سے پوچھا تھا۔ نائلہ اور باسط صاحب نے بھی سوالیہ نظروں سے افراح کو دیکھا۔

''کل شادی کی شاپنگ کروا کر آپی کو خوب ساری شاپنگ کروائیے شادی کے لئے ورنہ میں چچی جان کے سامنے اپنی آفر واپس لے لوں گی۔'' افراح نے دھمکی دی تھی۔

''ارے نہیں بھئی اتنے دن میں اپنی بیگم کا ناراض چہرہ برداشت نہیں کر سکتا۔ جیب پر پڑا بوجھ برداشت کرلوں گا۔'' زبیر نے فوراً کہا تھا نائلہ اور باسط صاحب اُس کی مسکین صورت بنانے پر ہنس پڑے تھے۔

''میں یہ کہنے آیا تھا کہ کل شام آپ کی ڈاکٹر کے پاس اپائنمنٹ ہے میرے آنے سے پہلے تیار رہے گا''۔ افراح ارشام کی آواز پر چونک کر مڑی تو موصوف یہیں پر موجود تھے اتنا کہہ کر وہ پلٹ گیا تھا۔

''آؤ افراح کچن میں چلتے ہیں میں تمہیں کچھ کام سمجھالوں''۔ نائلہ نے افراح کا ہاتھ تھام کر کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

''تایا جان شطرنج کی بازی ہو جائے کافی دن ہو گئے کھیلے ہوئے''۔ زبیر نے خوشگوار موڈ میں باسط صاحب کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

''یوں کہو کافی دن ہو گئے ہارے ہوئے۔'' باسط صاحب نے خوشگوار انداز میں جواب دیا۔ اور پھر دونوں ہی ہنس پڑے۔ زبیر سائڈ ٹیبل پر رکھی شطرنج لینے بڑھ گیا۔ ''وہاں میز پر سجاد میں وہیل چیئر پر بیٹھ کر کھیلوں گا۔'' باسط صاحب نے زبیر سے کہا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

+++

کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے
نہ گئی تیرے غم کی سرداری
دل میں یوں روز انقلاب آئے

دل کی دھڑکن اور رات کے تیسرے پہر منتشر تھی۔ نارسائی کا بوجھ اب دل مزید سہنے سے عاری تھا آخر کب تک وہ اپنی زندگی کو یوں گھسیٹتی چلی جائے آخر کب تک اپنے کندھوں پر پڑے نہ دکھنے والے عذاب کا بوجھ ڈھوئے آخر کس کے آگے دہائی دے کیسے صفائی دے کیسے چھٹکارا حاصل کرے۔ ان ناکردہ گناہوں سے جو اُس نے کئے ہی نہیں تھے یہ زندگی سراپا الزام تھی اس کے لئے ہی اب اور نہیں میرے اللہ میں تھک گئی ہوں۔ میں ہار رہی ہوں زندگی کے اس بھاری بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے مجھے یوں موت نہ دے میرے اللہ مجھے سچائی کی موت دے بائیں طرف سینے میں اٹھتی ہلکی ہلکی ٹیس پر وہ اپنے رب کی بارگاہ میں سراپا التجا بنی ہوئی تھیں۔ درد رک نہیں رہا تھا کرب جان کنی کا تھا مجبوراً انہوں نے ہمت کرتے ہوئے سیل فون پر اپنے مہربان اور مخلص رشتے سے مدد طلب کی تھی اور دوسری طرف نیند میں ہونے کے باوجود انہوں نے فوراً فون اٹھایا اور اس کی لرزتی آواز سن کر مستعدی سے بستر سے اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف بھاگے تھے ساتھ ہی انہوں نے اپنی نصف بہتر کو بھی جگا کر صورتحال بتاتے ہوئے اپنے ہمراہ لیا تھا۔ وہ دونوں فوراً اُس کے کمرے کی طرف بھاگے تھے۔

+++

آدھا چاند ہمیشہ کی طرح ادھورا اور خاموش تھا ارشام نے کھڑکی میں آسمان پر اترے چاند کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا ارشام کو آدھا چاند ہمیشہ اپنے ادھورے پن پر افسردہ لگتا تھا۔

''مجھے اُسے یوں ڈانٹنا نہیں چاہئے تھا وہ کیا جانے میرے اندر کے آتش فشاں کو جو کبھی کبھی میرے رویے میں لاوے کی طرح بہہ نکلتا ہے نفرت ہے مجھے اس رنگ سے کیونکہ میری آخری یاد میں جب وہ مجھے چھوڑ کر گئی تب اس نے اسی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اس دہلیز کو پار کرتے ہوئے اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا مجھے کتنی نجات تھی اُسے ہمیں چھوڑ کر جانے کی زمانے کے طنز و تشنیع کے تیروں کے آگے ہمیں اکیلا چھوڑ گئی۔ چھلنی ہو گیا یہ دل بھی اور سینہ بھی میرا دل مرجھا چکا برباد ہو چکا۔ اس میں اب کوئی عورت آکر آباد نہیں ہو سکتی یہ تو کھنڈر ہے، اجڑا دیار ہے میں اسے آباد کر ہی نہیں سکتا اور یہ معصوم سی لڑکی جو میری قسمت میں لکھ دی گئی کیسے بناؤں دل کا رشتہ اس کے ساتھ جبکہ دل تو ہے ہی نہیں یہ میرے حق میں ہے پورا اختیار رکھتا ہوں اس پر لیکن جب دل ہی خالی ہو تو میں کیسے چند لمحوں کے لئے اپنا حق استعمال کر کے اس کے وجود سے منکر ہو جاؤں۔ میں تمہیں اپنے قریب نہیں آنے دے سکتا۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ بے ایمانی ہے اور میں دغا باز ہوں اور نہ بے ایمان میں تو بس ممتا کا ڈسا ہوا ایک کھوکھلا وجود ہوں۔''

نہ جانے وہ کیا کچھ سوچے جا رہا تھا جب افراح نائلہ سے گھر کے امور کے متعلق ضروری باتیں جان کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔

''ارشام آپ سوئے نہیں ابھی تک؟ کچھ چاہئے؟'' خاموشی سے کھڑکی کے پاس باہر چاند کو دیکھتے ہوئے کچھ کھوئے کھوئے سے ارشام کے پاس آ کر اس نے پوچھا تھا۔

''پتہ نہیں دل آج کیوں بے چین سا تھا جیسے کوئی قیمتی چیز کے کھو جانے کا احساس ہو۔''

''ارشام!!'' افراح نے پکارا تھا کتنا کھویا سا اور اُداس لگ رہا تھا وہ اس وقت ''کاش تم اپنے دل کا درد میرے ساتھ بانٹ لوں کب سے اس بھاری بوجھ کو کندھوں پر اٹھائے چل رہے ہو اپنے یہ دکھ مجھے دے۔

''آدھا آدھا بانٹے گے تو بوجھ کم ہو جائے گا۔''

افراح نے دل میں ارشام سے کہا تھا۔

''ہوں! بس سر میں درد ہو رہا ہے''۔ کھوئے کھوئے سے ہی اس نے جواب دیا تھا۔ افراح یہ سن کر واش روم گئی اور تیل کی بوتل لئے واپس آئی تھی۔

''آپ اِدھر بیڈ پر بیٹھئے میں سر کی مالش کر دیتی ہوں۔ سر درد ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے بابا کہا کرتے تھے۔ میرے پاؤں کی انگلیوں میں جادو ہے ایک ایک پور میری سر کا درد چن لیتی ہے۔'' افراح نے ارشام کے قریب آ کر کہا تھا۔

''نہیں!!'' ارشام نے نفی میں سر ہلایا وہ اب بھی چاند کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''پلیز! ارشام! آپ بیٹھئے اِدھر''۔ افراح نے اس کا بازو ہلکے سے بیڈ کی جانب کھینچتے ہوئے کہا اور وہ کھویا سا بیڈ پر جا بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی انسان آبلہ پائی میں اس قدر چور ہو جاتا ہے کہ پیروں تلے ریت بھی روئی لگتی ہے۔ مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ افراح نے اس کے قریب پیچھے کھڑے ہوتے ہوئے سر میں تیل لگا کر ہلکی ہلکی مالش کرنا شروع کی نہ جانے کیا سرور تھا۔ اس کی انگلیوں میں ارشام کی آنکھیں کچھ دیر میں ہی بوجھل ہونے لگیں۔ سر کا بھاری پن ہلکا ہو گیا تھا وہ اس کی کن پٹیوں کو دھیمے دھیمے سے سہلا رہی تھی اور وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کی قربت سے خائف تھا اب بس آنکھیں موندے اس کی انگلیوں کی حرکت سے سکون محسوس کر رہا تھا۔ ارشام کو نیند آنے لگی تھی اور وہ سر کے اشارے سے اُسے بس کہتا ہوا لیٹ گیا تھا۔ اس کے پپوٹے نیند سے بوجھل تھے اور جب وہ تیل واش روم میں رکھ کر ہاتھ دھو کر واپس آئی تو وہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ افراح نے اُس کے چہرے کی جانب ہلکی سی مسکراہٹ سے دیکھا۔ سوتے ہوئے بالکل معصوم بچے کی طرح لگتے ہیں اے ایس پی صاحب غصیلی بڑی اور روشن آنکھیں جو بند ہے کھڑی اونچی ناک بھی اب پرسکون ہے اور یہ تاؤ کھاتی گھنی مونچھیں جو ہلکی ہلکی داڑھی کے ساتھ خوب جچتی تھی۔ اُس کے چہرے پر اور یہ بھرے بھرے گلابی ہونٹ اُف توبہ انگارے چبائے رکھتے ہیں افراح نے محبت سے اُسے دیکھتے ہوئے ارشام پر چادر اوڑائی اور خود بھی صوفے پر جا کر لیٹ گئی۔ چاند نے کھڑکی سے یہ سارا منظر دیکھا اُسے لگا۔ آج وہ جو آدھا ادھورا ہے۔ بہت جلد پورا ہونے والا ہے۔

❊❊❊

کبھی یک بہ یک توجہ کبھی دفعتاً تغافل
مجھے آزما رہا ہے کوئی رخ بدل بدل کر

وہ کافی فریش موڈ میں تھی وہ جو ابھی ابھی اُٹھا

تھا اُس کے قریب آ کر پوچھا تھا۔

''اب آپ کے سر کی درد کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے''۔ بے رخی سے جواب دیتا وہ بیڈ سے اتر کر واش روم جانے کے لئے تیزی سے اٹھا اور وہ جو قریب ہی کھڑی تھی جلدی سے پیچھے ہٹی تو پاؤں مڑنے سے توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ ارشام نے اس کا بازو تھام کر اسے گرنے سے بچایا۔

''لگتا ہے ساری عمر تمہیں گرنے سے ہی بچاتا رہوں گا''۔ کوفت زدہ بولا تھا۔

''حرج بھی کیا ہے؟'' ترنت جواب آیا تھا ایک جھٹکے سے اس نے افراح کا بازو چھوڑا تھا اور واش روم کا دروازہ زور سے بند کیا تھا۔

''آہ! یہ دروازے میری طرح آپ کے بلاوجہ غصے کے عادی ہو چلے ہیں اے ایس پی صاحب''۔ دل میں اُسے مخاطب کرتی وہ اُس کے ناشتے کی تیاری کے لئے کمرے سے نکل گئی تھی۔

رات وہ اتنا نرم کیسے پڑ گیا کہ جو اُس نے کہا مان لیا کیا ضرورت تھی سر درد کے لئے مالش کروانے کی خواہ مخواہ امیدیں باندھے گی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے کوئی امید لگائے جب امید ٹوٹتی ہے تو دل ٹوٹ جاتا ہے۔ چلتے شاور کے نیچے کھڑے وہ یہی سوچ رہا تھا۔

''تم کس بات سے ڈرتے ہو امید دینے سے یا اس کا دل ٹوٹ جانے سے؟؟'' کسی نے اس کے اندر سے پوچھا تھا اور اس نے فل شاور کھول کر اپنے جسم پر ٹھنڈا پانی گرنے دیا تھا شاید اندر کی آواز دبانا چاہتا تھا۔

❊❊❊

اتنا لمبا چوڑا مینیو سن کر افراح خاموش ہی رہی تھی اور پھر یہ سوچ کر کمر کس لی تھی کہ شاید چچی اُس کی مہارت کا اندازہ لگانا چاہتی ہیں۔

نائلہ صبح سویرے ہی سمیر کے ساتھ لاہور کے لئے روانہ ہو گئی تھی۔ وہ اسے ہر چیز سمجھا اور بتا گئی تھی پھر بھی ضرورت پڑے تو اپنا سیل نمبر افراح کو دے گئی تھی کہ بوقتِ ضرورت وہ اُسے کال کرے ناشتے سے فراغت پا کر وہ چچی کے کمرے میں دستک دے کر چلی آئی تھی سب لوگ اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔

''آج پروین چھٹی پر ہے گھر کا سارا کام تمہیں کرنا ہے۔'' چچی نے اس کے کمرے میں آنے پر بتایا تھا۔

''اور سنو باہر پورچ کو پہلے دھو لو کافی گندہ ہو رہا ہے۔'' سارے کاموں کی تفصیل سمجھا کر واپس مڑتی ہوئی افراح سے کہا تھا اُن کے انداز اور آنکھوں میں ایک چبھتا ہوا سا یہ چیلنج تھا افراح نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چلی گئی۔

چچی کے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پا چکا تھا اور نائلہ کی غیر موجودگی اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ضروری تھی جبھی تو تھوڑی سی بحث کے بعد انہوں نے نائلہ کو میکے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

گیٹ کی طرف کمر کئے وہ بڑے سے پورچ کو دھونے میں مصروفِ عمل تھی۔ جب باہر گیٹ کے گاڑی رکی اور ارشام نے گارڈ کو فون کر کے چھوٹا گیٹ کھولنے کو کہا وہ اپنا لیپ ٹاپ گھر ہی بھول گیا تھا۔ راستے میں یاد آنے پر اس نے گاڑی واپس گھر موڑ لی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو سامنے اُسے پائپ سے پورچ دھوتے ہوئے دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے سر پر آن پہنچا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' ہمیشہ کی طرح اس کی

آمد سے بے خبر اس کی آواز پر وہ بری طرح اچھلی تھی اور ہاتھ میں پکڑا پائپ کا رخ مڑتے ہوئے اس کی طرف کر دیا تیز دھار سے اے ایس پی ارشام ایک دم بھیگا تھا۔

''افوہ!'' افراح نے گھبرا کر پائپ نیچے پھینک دیا۔

''آئی ایم سوری آپ ہمیشہ یوں اچانک آ کر مجھے ڈرا دیتے ہیں''۔ گھبرائی افراح نے فوراً کہا تھا۔

''میں نے پوچھا یہ کیا کر رہی ہو؟ نوکر کہاں مر گئے ہیں جو تم یہ کام کر رہی ہو؟'' وردی پر سے پانی کو جھاڑتے ہوئے اُس نے سوالات کئے تھے۔

''پروین کی چھٹی ہے اور چچی نے کہا کہ پہلے یہ کام کرلوں''۔ افراح نے جھٹ جواب دیا تھا۔

اُس کے جواب پر ارشام نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے ہمراہ تیزی سے اندر لا کر چچی کے کمرے میں آن کھڑا ہوا۔ چچی جو آرام سے بیڈ پر نیم دراز تھیں یوں اچانک ارشام کو اپنے سامنے پا کر حیران رہ گئیں۔

''کس حیثیت سے آپ نے اسے یہ کام کرنے کو دیا ہے سب نوکر مر گئے ہیں۔ کیا؟ مت بھولیئے یہ میری بیوی ہے اس گھر کی بہو آئندہ آپ اسے ایسا کوئی کام نہیں سونپے گی جو اس کے شایان شان نہ ہو''۔ غصے سے بھرے وہ آ کر بولا تھا۔

''ارے بیٹا اس چیز کا تو احساس دلانے کے لئے یہ کام کروایا ہے۔ میں نے اگر تم اسے اپنی بیوی سمجھتے تو کیا یہ ایسے بوسیدہ کپڑوں میں اس گھر میں گھوم رہی ہوتی ایک رات بیوی بنا کر اسے اُٹھا لائے اور جیسے بھول ہی گئے۔ ویسے تم نے نہیں ہونے دیا اگر تمہاری بیوی ہے تو کیا تم کا فرض نہیں۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھو پروین اس سے اچھے کپڑے پہنتی ہے اور یہ نویلی دلہن ہو کر اتنے سادہ سے حلیے میں ہوتی ہے نوکر چاکر باتیں نہ کریں گے کبھی تم اسے شاپنگ کرانے لے گئے یا تھمانے بس اسی چیز کا احساس دلانا تھا۔ تمہیں مجھے پتہ تھا کہ یہ تمہیں ضرور بتائے گی کہ میں نے اسے کیا کام سونپا ہے۔ پر اتنی جلدی بتائے گی مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔'' بات کو سنبھالنے کی کوشش میں وہ بس بولتی چلی گئی تھیں۔

''ویسے بھی ارشام بیٹا ماضی میں کچھ بھی ہوا ہو اس کی سزا اس معصوم بچی کو کیوں دے رہے ہو جیسی میرے لئے نائلہ ہے ویسی ہی میرے لئے افراح ہے۔ میں نے تو اسے اپنی بہو تسلیم کرلیا ہے۔'' انہوں نے گویا ارشام کی دکھتی رگ کو دبانا چاہا۔

''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا ایک ضروری چیز بھول گیا تھا وہی لینے آیا تھا مصروف ہوں اس لئے اور ویسے بھی کرونا کی وجہ سے باہر گھومنے گھمانے کا کوئی سین نہیں۔ آئندہ مجھے یوں احساس دلانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہمارے ذاتی معاملات میں گھسنے کی ضرورت ہے۔'' ارشام نے چچی کی باتوں کا جواب اور تنبیہ ایک ساتھ کرتے ہوئے ہنوز اس کا ہاتھ تھامے اوپر اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا جیسے لیکن کہہ نہیں پایا اور لیپ ٹاپ کا بیگ پکڑے کمرے سے نکل گیا تھا اور افراح کے لبوں پر دھیمی سی مسکان آئی تھی۔

''آئندہ ایسے فضول کام کرنے کی ضرورت نہیں اور دوپہر کو تیار رہنا میں آجاؤں گا''۔ وہ پھر واپس آیا اور گویا ہوا۔

''تیار کس لئے؟'' افراح نے سنجیدہ صورت بناتے پوچھا تھا۔

''شاپنگ پر جانا ہے۔''

''آپ چچی کی باتوں کو سریس لے رہے ہیں، شاپنگ کی ضرورت نہیں ہے مجھے، آپ اتنے مصروف رہتے ہیں اور ویسے بھی شام کو انکل کو ڈاکٹر کو دکھانے لیجانا ہے پلیز اٹس او کے''۔ مڑتے ہوئے ارشام سے افراح نے کہا تھا۔

''ویسے بھی چچی کی باتیں سچ ہو جائیں گی اور اگر آج ہم شاپنگ پر گئے اور میں نہیں چاہتی وہ جس طرح سے ہمارے متعلق بول رہی تھیں وہ اس پر پکی ہو جائیں، میں جانتی ہوں آپ کو دوبارہ بات دہرانے کی عادت نہیں لیکن آج رہنے دے پلیز۔'' افراح نے ارشام کے کچھ بولنے سے پہلے کہا تھا اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا تھا افراح ایک لمبی سانس سینے سے خارج کرتی ہوئی کچن میں چلی آئی تھی اور کھانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔

''ارشام کو...... ارشام بھائی کو چائنیز بہت پسند ہے مما نے اسی لئے ایک دو چائنیز ڈشز بتائی ہیں وہ مجھے کہہ رہی تھیں اگر تمہیں میری ہیلپ چاہئے تو میں حاضر ہوں کبھی بنائی ہیں چائنیز ڈشز۔'' ابھی ابھی نور نے کچن میں آ کر افراح کو بتایا تھا اس کے سوال کا مطلب افراح کو سمجھ آ گیا تھا لیکن اُس کے چہرے پر پھیکی سادگی اور دوستانہ مسکراہٹ پر اُس نے نرم لہجے میں ہی جواب دیا تھا۔

''ہاں آتی ہیں کوکنگ کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور میں اپنے گھر چائنیز، اٹالین اور دیسی کھانے ٹرائی کرتی رہتی تھی''۔ شملہ مرچ کو باریک کاٹتے ہوئے افراح نے جواب دیا تھا۔

''اور تمہاری ہیلپ کا شکریہ میں بتالوں گی۔'' نور نے افراح کے جواب پر کندھے اچکائے تھے اور بیسٹ آف لک کا اشارہ کرتی ہوئی کچن سے چلی گئی تھی۔

+++

دوپہر کے کھانے کو بنا کر وہ باسط انکل کے کمرے میں چلی آئی تھی صبح ناشتے کے بعد اُن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

''انکل کھانا تیار ہو چکا ہے میں پوچھنے آئی تھی لے آؤں آپ کے لیے؟'' کمرے میں جھانک کر اس نے پوچھا تھا اور وہ جو کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھے اُس کے سوال پر شفیق سی مسکراہٹ سے بولے تھے۔

''ہاں بالکل خادم حسین سے کہو وہ لے آتا ہے۔''

''میں نے بتایا ہے میں خود ہی لیکر آتی ہوں''۔ ویسے بھی اُس نے خادم حسین کو دلان کے پودوں کی کانٹ چھانٹ کا کام سپرد کیا ہوا تھا۔ اتنا کہہ کر وہ پلٹی اور باہر سے آئے ارشام نے اچانک زور سے دروازہ کھولا اور پلٹتی ہوئی افراح کے ماتھے کو دروازہ آن لگا۔ درد سے بے اختیار اُس کے منہ سے ''ہائے اللہ'' نکل گیا تھا ارشام نے فوراً اندر آ کر اس کے ماتھے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے۔ ''چوٹ تو نہیں لگی'' پوچھا تھا۔

''مجھے کیا پتہ تھا کہ تم دروازے کے پاس ہی کھڑی ہو''

''اور مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ دروازہ کھولیں گے'' بسورتے ہوئے بولی تھی دن میں تارے نظر آ گئے تھے ماتھے پر ہلکا سا گومڑ بن گیا تھا۔

''عجیب شوق ہے ہر قوت خود کو چوٹ لگانے پر تلی رہتی ہو چلو کسی گرم کپڑے سے ماتھے کو سینکو آرام آ جائے گا۔'' ارشام نے اس

کے گومڑ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں'' انکل کے سامنے ارشام کی آفر پر وہ جھینپ گئی تھی۔

ارشام نے اپنی مسکراہٹ بمشکل دبائی تھی۔

''کمرے میں شاپنگ بیگز پڑے ہیں انہیں جا کر سنبھال لو۔ میں نے کبھی اس طرح کی شاپنگ نہیں کی اب جو آ گیا ہے اس پر گزارہ کرو''۔ ارشام نے اسے اطلاع دی تھی اور آگے بڑھ کر ''اسلام علیکم پپا'' کہتا ہوا صوفے پر جا بیٹھا تھا۔

''وعلیکم سلام بیٹا! تم کھانا یہیں پر لگوا دو تینوں مل کر کرتے ہیں''۔ باسط صاحب نے افراح سے کہا تھا وہ کافی دلچسپ نظروں سے ان دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ افراح کے کمرے سے جانے کے بعد بھی وہ ارشام کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہے تھے اس کا احساس ارشام کو ہو گیا تھا جبھی وہ سیل فون پر سنجیدہ صورت بنائے مصروف ہو چکا تھا۔

ارشام نے کھانا بہت کم اور بے دلی سے کھایا تھا تعریف کرنا تو کجا وہ بس چند لقمے لیکر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا تھا کہ میں کچھ دیر کمرے میں آرام کرنے جا رہا ہوں جبکہ باسط صاحب نے اس کے کھانے کی بہت تعریف کی تھی افراح کا دل بجھ گیا تھا شاید ارشام کو نور کے ہاتھوں کا چائنیز کھانا پسند ہے دل نے اُداس ہو کر سوچا تھا۔

✦✦✦

''تھینک یو! سب چیزیں بہت اچھی اور میری پسند کے مطابق ہیں لیکن آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کیا''۔

''چچی نے مجھے میری کوتاہی کا احساس دلایا اور وہ مجھے ہو بھی گیا ہمارے درمیان جو بھی ہے میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ وہ اس گھر میں موجود کسی فرد یا نوکروں کی نظر میں آئے۔'' ارشام نے بیڈ پر بیٹھے لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے افراح سے کہا تھا وہ افراح کے لئے سلے ہوئے بوتیک کے کپڑے، جوتے، جیولری حتیٰ کہ میک اپ کا سامان لایا تھا اور افراح کو اس کی شاپنگ سے اس کے نفیس ذوق کا اندازہ ہو گیا تھا ہر چیز واقعی بہت اچھی تھی لیکن اس کا جواب اتنا اچھا نہیں تھا افراح چپ چاپ کمرے سے نکل گئی تھی ارشام ناصر کو فون کر کے کسی ضروری کیس کو ڈسکس کرنے لگا تھا فراغت پاتے ہی اُس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

✦✦✦

''اُداس لگ رہی ہے میری بیٹی''۔ وہ سیدھی باسط انکل کے کمرے میں چلی آئی تھی یہ ان کی دوائی کا وقت تھا اس سے دوائی لیکر کھانے کے بعد وہ بولے تھے وہ جو چپ چاپ پانی کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔ بیڈ کے پاس رکھی چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

''ویسے ہی اماں بابا کی یاد آ رہی ہے۔'' اُداس سی بولی تھی اور ارشام جو اُسے دیکھتا ہوا پاپا کے کمرے کی طرف چلا آیا تھا اس کے اگلے جملے کو سن کر وہیں دروازے کے پیچھے ٹھٹھک گیا تھا۔

''اور؟!'' باسط صاحب نے اُسے بولنے پر اکسایا تھا۔

''دھوپ چھاؤں سا مزاج رکھتا ہے آپ کا بیٹا، کبھی لگتا ہے اُس سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ نہیں میری کوئی اور کبھی لگتا ہے یکدم تپتے صحرا میں لاکھڑا کیا ہو مجھے میری بنائی چیزوں کی تعریف تو دور کی بات وہ انہیں ڈھنگ سے کھاتے بھی نہیں Mocha Caffee بناؤں یا آج چائنیز

وہ دیکھتے تک نہیں۔ شوخ رنگ پہنوں تو اکھڑ تیور ہو جاتے ہیں، میری حیثیت کا خود ہی تعین کرتے ہیں اور پھر خود ہی انجان بن جاتے ہیں۔ شاپنگ کر کے لاتے ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ میری خاطر کی بلکہ دوسروں کے کہنے پر کی مجھے جتاتے ہیں، چوٹ لگنے سے بچاتے ہیں اور دل پر چوٹ لگاتے ہیں''۔ بچوں کی طرح بسورتے ہوئے وہ دل میں موجود گلے کرتی چلی گئی تھی۔

''محبت کرتی ہو اُس سے؟!'' باسط صاحب نے براہ راست پوچھا تھا مسکراتے ہوئے اور مزید گویا ہوئے تھے۔

''دیکھو تمہارے اور میرے درمیان ہی طے پایا تھا کہ ہم دونوں نا صرف باپ بیٹی کا رشتہ قائم کریں گے بلکہ دوستی بھی ہوگی۔ ہمارے درمیان دوستی سے ہر بات کی جا سکتی ہے محبت کرتی ہو اس سے جبھی اس کی ہلکی سی بے اعتنائی بھی برداشت نہیں ہو رہی تم سے''۔ باسط صاحب کی بات پر بس وہ حیران سی انہیں دیکھے گئی تھی۔ آگہی اور ادراک کا در یکدم کھلا تھا۔ اور باہر کھڑا ارشام مکمل طور پر اس کے جواب سننے کا منتظر تھا جبھی زبیر پیچھے سے آن کر اچانک بولا تھا۔

''ارشام تم یہاں؟!'' یوں باہر کھڑے دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی تھی۔

''ہاں وہ پپا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے اس لئے آیا تھا''۔ دروازہ کھولتے ہوئے وہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے دل جیسے اُس کے جواب کا منتظر پھڑ پھڑا کر رہ گیا تھا۔

''اتنی بے چینی کیوں اس کا جواب سننے کے لئے ہوتی ہے تو ہوتی رہے، مجھے تو نہیں اور نہ ہوگی۔'' دل کو سرزنش کی تھی ارشام نے۔

کچھ دیر بعد زبیر اور ارشام کی مدد سے باسط صاحب دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلے آئے تھے اور صوفے پر آن بیٹھے تھے خادم حسین وہیل چیئر لیے نیچے آ گیا تھا۔

''تم آج جلدی آ گئے زبیر''۔ باسط صاحب نے پوچھا تھا۔ ارشام ان کے نسخوں کی فائل لینے اوپر گیا تھا۔

''جی تایا جان سر میں کچھ درد تھا اس لئے پاپا ابھی وہیں ہیں انہوں نے ہی زبردستی گھر بھجوا دیا''۔ زبیر نے جواب دیا رخشندہ بھی اُدھر ہی چلی آئی تھیں۔

''بھائی صاحب ہسپتال جا رہے ہیں؟'' ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے ہی کے لئے وہ نیچے آئے تھے۔ ارشام ان کا ہر مہینے مہنگے ترین ہسپتال میں موجود مہنگے ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتا تھا اور یہ ڈاکٹر اب باسط صاحب کے دوست بن چکے تھے۔ ایکسیڈنٹ کے بعد وہ انہی کے زیر علاج رہے تھے افراح کو بھی ارشام نے انہی کو چیک کروایا تھا۔

''ہوں؟'' مختصر جواب دیا تھا رخشندہ نے زبیر کی بات سن لی تھی۔

''تم جاؤ آرام کرو کمرے میں افراح سے کہہ کر گرما گرم چائے بنوا کر بھجواتی ہوں''۔ ارشام کو نیچے آتے دیکھ کر رخشندہ چچی نے زبیر سے کہا تھا۔ ارشام کچھ ناگوار سا تاثر لئے باسط صاحب کو ویل چیئر پر بٹھا کر باہر پورچ میں لے آیا تھا افراح بھی پیچھے ہی تھی۔

''خادم چاچا! آپ پلیز زبیر بھائی کو گرما گرم چائے بنا کر ان کے کمرے میں دے آئیں میں ذرا اپنا اور انکل کا کمرہ سیٹ کر لوں''۔ باہر گاڑی کا دروازہ کھولے خادم حسین سے افراح نے کہا تھا اور ارشام کے چہرے کے تاثر بدلے تھے نہ جانے کیوں۔

''جی اچھا بی بی جی!'' خادم حسین نے

مودب سا جواب دیا تھا۔ جب گاڑی گیٹ سے نکل گئی تو وہ بھی پلٹ آئی تھی۔

''افراح ذرا زبیر کو چائے بنا کر اس کے کمرے میں دے آنا'' صوفے پر براجمان ٹی وی ڈرامے پر نظریں جمائے رخشندہ چچی نے جاتی افراح سے کہا تھا۔

''چچی خادم چچا بنا رہے ہیں میں ذرا انکل کے آنے سے پہلے ان کا کمرہ سیٹ کر دوں''۔ جواب سنے بغیر وہ سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

''ہوں تو بہت جلد تمہارے یہ نکلتے پر پرزے نوچنے پڑیں گے مجھے میری سوچ سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئی ہو اس کی طرح نادان نہیں ہو''۔ رخشندہ بی بی نے دل میں سوچتے ہوئے افراح کو مخاطب کیا۔

''اے نالائق یہ تو ہر وقت کمرے میں گھسی بس اس موئے سیل فون میں سر گھسیڑے بیٹھی رہا کرتے وقت کی طرح پھسلتا جا رہا ہے وہ تیرے ہاتھوں سے۔'' نور کے کمرے میں آ کر انہوں نے اس کے لتے لئے تھے جو ماں کی پنجابی فلموں کی ظالم ساس کی طرز کی انٹری پر شانے اچکا کر رہ گئی تھی۔

''موقع اچھا ہے نائلہ کو میں نے اسی لئے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکل جانے دیا ہے۔ ارشام کی موجودگی میں ایسے مواقع بنانے ہیں کہ ارشام کو زبیر اور افراح مشکوک لگنے لگی اور جہاں رشتوں میں شک آ جائے سمجھو وہ رشتے تباہ اور ارشام تو ہی ہے ڈسا ہوا ایک دو باتوں سے ہی اس کے کان کھڑے ہو جائیں گے پھر میں دیکھتی کیسے یہ بنو رانی جسے گھر والے بہو بیٹی مان چکے ہیں۔ ارشام اس گھر میں رہنے دیتا ہے یہ دفع ہوئی تو تیرا راستہ صاف''۔ بیڈ پر نور کے قریب بیٹھتی وہ بولی تھیں اور پھر نور کو کچھ سمجھانے لگ پڑی تھیں جسے سن کر نور کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

✦✦✦

اک نظر اٹھا کے اس نے خود کے ساتھ جڑنے والے شخص کا نام تک نہ دیکھا تھا۔ اور ان دونوں کی یہی بے خبری انہیں کتنے بڑے نقصان سے دوچار کرنے والی تھی۔ وہ لاعلم تھے۔ برے وقت کی آہٹیں ان کے بہت قریب رقص کرنے لگی تھیں۔

''میں اتنا بھی ظالم نہیں ہوں جتنا آپ ثابت کرنے پہ تلی ہیں'' وہ پینٹنگز کے پرائس ٹیگ چیک کر رہی تھی۔ جب وہ اس کے عقب میں کھڑا خفگی سے کہہ رہا تھا۔

''مطلب؟'' وہ نوٹ پیڈ پر کچھ لکھتی الجھن سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''آپ روزے کی حالت میں اتنا کام کریں گی تو سب یہی سمجھیں گے کہ میں بہت ظالم قسم کا باس ہوں۔''

پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نے پرشوق نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ سفید گھٹنوں تک آتی فراک اور سفید ہی اس کا اسکارف حجاب کی طرح اوڑھے بہت معصوم اور معتبر لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی پاکیزگی اسے سب سے نمایاں اور خاص ثابت کرتی تھی۔ بظاہر وہ سب سے فرینکلی ہو کے ملتی تھی مگر نجانے اس میں ایسا تھا کیا کہ سبھی اس سے احترام کے دائرے میں رہ کر پیش آتے تھے۔

''ایسا لوگ سمجھتے ہیں۔ میں نہیں۔ میں وہی کرتی ہوں جو میری ذمہ داری ہے۔ اور بس۔'' وہ بہت عاجزی سے کہہ رہی تھی۔ اس میں اور اس کی باتوں میں ایسا سکون تھا کہ وہ کسی کی بھی مسیحائی پر پورا اتر سکتی تھی۔

حدثان کی کال آ رہی تھی۔ وہ سننے کے لئے سائیڈ پہ چلا گیا تھا۔ منوہ نے اک چور نظر اس پہ ڈالی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے آہستہ قدموں سے فون کان سے لگائے دور جا رہا تھا۔ بعض لوگ اور چیزیں ہمیں چاہے جتنی مرضی پسند آئیں۔ مگر وہ ایسے حالات میں ملی ہوتیں ہیں کہ ہم چاہ کے بھی انہیں اپنی زندگی میں شامل نہیں کر پاتے۔ ان کا دور جانا اور ان سے دور رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

ایگزیبیشن توقعات سے بھی بڑھ کے کامیاب رہی تھی۔ حدثان سے زیادہ منوہ خوش تھی۔ وہ بار بار نم آنکھوں کو پونچھتی اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔ حدثان کی نظریں اس کے گلابی مکھڑے پر بار بار بھٹک رہی تھیں۔ وہ انجان نہیں تھی مگر بن رہی تھی۔ انجان رہنے میں ہی بھلائی تھی۔ مگر وہ بلا کا ہینڈسم بندہ جب اونچے قہقہے لگاتا تو اس کا دل ہتھیلی میں دھڑکنے لگتا۔ خود سے بھی نظریں چراتی وہ کنفیوز ہوتی اور ریزرو ہو جاتی۔ آج کی افطار پارٹی حدثان کی سالگرہ کی خوشی میں تھی۔ یہ منوہ کی زندگی کی پہلی افطاری تھی جو وہ گھر والوں کے بنا باہر افطار کر رہی تھی۔ حدثان بڑے غیر محسوس انداز میں اس کا دھیان رکھ رہا تھا۔ پہلی ملاقات کی بے اختیاری کے بعد وہ بڑا محتاط ہو کے اس سے ملتا تھا۔

بظاہر گفٹ اسے ملنے چاہئے تھے۔ مگر وہ دو اپنے اسٹاف میں تحائف تقسیم کر رہا تھا۔

''میرا گفٹ'' وہ جو سب میں گفٹ بانٹ رہا تھا منوہ کے سامنے دست طلب دراز کئے کھڑا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پہ ہونق بن جاتی تھی اور ننھی بچی لگنے لگتی تھی۔

وہ گفٹ نہیں لائی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا یا پھر اس نے گفٹ دینے کا سوچا ہی نہیں تھا۔

اس نے شرمندہ ہوتے ٹیبل پہ دھرے واز سے سفید گلاب کے پھول کی کلی نکالی اور اس کی طرف بڑھادی۔

''فی الحال میں یہی دے سکتی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا آپ گفٹ مانگ کے لیتے ہیں ورنہ ضرور لے آتی'' وہ پھول دینے کے بعد جتانا نہیں بھولی تھی کہ اس کے مانگنے پہ صرف دے رہی ہے۔ حدثان نے مسکراہٹ ضبط کی۔ اس نے ہر رنگ کے پھولوں سے سجے واز میں سے سفید پھول ہی کیوں دیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں ۔ تمہاری پرانی عادت ہے۔'' پہلی ملاقات کا حوالہ دیتے اس کے پاس سے ہٹ گیا تھا وہ۔

+++

دور تک وادیاں ہیں پھولوں کی
میری آنکھوں میں عکس تیرا ہے
چاند نکلنے لگا ہے پانی سے
ہر طرف سانولا سویرا ہے

شامہ نے دل کھول کے خود پہ اسپرے کیا اور پھر اک نظر آئینے میں خود کو دیکھا۔ جینز پہ سرخ شرٹ پہنے اور نفاست سے کئے گئے میک اپ میں نظر لگ جانے کی حد تک حسین اور دلکش لگ رہی تھی۔

آج حدثان کی برتھ ڈے تھی۔ اس نے ایگزیبیشن میں اسے انوائٹ کیا تھا۔ چونکہ آج جمعۃ المبارک تھا اور اس نے روزہ بھی رکھا تھا اس لئے آنے سے معذرت کرلی تھی۔ مگر وہ ڈنر اس کے ساتھ کرنے پہ اسے راضی کرچکی تھی۔ اس کا ہاتھ پلاسٹر سے تو آزاد ہو چکا تھا مگر درد ابھی باقی تھا۔ خیر وہ اپنی من پسند ہستی کے لئے اتنا درد تو برداشت کر ہی سکتی تھی۔

وہ دونوں اس وقت اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ کھانا سرد ہونے میں ابھی کچھ باقی تھی۔ ڈنر سے پہلے شامہ نے کیک آرڈر تھا۔ جو اس کے بے حد اسرار پہ اس نے کاٹ تھا۔ وہ بچوں کی طرح تالیاں پیٹ رہی تھی، حدثان اس کی خوشی دیکھ کر خود خوش ہو رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' ڈنر کے بعد دونوں سی ویو آگئے تھے۔ خوشگوار ٹھنڈی میٹھی چل رہی تھی۔ اسے گم صم اپنے ساتھ ٹہلتے دیکھ استفسار کئے بنا نہ رہ سکی تھی۔

''آئی ایم میرڈ'' وہ اس کے اچانک کہنے رک سی گئی۔ قدم جیسے زمین نے جکڑ لئے تھے۔

''مذاق سوچ سمجھ کے کرتے ہیں حدثان'' اگلے ہی پل وہ خود کو سنبھال گئی۔ وہ یہ سب مذ سمجھ رہی تھی۔

''مذاق میں نے نہیں بلکہ زندگی میرے ساتھ کیا ہے۔ جسے میں نے چاہا وہ تب ملی جب میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا'' وہ شکستہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ شامہ کو ٹھو لگی۔ حالانکہ راستے میں نہ کوئی رکاوٹ اور پتھر تھا۔ وہ سنبھل گئی تھی ۔ مگر کچھ تھا جو بڑ تیزی سے زمین بوس ہوا تھا۔

''اچھا..... تم نے پہلے نہیں بتایا۔ کو ہے؟..... یقینا بہت خوبصورت ہوگی۔'' چاہتے ہوئے بھی اپنے لہجے کو کانپنے سے روک نہیں پائی تھی۔

''پتہ نہیں۔ صرف اتنا پتہ ہے کہ حشام انکل کی اکلوتی بیٹی ہے۔ نام کیا ہے؟ کیسی ہے؟ کچھ معلوم نہیں؟'' وہ تو نکاح سے بھاگ گئی تھی۔ پھر یہ سب کیا تھا۔

''ایکچولی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں مجھے جانا پڑے گا۔'' وہ اسے آندھیوں کی زد چھوڑ کے خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی گاڑی طرف چلا گیا تھا۔

وہ جن حالوں میں گھر لوٹی تھی۔ صرف وہی جانتی تھی۔ لان کی کرسیوں پہ فاکیہ اور طلعت بانو اسی کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ وہ دونوں اسے آتا دیکھ کر پرسکون ہوگئیں تھیں۔

''میرے چلے جانے کے بعد اس دن گھر میں کیا کوئی نکاح ہوا تھا؟'' وہ فاکیہ کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ فاکیہ سمیت طلعت بانو نے بھی چونک کے اسے دیکھا۔

''ہاں ہوا تھا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''کس کا.....؟'' وہ فاکیہ کا سوال نظر انداز کرگئی تھی۔

''منوہ کا'' جواب طلعت بانو نے دیا۔

''منوہ کا.....'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اک آنسو ٹوٹ کے تیزی سے گال پہ پھسلتا چلا گیا۔ وہ اندر کی طرف بھاگی۔

''کیا ہوا ہے؟ بتاؤ تو سہی؟'' فاکیہ اسے پکارتی رہ گئیں تھیں۔

وہ کمرے کا دروازہ لاک کرکے بیڈ پہ ڈھیر ہوگئی تھی۔ صبح وہ کتنی خوش تھی۔ اور کچھ گھنٹے قبل حدثان کے ساتھ ڈنر کرتے اور سی ویو پہ چہل قدمی کرتے بھی وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اور اب وہ ریزہ ریزہ ہوئی خود کو بکھرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''منوہ اس کے لئے صرف پھپھو کی بیٹی اور ماموں کی بھانجی کے علاوہ کبھی کچھ نہیں رہی تھی۔ اس کی وجہ سے بہنام بیگ کی توجہ بٹی تھی۔ وہ اپنی محبت میں اسے بھی شامل کرچکے تھے۔ وہ ''محبت'' جس پہ صرف اس کا حق تھا۔ اس میں منوہ بھی شامل ہوچکی تھی۔ منوہ سے نفرت کرنے کی اس کے پاس بہت سی وجہیں تھیں۔ اور آج ان وجہوں میں اک اور اضافہ ہوگیا تھا۔ پوری دنیا کو چھوڑ کر اس کا دل جس لڑکے پہ آیا اسے منوہ کا ہوتا دیکھنا اسے ہرگز گوارہ نہ تھا۔ وہ تو اپنی جیسی چیزیں یا کپڑے کسی بھی اسے استعمال نہیں کرنے دیتی تھی۔ پھر حدثان کو اس کے حوالے کیسے کردیتی۔

اب تک جو برا ہوا تھا۔ اس میں صرف اچھا یہ تھا کہ حدثان اسے اپنی منکوحہ سمجھ رہا تھا اور اس بات سے کیسے فائدہ اٹھانا تھا یہ وہ بخوبی جانتی تھی۔

+++

صبح سحری کی ٹیبل پہ جب شامہ بھی آئی تو سب نے خوشگوار حیرت میں گھر کر اسے دیکھا تھا۔ جب سے وہ گھر واپس لوٹی تھی ۔ سبھی نے اس میں تبدیلی نوٹ کی تھی۔ اور آج تو سب کا خوشی سے حال ہی جداگانہ تھا۔ طلعت نے ''ماشاء اللہ'' کہا۔ اور فاکیہ نے آگے بڑھ کے اس کی پیشانی ہی چوم لی۔ شام بیگ مسکرادیئے جبکہ منوہ نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔

وہ کتنی دیر سے شامہ کی چبھتی نظریں خود پہ گڑھی محسوس کررہی تھی۔ وہ پہلے تو نظرانداز کرتی رہی لیکن بعد ازاں اسے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ وہ جلدی سے سحری کرکے وضو کرنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی روٹین تھی کہ وہ فجر ہمیشہ لان میں کھلے آسمان تلے ملگجے اندھیرے میں ادا کرتی تھی۔ اسے اندھیرے میں ڈوبا ٹمٹماتے تاروں سے بھرا آسمان بہت اچھا لگتا۔ پھر جیسے ہی سپیدہ سحر کی لکیر نمودار ہوتی اور ایک ایک کرکے تارے غائب ہونا شروع ہوتے وہ اُٹھ کے تھوڑی دیر چہل قدمی کرتی اور پھر اپنے کمرے میں آکے قرآن پاک کی تلاوت

(باقی اگلے ماہ)

+++

بشریٰ سیال

چند ثانیے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر اچانک عائشہ گل رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس لمحے اس پر ادراک ہوا تھا کہ محمد امیر اس کے دل اور زندگی میں کیا اہمیت وحیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اسے اس طرح کھڑے ہوئے ایک منٹ ہی گزرا ہوگا جب ٹیرس کا دروازہ کھلا تھا۔

"آپ؟" وہ محمد امیر کو سامنے دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوگئی تھی۔

"پتا نہیں کیوں، مجھے یہ خوش فہمی ہورہی تھی کہ تم میرے جانے سے اُداس ہو۔" وہ اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ شام نے اپنے پَر پوری طرح وادی پر پھیلا دیے تھے۔

"اگر تم کہو، تو میں نہیں جاتا۔" ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ محمد امیر کو جتنی نظروں سے عائشہ گل کے اداس چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"جب جانا ہی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے آج جائیں یا کل اور ویسے بھی آپ کی

ناولٹ

پانچویں قسط

فلائٹ کا ٹائم ہورہا ہے۔ جائیں، لیٹ ہورہے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے بشاشت سے کہا تو محمد امیر کو مایوسی ہوئی۔

"اگر تم کہو، تو میں واقعی رُک جاؤں گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوگیا ہے آپ کو محمد امیر"۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ کہ اسے روک لے، وہ ابھی جانتی نہ تھی کہ وہ شخص کیا تھا۔ مگر اسے اپنے جذبات چھپانے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ ہنس دی تھی۔

"دو دن بعد میرا پیپر ہے اور آپ بھی تو کہہ رہے تھے کہ کوئی ضروری کام ہے۔" محمد امیر چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا تمہارا دل بھی یہی کہہ رہا ہے؟" وہ بولا۔

''کیا مطلب؟'' عائشہ گل ٹھٹکی۔

''کچھ نہیں''۔ وہ جانے کے لئے مڑا۔ عائشہ گل کا جی چاہا اسے روک لے۔

''عائشہ گل!'' وہ جاتے جاتے مڑا۔

''محبت کو اگر وقت پر قبول نہ کیا جائے نہ، تو یہ آپ کو بہت رولاتی ہے۔ در بدر بھٹکاتی ہے اور میری دعا ہے عائشہ گل! محبت تمہیں کبھی نہ رولائے''۔ وہ چلا گیا تھا۔

عائشہ گل گنگ کھڑی تھی۔ وہ اس کے رویے پر حیران اور کچھ پریشان تھی۔ نکاح کو ابھی وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ اور وہ ابھی سے اس سے لمبی چوڑی امیدیں لگا رہا تھا۔ مگر جو بھی تھا۔ اس کا روٹھنا عائشہ گل کو پریشان کر گیا تھا۔ ہر بار کی طرح۔

✦✦✦

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مگر علیزے گرد و پیش سے مکمل بے گانہ بیٹھی تھی۔ یکا یک وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے سیل فون پر کال آنے لگی تھی۔ اس نے دیکھا، ماما اسے کال کر رہی تھیں اس نے دو منٹ سوچا اور پھر کال ریسیو کی۔

''ماما!'' اس نے چہرے کو رگڑ کر صاف کیا۔ مگر آنسو اور زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے۔

''آپ مجھے محمد امیر سے محبت کرنے سے نہیں روک سکتیں۔'' وہ با آواز بلند زور سے چیخی تھی۔ ماما کی کئی کالز آئی تھیں اور اس نے ایک بھی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے حواس کھونے لگی تھی۔

''مجھے محمد امیر سے بات کرنی ہے۔ اس سے ملنا ہے۔ ورنہ میں مر جاؤں گی''۔ اس نے محمد امیر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ مگر کال نہیں جا رہی تھی۔

''پلیز! محمد امیر ایک دفعہ میری کال ریسیو کرلیں۔'' اس نے روتے ہوئے اسے وائس ایپ پر میسج کیا تھا۔ اور اب موبائل فون آنکھوں کے سامنے کئے میسج کے Read ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر اس کا انتظار لاحاصل تھا۔

''علیزے!'' اس نے اپنے بے حد قریب ماما کی آواز سنی تھی۔

''میری جان۔'' وہ اسے اس طرح سڑک کنارے، اجڑے بکھرے حلیے میں تنہا بیٹھے دیکھ کر مرنے لگی تھیں۔

''ماما! وہ میری کال ریسیو نہیں کرتا۔ اس نے میرا میسج بھی read نہیں کیا۔ میری خواہش کوئی اتنی بڑی تو نہیں ہے۔ صرف بات ہی تو کرنا چاہتی ہوں۔ کیا چلا جائے گا اس کا اگر وہ ایک بار مجھ سے بات کرے۔'' وہ ایک ٹرانس میں نان اسٹاپ بول رہی تھی۔ ماما اسے دیکھے گئیں۔

''آج تک میں نے زندگی سے کچھ نہیں مانگا۔ کوئی خواہش، کوئی مطالبہ نہیں کیا، پہلی بار کچھ مانگا ہے ماما، میری خواہش کیا اتنی مشکل اور ناممکن ہے ماما کہ وہ مجھ سے ایک بار بات بھی نہیں کر سکتا۔ اسے مجھ سے ایک بار بات کرنی ہوگی ورنہ میں مر جاؤں گی۔ مر جاؤں گی میں ماما! پلیز......''

''علیزے!'' ماما نے اسے شانوں سے پکڑ کر زور سے ہلایا۔

''ہوش میں آؤ''۔ وہ چلائیں۔

''ماما مجھے محمد امیر سے بات کرنی ہے۔ پلیز! پلیز۔ do something۔ ماما آپ اس سے بات کریں، اسے بتائیں کہ آپ کی بیٹی مر رہی ہے۔'' وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ ماما نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ زور، زور سے رونے لگی تھی۔ ماما کو پہلی مرتبہ محمد امیر پر غصہ آیا تھا اس کی وجہ سے ان کی بیٹی اتنی مایوسی کے اندھیروں میں بھٹکنے لگی تھی۔ زندگی سے بیزار اور

ہر چیز سے اُچاٹ رہنے لگی تھی۔ ایسی تو کبھی نہ تھی ان کی علیزے، بلاشبہ وہ شروع سے ہی ایک سنجیدہ مزاج کی مالک تھی، مگر اس طرح زندگی سے بھاگنے والی تو نہ تھی۔ محمد امیر نے ان کی کل کائنات داؤ پر لگا دی تھی۔

✦✦✦

راحیل اور اس کے پیرنٹس کے جانے کے بعد ازابیل اویس کے روم میں آئی تھی۔ اسے سوتا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

''یہ اس وقت کیسے سو گیا؟'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

''کافی بھی نہیں پی۔'' اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑے کافی کے مگ پر گئی تھی۔

''کافی ٹھنڈی ہو گئی''۔ وہ مگ اٹھا کر باہر کی جانب بڑھی۔

''اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نہ''۔ وہ ایک مرتبہ پھر مڑی۔ اس کے قریب آئی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ نیند میں بھی اس کا چہرہ کچھ روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔

ازابیل باہر نکل گئی۔ اویس نے دروازہ بند ہونے کی آواز پر آنکھیں کھولیں اور بند دروازے کو گھورا۔

''نہیں کھاؤں پیوں گا کچھ، اور نہ یہ میڈیسن'' وہ ازابیل سے سخت ناراض ہو چکا تھا۔ اسے وہ خود سے دور جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہی تو تھی اس اس کی دوست، غمگسار و ہمدرد، اس کی اپنی۔ اس بھری دنیا میں اس کے علاوہ تو اس کا اپنا اور کوئی نہ تھا۔ وہ بھی اس سے دور جانے لگی تھی۔

ایسے میں اویس بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

''ازابیل واقعی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی؟'' وہ خود کلامی انداز میں ہولے سے بڑبڑایا۔ اس کے جانے کے خیال سے ہی اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس کی پریشانی میں یکلخت اضافہ ہو گیا۔ اپنا وجود ایک مرتبہ پھر اس کے لئے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

''میں کون ہوں؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ مگر جواب دینے سے اس کا دل اور دماغ قاصر تھے۔ بہت سوچنے اور دماغ پر زور دینے سے بھی کچھ یاد نہ آ رہا تھا۔

''یہاں آنے سے پہلے میں کہاں تھا؟'' اور اس سوال کے آگے بہت بڑے بڑے سوالیہ نشان گھوم رہے تھے۔ جن کے آس پاس اس کا دماغ بری طرح چکراتا پھر رہا تھا مگر، مایوسی اور بیگانے پن کے ان اندھیروں میں اس کا کوئی جگنو نہ تھا، اور اگر تھا تو اس سے ہاتھ چھڑا کر دور جا رہا تھا۔

✦✦✦

محمد امیر کے جانے سے پوری وادی پر اُداسی کی دبیز تہہ چھا گئی تھی۔ ہر منظر اداس، ویران اور بے رونق لگنے لگا تھا۔ ہوا ہولے ہولے عائشہ گل کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی نا جانے اسے کیا کہنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ بے دلی سے بیڈ پر بیٹھی تو سائیڈ ٹیبل پر موبائل فون پڑا نظر آیا۔ اسے گھما پھرا کر دیکھا۔ اسمارٹ فون تھا۔ مگر اسے یاد تھا کہ یہ فون محمد امیر کا تو نہیں ہے۔

اس نے سیل فون کو آن کیا تو وال پیپر پر اس کی اور محمد امیر کی وہ تصویر لگی تھی۔ جو رات اس نے عائشہ گل کو انگوٹھی پہنانے کے بعد اس کے ساتھ بنائی تھی۔ کچھ حیران ہوتے ہوئے اس نے فون کو مزید چیک کیا۔

وائس ایپ پر کچھ وائس نوٹ موجود تھے۔ اس نے آن کیا۔

"میری طرف سے ہمارے نکاح کا تحفہ یہ فون، تمہارے لیے۔ تو سرپرائز گفٹ کیسا لگا؟" محمد امیر کی بے حد دلکش، زندگی سے بھرپور اپنائیت لئے ہوئے خوبصورت آواز اس کی سماعتوں کو معطر کر رہی تھی۔

"اور دیکھو وال پیپر پر ہماری منگنی کی جو تصویر ہے نہ، اس کو مت ہٹانا عائشہ گل!" اس کی اس انوکھی خواہش اور فرمائش پر وہ ہولے سے مسکرادی تھی۔

"اور اب تم مسکرا رہی ہو نہ!" اگلا وائس نوٹ سننے کے بعد اس کی ہنسی اچانک تھم گئی تھی۔

"اتنے کم وقت میں، کتنا جان گئے ہیں مجھے"۔ اس نے اگلا نوٹ اوپن کیا۔

"اور گیلری میں، میں نے اپنی کچھ تصاویر ڈالی ہیں۔ تمہارے لیے۔ میری یاد آئے تو دیکھ لینا۔" وہ اس کی شرارت پر ایک مرتبہ پھر ہنس دی تھی۔ اور گیلری اوپن کر کے اس کی تصاویر دیکھنے لگی تھی۔

عائشہ گل نے اتنا مکمل مرد کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی مخمور شہد رنگ آنکھیں، کچھ کہتی محسوس ہوتی تھیں۔ خوبصورت ستواں ناک، ایک غرور اور شان سے اس کے چہرے پر کھڑی تھی، کشادہ پیشانی، سلیقے سے جمے ہوئے بال، سرخ و سفید رنگت، بھرے بھرے لب اور لبوں کے کنارے پر مسکراہٹ۔

"بس کرو، نظر لگاؤ گی کیا۔" عائشہ گل نے گھبرا کر آس پاس دیکھا اور پھر خود ہی ہنس دی۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ تم مجھے دیکھتی رہو۔ مجھ سے نگاہیں نہ ہٹاؤ۔" اس نے محمد امیر کی تصویر پر محبت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ اپنی اس حرکت پر وہ از حد حیران تھی۔ محمد امیر سے ابھی صرف نکاح کا رشتہ جڑا تھا۔ دل کا تو کوئی تعلق استوار نہ ہوا تھا۔ مگر اسے وہ یاد آ رہا تھا۔ موبائل فون وہیں رکھ کر وہ نیچے آ گئی تھی۔ امی کچن میں تھیں۔ وہ ان کے پاس آ گئی۔ اور خاموشی سے وہاں کھڑی ہو گئی۔

"چائے بنا رہی ہوں، پیو گی؟" انہوں نے ایک نظر عائشہ گل کے ملول و اداس چہرے کو بغور دیکھا۔

"جی!" اس نے مختصر جواب دیا اور پلٹ کر کچن سے نکل گئی اور لاؤنج میں آ گئی اور آتشدان میں لکڑیاں ڈالنے لگی۔ رات ہونے والی بارش کی وجہ سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عائشہ گل کی طبیعت پر ایک عجیب سی سستی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گئی، اور محمد امیر کے متعلق سوچتے ہوئے چائے کا انتظار کرنے لگی۔

+++

محمد امیر گھر پہنچا تو ڈیڈی موجود نہ تھے۔ ڈرائیور اسے ایئر پورٹ سے پک کرنے آیا تھا۔ ماما اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ فریش ہو کر آیا تو ڈیڈی آفس سے آ چکے تھے۔

"اسلام علیکم ڈیڈی!" محمد امیر نے خوشدلی سے سلام کیا تھا۔ جبکہ دردانہ نے شوہر کے از حد سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

"محمد امیر نے آپ کو سلام کیا ہے۔" جب انہوں نے جواب نہ دیا تو دُردانہ کہے بنا نہ رہ سکیں۔

"سن لیا ہے میں نے۔" وہ گہری سنجیدگی لہجے میں سموتے ہوئے بولے۔ انداز کاٹ دار تھا۔

"آپ ابھی تک خفا ہیں مجھ سے ڈیڈی؟" وہ صوفے پر جا بیٹھے تھے۔ محمد امیر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"تمہیں فرق پڑتا ہے؟" انہوں نے طنز کا نشتر چھوڑتے ہوئے اسے تیکھی نظروں سے گھورا۔

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں ڈیڈی۔" وہ مدطلب نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اتنے دنوں بعد بیٹا گھر آیا ہے، اب جانے بھی دیں نہ۔" دردانہ نے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی، مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ حسین نے غصے سے بیوی کو گھورا۔

"تمہیں لگتا ہے یہ اتنا آسان......"

"ہیلو ایوری باڈی......" روما بولتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی اور حسین کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ محمد امیر نے ماں کی طرف دیکھا۔ گویا ایک نیا امتحان شروع۔

"ہائے امیر! کیسے ہو؟ کیسے خیال آیا واپس آنے کا؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ اور ذرا یہ بتاؤ نہ کہ میری کال کیوں پک نہیں کر رہے تم۔" اس کے شانے پر مکا مارتے ہوئے روما نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ محمد امیر کا اس وقت اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ آل ریڈی ڈیڈی کی وجہ سے اَپ سیٹ تھا۔

"بیٹھو نہ روما، محمد امیر بھی بس ابھی آیا ہے۔ آرام سے سب باتیں کر لینا۔" دُردانہ اٹھتے ہوئے بولیں تو حسین نے بغور محمد امیر کے اُکتاتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ جہاں روما کے لئے بیزاریت تھی۔

"میں چائے بھجواتی ہوں"۔ دردانہ لاؤنج سے نکل گئیں۔ روما، محمد امیر کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اب کیسی ہیں تمہاری خالہ؟" روما کے سوال پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہوں...... بہتر ہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"یار سوشل میڈیا پر تمہاری ایک پکچر وائرل ہے۔ جس میں تمہارے ساتھ ایک لڑکی ہے جس نے عبایا پہن رکھا ہے۔"

"واٹ!" روما کی بات سن کر وہ کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا تھا۔

"تم سے کس نے کہا؟" اس نے چونک کر ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ جو متاسف نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کہنے کی نہیں، دیکھنے کی چیز ہے۔" روما نے موبائل فون میں سے اس کی اور عائشہ گل کی تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ محمد امیر کا حال تو ایسا تھا کہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دوسری طرف روما منتظر نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی کہ وہ اس تصویر کی تردید کرے یا پھر اس کی حقیقت اسے بتائے۔ کیونکہ وہ مزید صبر اور انتظار نہ کر سکتی تھی۔

+++

ٹھنڈی، بے حس اور خود غرض سی شام نیو یارک سٹی میں اتری اور وہاں کے لوگوں کی بے حسی اور نفسا نفسی کو دیکھ کر جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئی، اور رات کو وہاں کا پتا دے گئی۔ اِزابیل بہت عرصے بعد راحیل کے ساتھ ڈنر پر آئی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی ہاف بلاؤز والی بہت خوبصورت ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اور وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ راحیل کا ہاتھ تھامے وہ ہوٹل میں داخل ہوئی تو لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"تم بہت حسین لگ رہی ہو۔" اِزابیل اس کے سامنے بیٹھی تو راحیل نے اس کا ہاتھ تھام کر لگاوٹ سے کہا۔

"شکریہ!" وہ اک ادا سے مسکرائی۔

"کیا کھاؤ گی؟" مینیو کارڈ کو پلٹ کر دیکھتے ہوئے وہ اس سے دریافت کر رہا تھا۔

"جو تم کھلا دو"۔ ازابیل کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ اور اسے خوش دیکھ کر راحیل بہت مطمئن تھا۔ ورنہ جب سے اویس اس کے گھر آیا تھا، راحیل اور ازابیل کے درمیان ناراضی ہی چل رہی تھی۔

راحیل نے کھانا آرڈر کر دیا تھا۔ ازابیل بہت رغبت سے کھانا کھا رہی تھی۔ اسے اپنے ساتھ، اور خوش دیکھ کر راحیل بہت مسرور تھا۔

"تم نے اویس کا کیا سوچا ہے ازابیل!" راحیل نے اچانک سوال کیا تھا۔ منہ کی طرف نوالہ لے جاتا ازابیل کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔

"کیا مطلب؟" اس نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"یعنی تمہاری شادی ہو جائیگی تو اس کے بعد بھی کیا ہاشم انکل اسے گھر پہ رکھ لیں گے؟" اس نے وضاحت کی۔

"دیکھو راحیل وہ میری ذمہ داری ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو"۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہوئی تھی۔

"لیکن یہ ذمہ داری تم کب تک نبھاؤ گی؟" وہ الجھا۔

"جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا"۔ اس نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے کہہ دیا۔

"اور اگر وہ ٹھیک نہ ہوا؟" راحیل نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھو راحیل یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" ازابیل نے اسے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

"اویس میری ذمہ داری ہے، اور اسے کیسے نبھانا ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ تم فکر مت کرو۔"

اس نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا تو راحیل اسے بغور دیکھنے لگا۔

"ازابیل بہتر ہوتا ہے کہ چیزیں پہلے ہی کلیئر کر لی جائیں تاکہ بعد میں مسئلہ نہ ہو۔" راحیل تسلی چاہتا تھا، اور ازابیل اسے متواتر ٹال رہی تھی۔

"ہم یہاں اویس کو ڈسکس کرنے تو نہیں آئے راحیل"۔ اس نے یاد دلایا تھا اور پھر راحیل نے بھی فی الحال مزید بات کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

اس رات ازابیل اور راحیل کے بہت عرصے بعد لانگ ڈرائیو اور ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ دونوں نے خوب انجوائے کیا تھا ازابیل جو کہ اویس کی وجہ سے ہر وقت پریشان رہتی تھی کچھ وقت کے لئے تمام پریشانی اور ٹینشن بھول گئی تھی۔ راحیل کو بھی امید کی کرن نظر آنے لگی تھی کہ وہ اویس سے جان چھڑا لے گا۔

+++

ماما علیزے کو گھر سے آئی تھیں۔ اس کے پورے وجود پر گہری چپ اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ماما نے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ کھانا بنا رہی تھیں۔ علیزے لاؤنج میں صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر بازو رکھے وہ مسلسل محمد امیر کو سوچے جا رہی تھی۔ یکایک وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن میں آ گئی۔

"ماما!" اس نے انہیں پکارا، آواز سے شرمندگی جھلک رہی تھی۔

"ہوں!" اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"آپ خفا ہیں مجھ سے؟" وہ ان کے قریب آئی اور بازو ان کے گلے میں حمائل کئے۔

"نہیں"...... مختصر جواب۔

"آئی ایم سوری ماما۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ ان کا دل کھنچنے لگا۔

"میں جانتی ہوں، بار بار آپ کو ہرٹ کرتی ہوں۔ بٹ آئی سوئیر میں ایسا نہیں چاہتی۔" اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور ماما کے ضبط کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ وہ اسے روتے نہ دیکھ سکتی تھیں۔

"جب سب جانتی ہو تو کیوں خود کو تکلیف دے کر مجھے پریشانی کرتی ہوں؟" انہوں نے اس کا خوبصورت چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو علیزے شرمندہ ہونے لگی۔ وہ جانتی تھی، ماما اس سے کتنی محبت کرتی ہیں۔

"آئی پرامس...... اس نے ماما کا گال چوما۔ تو ان کا دل بھی کھنچنے لگا۔

"میں دوبارہ ہرٹ نہیں کروں گی، نہ خود کو، نہ آپ کو"۔ اس نے ماما کو یقین دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

"علیزے یہ سٹارز آسمان ہو۔ چمکتے ستاروں کی مانند ہی ہوتے ہیں جنہیں ہم دور سے دیکھ کر خوش تو ہو سکتے ہیں مگر ان کو چھو نہیں سکتے۔ کبھی بھی"۔ ماما نے ایک مرتبہ پھر اسے سمجھانا چاہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما!" علیزے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بس مجھ سے غلطی ہو گئی کہ ستارے کو چھونے کی تمناء کر بیٹھی"۔ اس نے غلطی کا اعتراف کیا۔

"بس اب مزید یہ غلطی نہ کرنا"۔ ماما نے اسے پیار سے سمجھایا تو اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اسے ماما کو ہر حال میں یقین دلانا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

+++

کالی سیاہ رات کسی بدنما چڑیل کی مانند دھرتی پر بال بکھرائے گھوم رہی تھی۔ گہری اداسی عائشہ گل کے ٹیرس پر کھڑی کرے کی کھڑکی سے عائشہ گل کے طول وادا اس چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ پوری وادی پر خاموشی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔

"نا جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے تم میرے جانے سے اداس ہو۔" گمبھیر لہجہ اس کے آس پاس روشنیاں بکھیرنے لگا۔ عائشہ گل کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہونے لگا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر خود کو کتاب کی جانب متوجہ کیا۔ امتحانات سر پر تھے۔

دفعتاً اس کی نگاہ ٹیرس کی جانب اٹھی۔

"محمد امیر!" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ وہ تیزی کی سی تیزی سے اٹھی اور ٹیرس پر آئی۔

"محمد امیر!" اس نے ایک مرتبہ پھر اسے پکارا تھا۔ کیونکہ اس نے اسے ٹیرس پر کھڑے دیکھا تھا۔ مگر وہ تو کہیں پر بھی نہ تھا۔ عائشہ گل شاکڈ رہ گئی۔ کیونکہ اس نے خود اسے دیکھا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور ٹیرس کی ریلنگ کو تھام کر نیچے دیکھا۔

رات کا فسوں پوری وادی پر پھیلا ہوا تھا۔ اندھیرا پہاڑوں کے سینے سے کسی آسیب کی مانند لپٹا ہوا تھا۔

عائشہ گل پتھر کی کسی مورتی کی مانند کھڑی نیچے دور تک پھیلی اس دلکش وادی کو دیکھ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اپنی زندگی پر غور کر رہی تھی۔ اس کے والد اس کی پیدائش کے بعد انتقال کر گئے تھے۔ اس نے اور امی نے سادہ اور محنت سے بھرپور زندگی گزاری تھی۔ یہ پہاڑوں میں گھری وادی، وادی میں بلندیوں پر بنا یہ چھوٹا سا

بٹ نما گھر اس کی کل کائنات تھا۔ اس کے تمام رشتے امی سے جڑے تھے۔ وہی اس کا سب کچھ تھیں۔ اگر ان کے علاوہ کوئی رشتہ تھا تو وہ مراد جیسا جس سے وہ شدید نفرت کرتی تھی۔

یوں محمد امیر وہ پہلا مرد، وہ پہلا شخص تھا جو اس کی زندگی میں آیا تھا۔ آیا نہیں بلکہ زبردستی گھسا تھا۔ وہ اسے پہلی ملاقات میں اچھا نہ لگا تھا۔ مگر اس سے نکاح اور کچھ دن اس کے ساتھ رہنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی صاف ستھری اور اچھی طبیعت اور نیچر کا مالک ہے۔

وہ بے خیالی میں ہی اسے سوچے جا رہی تھی اور محمد امیر کو سوچنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ یکایک وہ اٹھی، اور کمرے میں آ گئی۔ محمد امیر کا دیا ہوا موبائل فون اٹھایا اور بیٹی اور اس کی وہ تصویر نکال کر دیکھنے لگی جس میں وہ دونوں ساتھ تھے۔

''اگر میں نکاح سے پہلے سنگنی کرتا تو کیا آپ مجھے رنگ پہنانے دیتیں، اور میں وہ ریشمی آپ کو ماں کے ہاتھ سے انگوٹھی پہنتے دکھاتا'' اس کی اس بات کو یاد کر کے اس کے لب مسکرا دیئے تھے۔ وہ ایک کے بعد دوسری تصویر دیکھنے لگی۔

+++

لاؤنج میں اس وقت گھمبیر اور معنی خیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جبکہ محمد امیر کے لبوں پر جامد چپ کا قفل لگا ہوا تھا۔ جبکہ روما منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ محمد امیر کی معنی خیز خاموشی اسے کسی طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہو رہی تھی۔

''ایسا حلیہ، اور اتنی فرینک فیملی'' روما نے جیسے اپنے ہی کسی خیال سے گھبرا کر اپنی سوچوں کی تردید، اور تردید کرنے کے لئے امید افزاء نظروں سے محمد امیر کی جانب دیکھا۔

''یہ میری فیملی نہیں ہے۔'' محمد امیر نے روما سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

ڈیڈی نے متاسف نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ میری کزن ہے''۔ محمد امیر مزید گویا ہوا۔ روما چونکی۔

''اچھا!'' روما کا انداز معنی خیز تھا۔

''وہی خالہ کی بیٹی، جس کے گھر تم گئے تھے؟'' اس نے استفہامیہ نظروں سے محمد امیر کو دیکھا۔

''ہاں!'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''وہی کزن جس کا تم مذاق اڑا رہے تھے، کہ ہر وقت چہرہ ڈھانپ کر رکھتی ہے؟'' ناجانے کیوں روما دانستہ اسے یہ بات یاد دلا رہی تھی۔ اس کی بات پر محمد امیر نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے عائشہ گل کا تذکرہ اس انداز میں بالکل بھی اچھا نہ لگا تھا۔ اسی لئے وہ چپ نہ رہ سکا۔

''She is very nice!'' وہ کہے بنا نہ رہ سکا۔

''واوا!'' روما کو شدید جلن کا احساس ہوا۔

''کل تک تو وہ تمہیں بیک ورڈ اور نا جانے کیا کیا لگ رہی تھی''۔ روما نے جلتے ہوئے کہا۔

''میں غلط سمجھا تھا اسے''۔ محمد امیر نے اپنی گزشتہ بات کی نفی کی۔

''بلکہ یوں کہو کہ میں اسے سمجھا ہی نہ تھا۔ چائے آ چکی تھی۔ اور سرد بھی ہو گئی تھی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی چائے کی جانب متوجہ نہ تھا۔

''اچھا تو کیا اب سمجھ گئے ہو؟'' روما کو ناجانے کیوں کسی انہونی کا احساس ہونے لگا۔

''ہاں!'' محمد امیر نے برملا کہا۔

''اور اسی لئے....''

''اسی لئے....؟'' روما نے بات اس کے منہ سے اچک لی۔

''میں نے عائشہ گل سے نکاح کر لیا ہے اور اس کے ایگزامز کے بعد ہماری شادی ہے۔'' اس نے گویا بم بلاسٹ کیا تھا۔ روما شاکڈ تھی۔ اس نے بے یقین سے محمد امیر کو دیکھا۔ جو سکون سے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا چکا تھا۔ روما نے شاکی نظروں سے حسین فراز کو دیکھا۔ جواباً وہ نگاہیں چرانے لگے۔

+++

رات خاصی ہو چکی تھی۔ جب اِزابیل ڈنر کے بعد گھر واپس لوٹی تھی۔ اس نے کافی عرصے کے بعد راحیل کے ساتھ اچھا وقت گزارا تھا۔ دونوں نے خوب باتیں کی تھیں۔ مستقبل کے سہانے سپنے بنے تھے۔ شادی سے متعلق پلانز کی تھیں کون سا فنکشن کس طرح یادگار بنانا ہے۔ کیسے ڈریسز بنانے ہیں۔ ہر چیز دونوں نے دل سے ڈسکس کی تھی۔

وہ سرد دری اپنے روم کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اچانک اسے اویس کا خیال آیا۔ اپنے روم کی جانب بڑھتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ پلٹی اور دستک دے کر اویس کے روم میں داخل ہو گئی۔

''اویس!'' یہ دیکھ کر وہ از حد شرمندہ ہوئی کہ اویس ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس کا کھانا سائیڈ ٹیبل پر پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اور یقیناً اس نے میڈیسن بھی نہیں کھائی تھی۔ اِزابیل کو شدید مجرمانہ احساس نے گھیر لیا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اس کے قریب آئی۔ وہ خاموشی سے آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا ہوا تھا۔

''اویس!'' ازابیل نے بازو اس کی آنکھوں سے ہٹایا۔

''آر یو اوکے؟'' اس کی آنکھوں میں گہرے دکھ کے سائے ہلکورے لے رہے تھے۔ ازابیل کو پشیمانیوں نے آن گھیرا۔ اس کا احساس جرم ایک مرتبہ پھر سر اٹھانے لگا۔

''تم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟'' وہ کسی چھوٹے معصوم بچے کی مانند خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اِزابیل کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ وہ آگے بڑھی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''میں تمہیں کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔'' اس نے اویس کے سرخ و سفید ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں میں موجزن درد ازابیل کی بات سے کچھ کم ہوا۔ چہرے پر چھائی مردنی چھٹنے لگی۔ اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے ازابیل کو دیکھا۔

''لیکن تمہاری تو شادی ہونے والی ہے نہ؟'' وہ یقین دہانی چاہتا تھا اِزابیل مسکرا دی۔

''ہاں!'' اس نے سکون سے جواب دیا۔

''تو پھر تم کیسے مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گی؟'' وہ اُلجھا۔

''میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔'' وہ سکون سے بولی تھی۔ چند ثانیے اویس بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی بات کا یقین نہ کر پا رہا ہو۔ مگر ازابیل کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر وہ یقین کیے بنا نہ رہ سکا۔

''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' وہ خوش ہوا۔ ازابیل کو طمانیت کا احساس ہوا۔

''میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی؟'' وہ مسکرائی۔

''تم بے فکر رہو۔ میں ہمیشہ تمہارا خیال رکھوں گی۔ اور دروازے کے باہر کھڑے ہاشم کا جی چاہا وہ اویس کو اٹھا کر ابھی اسی وقت باہر پھینک دیں۔'' کہاں وہ ان لوگوں کی اتنی پُرسکون اور اچھی زندگی میں کسی مصیبت کی طرح

اُترا تھا۔ اس سے جان چھڑانا انہیں بے حد مشکل نظر آ رہا تھا۔

+++

وہ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسری سیڑھی پھلانگ کر پار کرتا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت سیڑھیاں تھیں۔ چمکدار اور روشن۔ ان تک کی زندگی میں اس نے ایسی روشن، چمکدار اور خوبصورت سیڑھیاں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ بے حد عجیب و غریب، جیسے کوئی جادوئی سیڑھیاں تھیں۔ ان پر چڑھتے ہوئے اسے نہ تو کسی تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ نہ ہی وہ کوئی مشکل محسوس کر رہا تھا۔ بلکہ وہ مسرور و شادماں سا بھاگ کر سیڑھیاں چڑھتا اوپر سے اوپر جا رہا تھا۔ ہر نئی سیڑھی پچھلی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ عجیب سا منظر تھا۔ انوکھا سماں تھا۔ ایک منظر اس کی بصارت کو بھی معطر کر رہا تھا۔ ہر سو بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مشک و عنبر کی خوشبو، عطر و زعفران کی خوشبو۔ وہ بے خودی کے عالم میں اوپر جا رہا تھا۔ ایک سرمستی کی کیفیت تھی جو اسے اپنی لپٹ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ اِردگرد سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

+++

رات گہری اور سیاہ تھی۔ نیند ملائشیا کی آنکھوں میں اُتری ہوئی تھی۔ ماما کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ وہ دوا لے کر سو رہی تھیں۔ علیزے نے ماما کا دل رکھنے کے لیے، اور ان سے کیا گیا وعدہ پورا کرنے کے لئے کھانا کھایا تھا نہ صرف یہ کہ کھانا کھایا تھا، بلکہ بظاہر رغبت سے کھانا کھایا تھا۔ ماما بھی اسے دیکھ کر کافی حد تک مطمئن ہو گئی تھیں۔

مگر جیسے ہی ماما سوئیں، اور ملائشیا نے آنکھیں بند کیں تو علیزے کا دکھ پھر سے جاگ اٹھا۔ اس کی یکطرفہ محبت کی آگ بھڑک کر اس کے بے چین وجود کو جلانے اور جھلسانے لگی۔ وہ اپنے بیڈ سے بے چینی کے عالم میں اُٹھی اور روم میں موجود کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ باہر رات پورے ماحول پر چھائی ہوئی، اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھیں۔ تابناک روشنیاں ملائشیاں کی خوبصورتی تو بڑھا رہی تھیں۔ یہ روشنیاں اسے اپنے وجود پر چھائے اندھیرے کا احساس شدت سے دلا رہی تھیں۔

"محمد امیر!" اس کے لب بولنے کے انداز میں پھڑپھڑائے۔ اس نے جلدی سے مڑ کر روم کے بند دروازے کو دیکھا۔ جیسے اپنی چوری پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔

"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا" اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل سے اس کی تصویر نکالی اور شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا زندگی سے بھرپور مسکراتا چہرہ علیزے کے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ وہی حجاب والی لڑکی تھی۔ جس کا ہاتھ اس نے بڑے استحقاق سے تھام رکھا تھا۔

"تم کتنی خوش قسمت ہو"۔ وہ خیالوں میں ہی اس لڑکی سے مخاطب ہوئی تھی۔ جو محمد امیر کے ساتھ تھی۔

"میں ایک بات تمہیں بتا دوں محمد امیر!" اس نے تصویر سے نظریں ہٹا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ جیسے چاند سے مخاطب ہو کر وہ اس کے ذریعے محمد امیر کو اپنا پیغام بھجوا رہی ہو۔

"تمہیں مجھ سے ملنا ہوگا، مجھ سے بات کرنی ہوگی۔ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔" وہ پر یقین انداز میں چشم تصور میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

+++

محمد امیر سکون سے چائے پی رہا تھا۔ اور روما کا سکون غارت ہو چکا تھا۔ وہ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ حسین فراز کو شدید قسم کے احساسِ جرم نے آن گھیرا تھا۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو محمد امیر!" وہ شاکی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ مگر جواب ندارد۔

"جواب دو مجھے"۔ اس کا پُرسکون انداز روما کے غصے میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ غصے سے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"بی ہیو یور سیلف روما!" محمد امیر کے ہاتھ میں چائے کا کپ چھلکا اور نتیجتاً کچھ چائے محمد امیر کی شرٹ پر گر گئی تھی۔ وہ چائے کا کپ سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"وائس رونگ ود یو؟"

"تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے دھوکہ دے کر تم سمجھتے ہو کہ بچ جاؤ گے، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔" وہ زور سے چلائی۔

"میں نے تمہیں کون سا دھوکہ دیا ہے؟" محمد امیر کا سکون و اطمینان دیدنی تھا۔ روما کے تو تلووں پر لگی سر پر بجھی۔

"تم نے مجھ سے پوچھے بتائے بغیر اپنی اس پینڈو، بیک ورڈ کزن سے نکاح کر لیا۔ کیوں؟" وہ چیخا۔

"مائینڈ یور لینگویج روما!" وہ عائشہ گل کی ایسی تذلیل برداشت نہ کر سکا تھا۔

"میں اپنے کسی قول اور فعل کے لئے تمہارے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔" محمد امیر نے لمحوں میں اس پر اس کی حیثیت اپنی زندگی میں واضح کر دی تھی۔ روما شاکڈ تھی۔ ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا جو ہو گیا تھا۔

"تم کتنے بڑے چیٹر ہو!" وہ چلائی۔

"میں نے کبھی تم سے کوئی کمٹ منٹ نہیں کی۔ پھر تم کیسے مجھے چیٹر کہہ سکتی ہو۔" محمد امیر نے صفائی سے سارا ملبہ واپس اسی پر پھینکا تھا۔ وہ اس کے اس رویے پر دنگ رہ گئی تھی۔

+++

اِزابیل اپنے روم میں آئی۔ ڈریس تبدیل کیا۔ سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ دستک دے کر ہاشم اندر آئے۔ ایک نظر انہیں دیکھنے کے بعد وہ بیڈ کی چادر درست کرنے لگی۔ ہاشم چند ثانیے کھڑے جانچتی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

"تم سے ضروری بات کرنے آیا ہوں۔" گہری سنجیدگی لہجے میں سموتے ہوئے وہ گویا ہوئے۔

"کیسے ڈیڈی!" اتنا تو وہ جانتی تھی کہ بات اویس کے متعلق ہے۔ مگر وہ خاموش رہی، پہلے وہ ان کی بات سننا چاہتی تھی پھر کچھ کہنا چاہتی تھی......

"تم نے اویس کے متعلق کیا سوچا ہے؟ اور اس کا گمان سچ ثابت ہوا۔ انہوں نے وہی سوال کیا جو وہ توقع کر رہی تھی۔ اسے یہی امید تھی بلکہ یقین تھا۔

"کیا مطلب ڈیڈی؟ اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ مبادا ان کی بات کا مفہوم نہ جانتی ہو۔

"یہی کہ تمہاری شادی ہو جائے گی تو وہ کدھر جائے گا؟" انہوں نے کھل کر وضاحت کی اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ اس کی فکر مت کریں ڈیڈی! میں

نے دوٹوک انداز میں کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔

''مجھے اس کی نہیں تمہاری فکر ہے۔'' انہوں نے وضاحت کی تو پل بھر کو ازابیل کچھ نہ کہہ سکی اور پُرسوچ نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

''میری فکر مت کریں ڈیڈی!'' اگلے ہی لمحے اس نے انہیں صاف الفاظ میں کہا۔

''تم میری اکلوتی اولاد ہو۔'' انہوں نے پل بھر کا توقف کیا۔

''میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں''۔ وہ محبت پاش لہجے میں بولے۔

''تو پھر اویس کے متعلق غلط سوچنا چھوڑ دیں۔'' اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔

''میں نے سوچا ہے اسے کسی ٹرسٹ میں بھجوا دیتے ہیں اور......'' وہ بولے۔

''ڈیڈی پلیز......'' اس نے دبا دبا احتجاج کیا اور منت بھرے لہجے میں بولتے ہوئے ان سے درخواست کی۔ تو وہ مزید پریشان ہو گئے۔

''ایسا دوبارہ مت کہیے گا۔ میں اسے آپ پر بوجھ نہیں بننے دوں گی۔'' اس نے ان پر واضح کیا تو ان کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔

''مجھے اپنی نہیں، تمہاری فکر ہے۔'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر کہا۔ نا جانے یہ مصیبت کیسے ان کے گلے پڑ گئی تھی وہ سوچ کر رہ گئے۔

''میری فکر مند کریں۔ میں اس کا خیال رکھ کر خوشی محسوس کرتی ہوں۔ میرا احساسِ جرم کچھ کم ہونے لگتا ہے۔'' اس نے جتایا۔ وہ کچھ دیر بیٹھے اسے دیکھتے رہے اور بالآخر اٹھ کر چلے گئے۔

+++

روما آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا موڈ بے حد غضبناک تھا۔ اس نے بچپن سے لے کر آج تک محمد امیر کو اپنے ساتھ، اپنے آس پاس دیکھا تھا۔ وہ اس کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ اسے وہ بے حد عزیز تھا۔ محمد امیر بھی اس کے خیال میں اس سے محبت کرتا تھا۔ مگر اب جو اس نے کیا تھا تو روما شاکڈ تھی۔ اس کے لئے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔

''روما!'' اس نے ہاتھ میں پکڑا پرس لاؤنج کے صوفے پر زور سے پھینکا۔ پاؤں پٹختی اپنے روم کی جانب بڑھ گئی۔ ماما اس کے غضبناک تیور دیکھ کر اس کے پیچھے روم میں آئی تھیں۔

''میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔'' اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر ہاتھ مار کر سب چیزیں نیچے گرا دیں۔

''روما!'' ماما آگے بڑھیں۔

''کیا بات ہے میری جان؟''

''محمد امیر۔'' وہ غیض و غضب کے عالم میں پلٹی۔ صوفے سے تمام کشنز اٹھا کر زمین پر دے مارے۔

''کیا کیا محمد امیر نے؟''

''اپنی خالہ کی بیٹی سے نکاح کر آیا ہے''۔ اس کے انکشاف پر ماما گنگ کھڑی تھیں۔

''میں اسے معاف نہیں کروں گی''۔

''آپ ڈیڈی کو بلائیں۔ ابھی جا کر انکل سے بات کریں۔ وہ...... وہ طلاق دے اس لڑکی کو۔''

''روما! میری جان کنٹرول یور سیلف'' اس نے سر دونوں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

''میں بات کروں گی حسن سے''۔ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولیں۔

''آپ ابھی ڈیڈی کو بلائیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ ماما نے متفکر ہو کر اسے دیکھا۔

''ڈونٹ وری؟'' وہ اپنا سیل فون اٹھا لائیں۔

''میں کرتی ہوں کال تمہارے ڈیڈی کو''۔ وہ کال ملانے لگیں۔ جبکہ روما منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ اسے شدت سے ڈیڈی کا انتظار تھا۔ اب وہ ہی کچھ کر سکتے تھے۔ اسے محمد امیر کی غلطی کو سیدھا بھی تو کرنا تھا۔

+++

رات کا آنچل بھیگنے لگا تھا۔ ہر سُو ہُو کا عالم تھا۔ سارا عالم خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ وادی کی آنکھیں بھی نیند کے باعث مکمل بند ہو چکی تھیں۔ دن بھر کے تھکے وادی کے محنت کش مکیں اب گہری نیند کے زیر اثر تھا۔ شاید ہی کوئی جاگ رہا ہو۔

ایسے میں عائشہ گل اپنی کتابیں لیے بیٹھی تھی۔ یکا یک ٹیرس کا دروازہ ہوا کے زور سے بجا تھا۔ اپنے خیالوں میں مگن عائشہ گل زور سے کانپی تھی۔ ابھی وہ اٹھ کر دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا تھا۔ اس نے فون اٹھایا۔

''محمد امیر!'' اسکرین پر جگمگاتا اس کا خوبصورت نام دیکھ کر وہ زیر لب بڑبڑائی اور مسکراتے ہوئے کال رسیو کی۔

''السلام علیکم!'' عائشہ گل نے شائستگی سے سلام کیا۔ محمد امیر کو ایسا محسوس ہوا احساس اس کی آواز سے اس کی سماعتیں معطر ہو رہی ہوں۔

''میں انتظار کرتا رہا تم مجھے کال کرو گی۔'' اس نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا۔ عائشہ گل زیر لب مسکرا دی۔

''میں نے سوچا آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ ڈسٹرب نہ ہو جائیں''۔ اس نے بات بنائی محمد امیر اس کی چالاکی پر ہنس دیا۔

''آپ کی کال پر ہم ڈسٹرب نہیں خوش ہوتے''۔ وہ چاہت بھرے لہجے میں بولا تو عائشہ گل کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ اتنے مختصر وقت میں وہ اس کی زندگی میں جگہ بنا گیا تھا۔ رشتہ بدلا تھا تو احساسات و جذبات بھی بدل گئے تھے۔ اور پھر محمد امیر کے جانے کے بعد جو اداسی وادی کو گھیرے ہوئے تھی اس نے عائشہ گل کو بہت ڈسٹرب کیا تھا۔ اسے وہ ہر چیز میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایسے چند دنوں میں ہی ہر چیز میں اپنا عکس چھوڑ گیا تھا۔ وہ جس چیز کو دیکھتی، جہاں جیٹھتی اسے محمد امیر ہی دکھائی دیتا تھا۔

''کیا کر رہے تھے آپ؟'' عائشہ گل نے اس کی بات کو قصداً نظر انداز کرتے ہوئے بات کو بدلتے ہوئے استفسار کیا۔ مقصد اس کی بات کے اثر کو زائل کرنا تھا۔ وہ اس کی چالاکی پر زیر لب مسکرا دیا۔

''تمہیں یاد!'' عائشہ گل کا جی چاہا سر پیٹ لے۔ مگر وہ خاموش رہی۔

''اور تم؟'' اس نے بات بڑھاتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ اور عائشہ گل چند ثانیے خاموش رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ کیا جواب دے۔''

''میں پڑھ رہی تھی۔'' اس نے اگلے ہی لمحے جیسے کچھ یاد آنے پر بتایا۔ اسے اپنے جذبات چھپانے میں مہارت حاصل تھی۔

''میں سمجھا مجھے یاد کر رہی ہو گی۔'' اسے مایوسی ہوئی تھی۔ عائشہ گل نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

''تم کبھی بھی مجھے خوش نہیں ہونے دیتی عائشہ گل!'' وہ جتانے لگا۔ وہ ہنوز خاموش تھی۔

''کیا حرج تھا کہ اگر تم کہہ دیتی کہ آپ کو یاد کر رہی تھی۔'' وہ اسے احساس دلاتے ہوئے، بولا۔

''آپ چاہتے ہیں میں جھوٹ بولوں؟'' وہ

اسے سمجھانے لگی۔ تو محمد امیر اس کی چالاکی پر ہنس دیا۔

"نہیں...... مختصر جواب آیا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم سچ بولو تا کہ سچائی سن کر میں خوش ہو جاؤں" وہ اسے جتا گیا۔

"موبائل کے لئے شکریہ!" اس نے بات ہی بدل ڈالی۔ پھر محمد امیر نے بھی کچھ نہ کہا۔

"شکریہ کی ضرورت نہیں۔ تمہیں تو شاید نہیں چاہئے تھا مگر میرے لئے بہت ضروری تھا کہ تمہارے پاس موبائل فون ہوتا۔" اس کی ہر بات ہی شکوہ لئے ہوئے تھی۔

عائشہ گل ڈسٹرب ہونے لگی۔

"آپ ہر ٹائم مجھ سے خفا کیوں رہتے ہیں؟" وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

"اور تم ہر ٹائم میری محبت کو اگنور کیوں کرتی ہو؟" وہ کب ادھار رکھنے والا تھا۔ دوبدو بولا۔

"ایسا نہیں ہے۔" وہ انکار کرنے لگی۔ کیسے اسے بتاتی کہ وہ تو اس کے جانے کے بعد مسلسل اس کو سوچتی رہتی ہے۔

"ایسا ہی ہے۔" وہ فوراً بولا۔

"ایسا نہیں ہے ۔ بس میری نیچر Expressive نہیں ہے۔ آپ غلط سمجھ جاتے ہیں۔" عائشہ گل نے وضاحت ضروری سمجھی تو کہہ دیا۔

"محبت اظہار مانگتی ہے عائشہ گل!" وہ اسے جتاتے ہوئے بولا۔ یہ بات وہ اسے بارہا سمجھا چکا تھا۔ کئی مرتبہ سمجھا چکا تھا۔ مگر عائشہ گل جان کر انجان بن جاتی تھی۔

"جب مجھے آپ سے محبت ہوئی اظہار بھی ضرور کروں گی۔" وہ اسے بہلانے لگی۔

"آہ! عائشہ گل!" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"مطلب تم مجھ سے محبت نہیں کرتی۔" محمد امیر کی اداس آواز اسے شرمسار کر گئی۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد وہ یہ نظم پڑھنے لگا۔

تمہیں عشق ہو خدا کرے
تمہیں کوئی اس سے جدا کرے
تیرے ہونٹ ہنسنا بھول جائیں
تیری آنکھ پرنم رہا کرے
تجھے ہجر کی وہ جھڑی لگے
تو ملن کی ہر پل دعا کرے
تیرے خواب بکھریں یوں ٹوٹ کر
تو کرچی کرچی چنا کرے
تجھے عشق ہو، پھر یقین ہو
اسے تسبیحوں پر پڑھا کرے
میں کہوں کہ عشق جھوٹ ہے
تو نہیں نہیں کہا کرے

اس نے دل نشین لہجے میں وہ زخمی سی شاعری سنائی۔ ٹیرس پر بے فکری سے اٹھکیلیاں کرتی ہوا بنا دستک دیئے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی اور تاسف سے عائشہ گل کو دیکھا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ اور چہرے پر پھرنے والی آوارہ لٹوں کو کان کے پیچھے اڑسا۔

"بددعا دے رہے ہیں مجھے،" وہ جیسے اس سے پوچھنے لگی۔ وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"نہیں! احساس دلا رہا ہوں۔" اس نے فوراً وضاحت کی۔ عائشہ گل گھبرا اٹھی۔

"کوشش کروں گی آئندہ آپ کو شکایت نہ ہو۔" اس نے کہا۔

"مجھے تم سے اب بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔" محمد امیر فوراً بولا۔ مگر عائشہ گل کی بے چینی ختم نہ ہوئی۔

"سفر ٹھیک گزرا تھا؟" اس نے استفسار کیا اس کی بات پر محمد امیر کو اچانک یاد آیا۔

"ہاں اور میں پرسوں دبئی جا رہا ہوں تمہارے لیے کیا لاؤں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جو مانگوں دیں گے؟" وہ کہہ گئی۔

"ہاں!" وہ یقین سے بولا۔

"آپ کل کوئٹہ آجائیں۔ ہمارے گھر۔" اور محمد امیر نے موبائل فون کان سے ہٹا کر حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

+++

حسن فراز آفس سے گھر آئے تو سامنے ایک بہت بڑی ٹینشن ان کی منتظر تھی۔ انہیں محمد امیر کے اچانک ہونے والے نکاح کی خبر روما کے شدید ری ایکشن کے ساتھ ملی تھی۔

"ڈیڈ!" وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ انہیں کال پر راحیلہ نے ساری بات بتائی تو وہ دوڑے چلے آئے۔ اکلوتی بیٹی کی تکلیف اور دکھ ان سے دیکھا نہ جا رہا تھا۔

"ڈیڈ! محمد امیر نے مجھے چیٹ کیا۔" وہ رونے لگی تھی۔ آج تک انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کی آنکھ میں آنسو نہ آنے دیئے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر اس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ اسے کسی چیز کے لئے انتظار نہ کرنا پڑا تھا۔ کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔

"بے فکر ہو جاؤ میری جان!" ڈیڈی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"میں بات کرتا ہوں بھائی جان سے۔ یہ کیا طریقہ ہے۔" وہ خاصے غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔

"آپ ابھی اس وقت بات کریں انکل سے"۔ وہ کسی طور صبر پر آمادہ نہ تھی۔ اس کا خیال تھا محمد امیر اس کا ہے۔ اس پر صرف اسی کا حق ہے۔

"ریلیکس بیٹا!" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولے تو روما نے سر ان کے کندھے سے اٹھا دیا۔

"کیسے ریلیکس ہو سکتی ہوں ڈیڈی!" وہ لاڈ سے بولی۔ وہ محبت سے اس کا سر سہلانے لگے۔

"ایسا تو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا جو اس نے میرے ساتھ کیا" وہ ایک مرتبہ پھر روہانسی ہوئی۔ انہوں نے اکلوتی بیٹی کے دکھی چہرے کو دیکھا تو انہیں محمد امیر پر زندگی میں پہلی دفعہ غصہ آیا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری بیٹی کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ ڈونٹ وری۔" وہ اسے ریلیکس کرنے لگے۔

"اسے اپنے بھتیجے کی طرح جھوٹے خواب مت دکھائیں"۔ ماما نے دوٹوک انداز میں کہا تو حسن ان کی جانب مڑے۔

"نکاح حسن اور دردانہ کی شمولیت کے ساتھ ہوا ہے۔ یعنی دونوں کی مرضی شامل تھی۔ پھر کیونکر وہ اسے ختم کریں گے۔" انہوں نے حقیقت پسندی سے کہا۔

"ڈیڈی مجھے محمد امیر نہ ملا تو میں اس لڑکی کو مار دوں گی۔" روما نے سخت بپھرے انداز میں کہا۔

"کم آن بیٹا!" حسن نے کہا۔

"میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گا" وہ اس سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دے رہے تھے۔

+++

دوپہر کا وقت تھا۔ آفس میں آج مصروفیت روٹین سے ہٹ کر اور زیادہ تھی۔ علیزے کو سر نے ایک فائل تیار کرنے کو دی تھی۔ جس لے کر وہ اپنی سیٹ پر آئی۔ اور پوری وجہ سے فائل کو دیکھنے لگی۔ اس کے سامنے فائل کھلی ہوئی تھی اور اس کی خوبصورت مخروطی انگلیاں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تیزی سے متحرک تھیں۔ وہ اردگرد

سے بے گانہ اپنے کام میں منہمک میں تھی۔ دفعتاً اس کا ہاتھ غلطی سے کی بورڈ پر لگ گیا تو اس کے سامنے کی تصویر نکل آئی تھی۔

"محمد امیر!"

دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے ماما سے کیا وعدہ نبھانے کے لیے دل کو بری طرح ڈپٹا۔ محمد امیر کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

اگلے ہی لمحے دل نے ایسے بے چین ہو کر اسے پکارا کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بے چینی و بے قراری کے عالم میں آفس سے نکلی۔ اس کا رخ گھر کی جانب تھا۔ راستے میں اس کا گزر اپنے فیورٹ کلب کے سامنے سے ہوا تھا چند ثانیے وہ ادھر رک کر خالی خالی نظروں سے کلب کو دیکھتی رہی۔

"محمد امیر!" اس کے دل نے بے اختیار ہو کر اسے پکارا۔

"کبھی تو میرے سامنے آؤ گے"۔ وہ خیالوں کی دنیا میں پہنچ چکی تھی اور حال سے جیسے اس کا رابطہ کٹ چکا تھا۔

کبھی یوں بھی آ میری آنکھ میں
کہ میری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک شام سے نواز دے
مگر اس کے بعد سحر نہ ہو
وہ بڑا رحیم و کریم ہے
مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دعا کروں
تو!
میری دعا میں اثر نہ ہو......!

سورج ڈھلنے لگا تھا اور شام شوخ و شنگ حسینہ کی مانند جست لگا کر بستر سے اتر رہی تھی۔ ملائیشیا کی دیواروں پر سائے گہرے ہو کر ڈوبنے لگے تھے اور ساتھ ہی علیزے کا دل بھی۔

+++

نیو یارک انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔ بہت دنوں کی گہری اور سخت دھند کے بعد، شہر کے باسیوں کی امیدیں اور امنگیں بھر آئی تھیں اور سورج آسمان پر آنکھ کھول رہا تھا۔

ازابیل نے اپنا لمبا سیاہ کوٹ پہنا اور اویس کو نیلے رنگ کا لانگ کوٹ پہنا کر گھر سے باہر نکل آئی۔ صاف، ستھری سڑک پر وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے، وہ سوچوں میں غلطاں تھی۔ اس کے چیئر کی پشت کو زور لگانے اور آگے پیچھے ہونے سے دونوں شانوں پر بکھرے اس کے بال ہلتے تھے۔ اس کا رخ گھر سے قریبی پارک کی جانب تھا۔ وہ اکثر اوقات اویس کو یہاں لے آیا کرتی تھی۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو؟" ازابیل نے استفسار کیا تھا۔ وہیل چیئر کی رفتار کو ذرا سا کم کرتے ہوئے وہ نیچے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں گویا ہوئی۔ [illegible] اسے کسی معصوم بچے کی مانند لگا۔

"ہوں.....!" اس نے ہنکارا بھرا۔

"اب بہتر ہوں [illegible]" اس نے مختصر جواب دیا۔

"ایک بات بتاؤ"۔ وہ پارک میں داخل ہو چکے تھے۔ بہت شکن سرد [illegible] دھند کے بعد سورج نے جھلک دکھائی تو پارک میں معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ وہ روش پر دھیرے دھیرے وہیل چیئر کو دھکیلنے لگی۔

"پوچھو!" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"تم کب تک میرا خیال رکھو گی؟" وہ یقین دہانی چاہتا تھا۔ ایسی یقین دہانی جس کے بعد کوئی وہم اسے ستا نہ سکے۔

"ہمیشہ!" ازابیل نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"کبھی مجھ سے تنگ تو نہ آؤ گی؟" وہ مزید گویا ہوا۔

"ہرگز نہیں"۔ وہ جھٹ سے بولی۔

"تم بہت اچھی ہو ازابیل" وہ بولتے ہوئے مسکرایا تھا۔ اور وہ کبھی کبھار ہی مسکراتا تھا اور مسکراتا ہوا وہ ازابیل کو بہت اچھا لگتا تھا۔

"تم بھی مجھ سے ایک وعدہ کرو اویس۔" وہ جانچتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے احتیاط سے بولی۔

"کیا؟" وہ جھٹ سے بولا۔

"تم کبھی مجھ سے نفرت نہیں کرو گے"۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے احتیاط سے گویا ہوئی۔

"میں بھلا ایسا کیوں کروں گا" وہ حیرت سے گردن موڑ کر ازابیل کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"وقت کا کچھ پتا نہیں اویس۔ آنے والے دنوں میں حالات کیسے ہوں" وہ بولی تو اویس ناسمجھی سے [illegible] اسے دیکھنے لگا۔

+++

وہ مستعدی سے کام میں معروف تھیں۔ ازابیل کے آفس سے آنے میں ابھی دو گھنٹے رہتے تھے۔ وہ اطمینان سے سٹور میں آنے والے نئے سامان کو سیٹ کر رہی تھیں۔

یکایک انہیں زور کا چکر آیا تھا۔ انہوں نے خود کو بچانے کے لئے سہارے کے طور پر کسی چیز کو تھامنا چاہا۔

"are you ok miss merry!" سٹور کا مالک ایک ہمدرد انسان تھا۔ وہ ان کا خیال رکھتا تھا۔ ان کے ساتھ کافی حد تک تعاون کرتا تھا۔ وہ بھی ان کی شکر گزار رہتی تھیں۔

"جی..... جی....." وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پائیں۔ مگر درحقیقت انہیں بہت بری طرح چکر آ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے آپ گھر چلی جائیں، ریسٹ کریں۔ کل طبیعت بہتر ہو تو سٹور پر آ جائیے گا"۔ انہوں نے کہا تو وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اس ہمدرد انسان کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"شکریہ!" اپنا پرس اٹھا کر وہ سٹور سے نکل گئی تھیں۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے اس سٹور پر کام کر رہی تھیں۔ سٹور کا مالک ایک انڈین آدمی تھا جو کہ عمر میں ان سے چھوٹا تھا۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ وہ کسی حد تک ان کے حالات سے واقف تھا۔ اسی لیے ان کے ساتھ ہر ممکن حد تک تعاون بھی کرتا تھا۔

علیزے جب سکول اور پھر کالج جاتی تھی تو وہ بھی سٹور آ جاتی تھی اور پھر ان کے منع کرنے کے باوجود وہ ہر روز اسے چاکلیٹ دیا کرتے تھے۔ وہ ان کی ممنون رہتی تھیں۔

گھر پہنچیں تو اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئیں۔ علیزے کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ اسے تلاش کرتی ہوئیں اپنے روم میں آئیں۔

"علیزے!" وہ مستعدی سے آگے بڑھیں اور جھپٹنے کے انداز میں اس کے ہاتھ سے وہ سیاہ رنگ کی ڈائری لی۔ علیزے ورطہ حیرت میں ڈوب گئی۔ اسے ماما کا یہ انداز بے حد عجیب محسوس ہوا تھا۔

+++

اتوار کا دن تھا۔ سورج پورے آب و تاب کے ساتھ افق پر بلند ہوا تھا۔ اس کی کرنیں وادی میں اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی تھیں۔

پہاڑی وادی میں گھرے چھوٹے سے

ہٹ نما گھر کے کچن میں کھڑی عائشہ گل اپنے اور امی کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد امی کی طبیعت سنبھلی تھی اور وہ نیچے وادی میں کچھ گھروں کو ان کے سویٹر اور جرسیاں واپس کرنے گئیں تھیں۔

''ایک کپ چائے مجھے بھی مل سکتی ہے؟'' محمد امیر کی شوخ و شنگ، زندگی سے بھرپور آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ عائشہ گل اپنے الوژدن پر زیر لب مسکرادی۔

''اس وقت آپ آ جائیں تو چائے تو کیا آپ کو جان بھی دے دوں گی اپنی۔'' وہ دھیمے سروں سے اس سے مخاطب ہوئی۔ تو محمد امیر اندر تک جیسے سرشار ہو گیا۔ وہ کب اس سے محبت کا اظہار کرتی تھی۔ اور پھر ایسا اظہار تو محمد امیر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ نہال ہو گیا۔

''کیا کہا؟'' آواز دوبارہ سنائی دی۔ اب کی بار عائشہ گل نے کچھ چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ اسے اپنی بصارت پر گویا یقین نہ آیا۔ وہ اسے اپنا خواب سمجھی۔

''آپ!'' بے اختیار اس نے دایاں ہاتھ لبوں پر رکھا تھا۔ آنکھیں پھاڑے وہ حیرت کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

''جی، میں!'' محمد امیر دو قدم آگے آیا۔

''آپ نے یاد کیا، بندہ حاضر ہو گیا'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے، ذرا سا آگے کو جھک کر تابعداری سے کہا۔

''آئی کانٹ بلیو دس'' وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

''کیا آپ واقعی میرے کہنے پر آئے ہیں؟''

''میری محبت اور خلوص پر شک مت کرو عائشہ گل''۔ وہ اسے احساس دلاتے ہوئے بولا۔

''مجھے آپ کی محبت پر یقین ہے محمد امیر''۔ اور وہ واقعی اس کی محبت پر ایمان لے آئی تھی۔ وہ اس کی چاہت کو ماننے لگی تھی۔ انجانے میں ہی وہ اس کی محبت کی گرویدہ ہو گئی تھی۔

اس نے چائے دو کپوں میں ڈالی، محمد امیر کی ہمراہی میں چلتی لکڑی کا دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئی۔ باہر سردی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اس نے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

''بیٹھ جائیں۔'' عائشہ گل خود تین سیڑھیوں میں سے آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اور چائے کا سپ لیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔'' محمد امیر نے اپنا چائے کا کپ لبوں سے لگایا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ عائشہ گل نے گردن گھما کر اس شاندار شخص کو دیکھا۔

''واپسی کب ہے آپ کی؟'' عائشہ گل نے استفسار کیا۔

''جب تم کہو''۔ وہ جھٹ سے بولا۔

''پرسوں میرا پیپر ہے''۔ اس نے اطلاع دی۔

''ایک تو تمہاری پڑھائی''۔ محمد امیر نے نگاہیں اٹھا کر اس سحر انگیز، خوبصورت اور حسین وادی کو دیکھا اور پھر نظریں پھیر کر عائشہ گل کو بغور دیکھا۔ اور اس لمحے عائشہ گل اسے پوری وادی اور سارے ماحول پر چھائی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا۔

+++

رات کا نا جانے کون سا پہر تھا۔ نیند حسن فراز کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ راحیلہ سو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بے چینی کے عالم میں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے تھے۔

ماضی کے دریچوں سے ایک انجان، دلکش، اور روتا چہرہ جھانک کر ان کے دل کو بے چین کرنے لگا تھا۔ ان کی پریشانی حد سے سوا تھی۔ وہ جو اس بے قرار وجود کو بھول چکے تھے، ان بے چین، آنکھوں کو فراموش کر چکے تھے، ان منت ساجت کرتے لبوں کو بھول گئے تھے۔ سب کچھ پھر سے یاد آنے لگا تھا۔ ایک ایک نقش واضح ہونے لگا تھا۔

''پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو''۔ وہ برستی آنکھیں یاد آنے پر ان کا دل گھبرانے لگا تھا۔ وہ گھبرا کر روم سے باہر نکل آئے۔

''خدا کے لئے مجھے چھوڑ کر مت جاؤ''۔ ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔

''میرا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔'' وہ ہاتھ جوڑے منت کر رہی تھی۔ وہ لان میں آ گئے۔ ہلکی خنک ہوا ہر سو چل رہی تھی۔ وہ ٹہلنے لگے تھے۔ انہیں سردی کا بالکل احساس نہ ہو رہا تھا۔

+++

ازابیل اتوار کے روز اویس کو اپنے ساتھ چرچ لے گئی تھی۔ اس کی ڈیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے وہ چرچ کی عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ اویس حیرت سے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

''ازابیل!'' وہ اس کی چیئر کو دھکیلتے ہوئے ہال میں داخل ہوئی تھی۔ اویس نے سامنے دیکھا۔

''ہوں''۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' وہ استفسار کرنے لگا۔

''یہ چرچ ہے''۔ ازابیل نے بتایا۔

''ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''Prayer کرنے'' ازابیل نے اسے بتایا۔ وہاں قطاروں میں مرد، عورتیں، لڑکیاں، لڑکے اور کچھ بچے بھی بیٹھے تھے۔ ازابیل اسے ساتھ لئے ایک قطار میں جا بیٹھی۔ اویس نا سمجھی کے عالم میں آس پاس دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ اور فہم سے یہ سارا ماحول بالاتر تھا۔ ازابیل نے اسے نا جانے کہاں لے آئی تھی، وہ یہی سوچے جا رہا تھا۔

+++

دن کا آغاز بہت خوبصورتی سے ہوا تھا۔ محمد امیر کے آ جانے سے پوری وادی روشن ہو گئی تھی۔ دونوں نے چائے پی لی تھی۔ عائشہ گل کپ لے کر کچن میں چلی گئی تھی۔ کپ دھو کر رکھے۔

''خالہ جان کدھر ہیں؟'' محمد امیر بھی وہیں آ گیا۔

''وہ کام سے نیچے وادی میں گئی ہیں۔'' اس نے بتایا اور مڑ کر کچن سے باہر آ گئی۔

''یکا یک بادل گرجا تھا۔ عائشہ گل نے باہر نکل کر آسمان کی جانب دیکھا۔

''لگتا ہے بارش ہو گی''۔ عائشہ گل نے خود کلامی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

محمد امیر اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔

''تمہیں بارش پسند ہے؟'' وہ اس سے پوچھنے لگا۔

''جی''۔ وہ ہونے سے مسکرائی۔

''مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔'' اس نے بتایا۔ اسی لمحے آسمان سے پانی ٹپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری وادی کو نہلانے لگا۔ عائشہ گل نے جلدی سے قدم پیچھے ہٹائے۔ جبکہ محمد امیر بارش میں بھیگنے لگا۔

''اندر آ جائیں، بیمار پڑ جائیں گے۔'' عائشہ گل نے اسے بلایا۔

''تم باہر آجاؤ''۔ وہ ہتھیلیاں پھیلا کر ان پر بارش کی بوندیں جمع کرنے لگا۔ عائشہ گل اسے دیکھ کر ہنس دی اور پوری وادی اس کے ساتھ مسکرانے لگی۔

اس وقت محمد امیر کو دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہ کرسکتا تھا کہ وہ مشہور زمانہ سنگر ہے۔ اسے بارش کی بوندوں کو ہتھیلیوں پر جمع کر کے بچوں کی طرح مسکراتا دیکھ کر عائشہ گل کو بہت اچھا لگا تھا۔

''عائشہ گل باہر آجاؤ نہ۔'' وہ اسے بچوں کی طرح پکار رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''آپ بیمار پڑ جائیں گے، سردی بہت زیادہ ہے'' عائشہ گل نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے اسے تنبیہہ کی۔ مگر وہ کسی ضدی بچے کی طرح مسلسل سر نفی میں ہلاتا رہا۔

عائشہ گل نے اسے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ بوڑھا آسمان بھی اس روز خوب جم کر برسنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وادی خوب سرسبز و شاداب تھی۔ بارش اسے دھو کر مزید نکھار اور سنوار رہی تھی۔ ہر چیز دھل کر نئی ہو رہی تھی۔ ہر شے پر محمد امیر کی طرح مستی چھا رہی تھی۔

اسے بارش میں نہا۔ تے کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ بیرونی دروازہ کھلا اور ہاتھ میں چھتری تھامے امی اندر داخل ہوئیں۔ اپنے سامنے محمد امیر کو دیکھ کر وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئیں۔

''ارے!'' وہ تیزی سے اندر آئیں۔

''محمد امیر آیا ہے۔'' وہ اندر چلی گئیں۔ محمد امیر نے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

''بیٹا!'' امی نے اسے زور سے پکارا۔ کیونکہ بارش کا شور بہت زیادہ تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

''اندر آجاؤ۔ ٹھنڈ بہت زیادہ ہے۔ تم بیمار ہو جاؤ گے'' امی نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ اب کی بار محمد امیر انکار نہ کرسکا۔ اور ان کا کہنا مانتے ہوئے اندر آ گیا۔

اندر آتے ہی اس نے چھینک لی۔ عائشہ گل نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔

''تو گویا بارش نے کام کر دکھایا۔'' وہ جلدی سے اپنے روم میں گئی اور ٹاول لا کر اسے دیا۔

''کب آئے ہو؟'' امی نے دریافت کیا۔

''بس ابھی''۔ محمد امیر ٹاول سے بال رگڑتے ہوئے بولا۔

''ٹھنڈ لگ رہی ہوگی؟'' امی نے کہا۔

''جی'' اس نے ایک اور چھینک ماری۔

''عائشہ جاؤ جلدی سے انڈے اُبال کر دو اسے ساتھ چائے''۔ امی نے اسے ہدایت کی۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن کی جانب چل دی۔ جبکہ محمد امیر لباس تبدیل کرنے کے لئے اپنا سامان اٹھا کر گیسٹ روم کی جانب بڑھ گیا۔

+++

علیزے نے کچھ حیران ہو کر ماما کو دیکھا تھا۔ اسے ان کا انداز بہت عجیب سا لگا تھا۔ ایسا تو وہ اس کے ساتھ کبھی نہ کرتی تھیں۔ پھر آج کیا ہوا تھا۔ وہ حیرت سے لب نیم وا کئے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا ماما؟'' بالآخر اس نے استفسار کیا۔

ماما چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔

''بیٹا!'' انہوں نے ڈائری کو اپنے پیچھے چھپایا تھا جیسے ان کی کوئی بہت ہی قیمتی شے ہو۔

''اس کو دوبارہ مت اٹھانا۔'' انہوں نے اسے کہا تو علیزے کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔

''اس میں ایسا کیا ہے ماما!'' اسے اچنبھا ہوا۔ ماما نے آج تک کوئی بات یا کوئی چیز اس سے نہ چھپائی تھی۔ پھر اس ڈائری میں ایسا کیا تھا۔ وہ سوچے بنا نہ رہ سکی۔

''کچھ چیزیں اور باتیں اپنے وقت پر ہی پتا چلیں تو اچھا ہوتا ہے میری جان''۔ انہوں نے معنی خیزی سے کہا۔

''کیا مطلب ماما؟'' علیزے الجھی۔

''کچھ نہیں''۔ انہوں نے سر نفی میں ہلایا۔

''میرے سر میں بہت درد ہوا آج پھر۔'' انہوں نے بات بدلی۔

''اسی لئے چھٹی کر کے گھر آ گئی.....'' انہوں نے مزید بتایا تو علیزے متفکر ہوئی۔

''آپ سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ جاب چھوڑ دیں۔ میری سیلری میں ہمارا گزر بہت اچھا ہو جائے گا۔'' وہ کسی حد تک اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

''فارغ بیٹھوں گی تو بیمار پڑ جاؤں گی بیٹا۔'' انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''مگر اس طرح روز، روز آپ کی طبیعت خراب ہوتی ہے۔'' علیزے نے پھر کہا۔

''معمولی سر درد ہے اور کچھ نہیں ہے''۔ وہ مسکرائیں۔

''تم آج جلدی آ گئی۔'' وہ جیسے یاد آنے پر کہنے لگیں تو علیزے گڑبڑا گئی۔

''کام جلدی ختم ہو گیا تھا۔'' وہ بات بنا گئی۔

''میں کھانا بناؤں؟'' ان کا دھیان بٹانے کی غرض سے وہ جھٹ سے بولی۔

''نہیں۔'' ماما نے فوراً سر نفی کے انداز میں ہلایا۔

''میں بنا لوں گی۔ تم ریسٹ کرو''۔ وہ کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

''میں آپ کی ہیلپ کرواتی ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ ان کے پیچھے چل دی تھی۔

دونوں ہی اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ ایک دوسرے سے بات چھپانے اور بات بن جانے پر دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھیں۔

+++

رات مشکل سے گزری تھی۔ حسن فراز کو وہ رات ایک صدی پر محیط محسوس ہوئی تھی۔ انہیں رہ، رہ کر پچیس سال پہلے کی وہ رات یاد آتی رہی تھی۔ وہ روتی، برستی آنکھیں، وہ مجبور و بے بس چہرہ، وہ مغموم لہجہ۔ جو وہ وقت کی گردش میں اسے یکسر فراموش کر بیٹھے تھے، وقت نے جیسے اسے ایک مرتبہ پھر ان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگے تھے۔

اگلے روز وہ آفس نہیں گئے تھے۔ برائے نام ناشتہ کیا۔ راحیلہ کو ساتھ لیا اور حسین فراز کے گھر بنا اطلاع دیئے پہنچ گئے۔ وہ دونوں میاں بیوی ابھی ناشتہ کر رہے تھے۔ انہیں سامنے دیکھ کر ان کا ماتھا کچھ ٹھنکا۔ مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔

''محمد امیر دکھائی نہیں دے رہا۔'' حسن فراز نے گویا گفتگو کا آغاز کیا۔

حسین فراز نے دردانہ کی جانب دیکھا۔

''اِدھر ہی ہوگا کہیں'' دردانہ نے جواب دیا۔

''وہ تو جی کوئٹہ چلے گئے''۔ ان کی میڈ نے بتایا۔ جو اسی وقت لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

''کب؟'' دردانہ نے حیرت سے استفسار کیا۔

''صبح''۔ وہ بولی۔

''حیرت ہے، آپ کا بیٹا آپ کو بتائے بغیر

کوئٹہ گیا ہوا ہے۔ آپ لوگوں کو علم ہی نہیں ہے" حسن فراز نے طنز کا نشتر چھوڑا۔ وہ دونوں میاں بیوی مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"اس طرح اچانک وہ کبھی گیا تو نہیں کہیں بھی۔ کوئی ضروری کام ہوگا۔" دُردانہ نے بات بنائی۔

"ہاں! اب تو اس کے تمام ضروری کام کوئٹہ میں ہی ہوں گے۔" راحیلہ نے ایک مرتبہ پھر طنز کیا۔

"کہنا کیا چاہتی ہیں آپ؟" دردانہ نے بایاں ابرو چڑھائے تیکھی نظروں سے راحیلہ کو دیکھا۔

"وہی جو آپ سمجھنا نہیں چاہتی"۔ راحیلہ کا موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ اس سے دُردانہ نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور خاموشی سے حسین فراز کو دیکھا۔

"آپ لوگوں نے محمد امیر کا نکاح کر دیا ہے؟" حسن فراز نے استفہامیہ نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

"یہ ان ماں، بیٹے کو پتا ہو۔ مجھے تو خود عین وقت پر نکاح میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔" حسین فراز نے بغیر کسی لحاظ کے تمام ذمہ دردانہ اور محمد امیر پر ڈال دیا۔ دردانہ نے شکوہ کناں نظروں سے شوہر کو دیکھا، مگر بولی کچھ نہیں۔

"ہم اپنی بیٹی کے ساتھ ایسی زیادتی برداشت نہیں کر سکتے۔" حسن فراز مزید گویا ہوئے۔

دردانہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔ انہیں رومیا سے جو تھوڑی بہت ہمدردی تھی وہ بھی اس کے والد کا رویہ دیکھ کر غصے میں بدل گئی تھی۔

"دیکھیں حسن اور راحیلہ!" حسین فراز بولے۔

"میں اس معاملے میں قطعی قصور وار نہیں ہوں۔" انہوں نے صاف اپنا پہلو بچایا۔

"پھر بھی جو سزا آپ دو گے، میں اس کے لیے تیار ہوں"۔ وہ قطعیت سے بولے۔

"سزا کی بات نہیں۔ بس محمد امیر اس لڑکی کو طلاق دے کر رومیا سے شادی کرے"۔ حسن فراز نے مدعا بیان کیا۔ دُردانہ آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"ایسا ہی ہوگا۔" حسین فراز نے جھٹ سے کہا۔

"نکاح محمد امیر کی پسند سے ہوا ہے۔ وہ کبھی بھی طلاق نہیں دے گا۔" دردانہ خاموش نہ رہ سکیں۔ وہ کس طرح ان سب کو اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے سکتی تھیں۔ اور پھر وہ تھیں بھی محمد امیر کی ماں، بھلا کیسے چپ رہ سکتی تھیں۔

"تو پھر ہماری بیٹی کے ساتھ جو کمٹمنٹ کی تھی اس کا کیا؟" راحیلہ درشتی سے بولیں۔

"سوری راحیلہ، میرے بیٹے نے اج تک کسی لڑکی سے کوئی کمٹ منٹ نہیں کی۔ اور جس سے کی ہے اس سے نبھائے گا"۔ دردانہ جب دیکھا کہ سارا الزام ان کے بیٹے پر دھرا جا رہا ہے وہ خاموش نہ رہ سکیں اور صاف کہہ دیا۔

"محمد امیر نے ساری زندگی ہماری بیٹی کو آس دلائے رکھی۔ اور آخر میں جا کر چوروں کی طرح نکاح کر لیا۔" راحیلہ سخت غصے میں تھیں۔ سیدھے سجاؤ محمد امیر پر الزام لگانے لگیں۔

"آپ لوگ میرے بیٹے پر الزام لگا رہے ہیں۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" دردانہ نے ان کا الزام رد کیا۔

"اسٹاپ اٹ دردانہ!" حسین فراز زور سے دھاڑے۔ دردانہ نے دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات کا شکار ہو کر حسین کو دیکھا۔ انہیں ان سے یہ امید تو نہ تھی کہ وہ اس انداز سے ان سے بات کریں گے۔ وہ خاموش ہو کر رہ گئی تھیں۔

+++

چرچ میں Prayer ختم ہو چکی تھی۔ اویس اور ازابیل گھر کو روانہ ہو چکے تھے۔ اویس عجیب طرح کی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ دل کو ایسی بے چینی، وبے کلی لاحق ہو گئی تھی۔ جیسے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ یہ کیفیت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ راحیل کی فیملی آئی ہوئی ہے۔ ازابیل اسے ساتھ لیے سب کے پاس آ گئی تھی۔ راحیل کے ممی ڈیڈی نے ناپسندیدہ نظروں سے اویس کو دیکھا تھا۔

"کدھر سے آ رہے ہو تم لوگ؟" راحیل کی ممی نے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے ازابیل سے کاٹ دار لہجے میں استفسار کیا تو وہ چند ثانیے انہیں خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"چرچ گئے تھے Prayer کرکے آئے ہیں۔" ازابیل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بہتر ہوتا کہ تم چرچ راحیل کے ساتھ جاتی"۔ وہ ناپسندیدہ نظروں سے اویس کو دیکھتے ہوئے بولیں تو ازابیل نے ہاشم کو دیکھا۔ مگر وہ خاموش رہے۔

"آنٹی یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ہر جگہ راحیل کے ساتھ جاؤں۔" اس نے قطعیت سے کہا۔

"اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر جگہ اس نمونے کے ساتھ جاؤ"۔ انہوں نے بناء کسی لحاظ کے کہا تو ازابیل نے تیزی سے اویس کی جانب

دیکھا جس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔

"اگر آپ لوگوں نے ایسے ہی مجھ پر اعتراضات کرنے ہیں تو راحیل ابھی تمہارے پاس ٹائم ہے۔ تم سوچ لو"۔ وہ راحیل کی جانب مڑی، کچھ خفگی سے اسے دیکھا اور کہہ کر رکی نہیں۔ اویس کی وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ سب نے حیرت و بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔

وہ ایک فرمانبردار، ہنس مکھ اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ پھر اب اسے کیا ہو گیا تھا۔ سب بے یقین سے تھے۔ اس لڑکے نے ان کے گھر اور رشتوں کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔ ہاشم نے پُرسوچ نظروں سے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔

+++

رات کا وقت تھا۔ اندھیرے نے ملائشیا کو گلے لگا رکھا تھا۔ علیزے نے بہت دنوں کے بعد ماما کے ساتھ مل کر کوکنگ کی تھی۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ ماما سو گئی تھیں۔ جبکہ علیزے ہمیشہ کی طرح اس رات بھی اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔

"ایسا کیا تھا اس ڈائری میں جو ماما نے مجھے وہ نہیں دیکھنے دی۔" وہ پُرسوچ نگاہوں سے سیاہ آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ آج تک ماما نے اس سے کچھ نہ چھپایا تھا۔ پھر اس ڈائری میں ایسے کون سے راز تھے۔ جو وہ اس سے چھپانا چاہتی تھیں۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔

اور پھر وہ اس بات پر بھی شکر بجا لانے لگی کہ ماما کو اس کے جلد آنے کی وجہ معلوم نہ ہوئی تھی۔ اور اگر معلوم ہو جاتی تو......! اس سے آگے وہ سوچ ہی نہ سکی۔

"میں اب ماما کو محمد امیر کی وجہ سے پریشان نہیں کروں گی۔" اس نے گویا تہیہ کیا تھا اور خود سے کیے گئے عہد کو اس نے ہر حال میں نبھانا تھا۔

+++

حسن فراز اور راحیلہ کو حسین فراز نے مکمل یقین دلا کر بھیجا تھا۔ کہ محمد امیر اپنی کزن کو طلاق دے کر روما سے شادی کر لے گا۔ وہ دونوں مطمئن ہو کر گھر آئے تھے۔ راحیلہ کو البتہ محمد امیر کے ساتھ ساتھ دُردانہ پر بھی سخت غصہ تھا۔ کہ وہ ان کی بجائے محمد امیر کا ساتھ کیوں دے رہی ہیں۔ اس لئے انہوں نے دُردانہ کو اچھی خاصی سنا ڈالی تھیں۔ انہیں خوشی اسی بات کی تھی کہ حسین فراز نے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور جو غلطی ان کے بیٹے نے کی تھی وہ اسے سدھارنے کا وعدہ بھی کر چکے تھے۔

"محمد امیر سے بات کی آپ لوگوں نے؟" روما نے بے صبری سے پوچھا۔

"اس نے کیا کہا؟ وہ کب طلاق دے گا اس لڑکی کو؟" روما سے صبر نہ ہو رہا تھا۔ اس نے جھٹ سے دریافت کیا۔ اس کی بات پر حسن اور راحیلہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"محمد امیر سے ہماری بات نہیں ہوئی"۔ حسن نے اسے صاف بتایا۔

"تو پھر حسین انکل کے کسی وعدے یا یقین دہانی کا کوئی فائدہ نہیں۔" وہ ایک دم مایوسی سے بولی۔ اس کا سارا جوش فوراً ختم ہو گیا تھا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی کہ سب حالات سیٹ ہو کر اس کی فیور میں ہو گئے۔ اسے اگلے ہی لمحے پتا چلا کہ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ اس نے مایوسی سے ان دونوں کو دیکھا۔

"میں امیر کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ اتنی آسانی سے اس لڑکی کو نہیں چھوڑے گا۔" اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔ تو راحیلہ اور حسن بھی پریشان ہو گئے۔

"بے فکر ہو جاؤ بیٹا! یہ ہمارا دردِ سر نہیں۔ حسین بھائی خود اسے راہِ راست پر لے آئیں گے"۔ حسن نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر وہ کسی طور نہ سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ماما پاپا جائیں [illegible] ر تمام معاملہ سلجھا کر آئیں گے۔ مگر ابھی تک مسئلہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں اپنے روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

+++

ایک نہایت خوبصورت [illegible] میں اُتری تھی۔ اور اس کی خوبصورت [illegible] شرارت سے [illegible] بھر رہی تھی۔

کرسمس میں کچھ دن باقی تھے۔ اِزابیل اویس کو ساتھ لئے شاپنگ کے لئے نکلی تھی۔ اس کی چیئر کو دھکیلتے ہوئے وہ مختلف دکانوں [illegible] جاتی، شرٹس لا کر اس کے ساتھ لگا کر [illegible] آئینے کے سامنے لے جاتی اور [illegible] سے اس کی مرضی اور پسند دریافت کرتی۔

"جو تمہیں اچھا لگے لے لو۔" اویس بس یہی کہتا اور بالآخر اِزابیل نے اپنی مرضی اور چوائس سے اس کے لئے سُرخ شرٹ اور سیاہ جینز لے لی۔ جو اس کے سُرخ و سفید رنگ پر خوب جچتی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی شاپنگ کی۔ اب کی بار بھی وہ اس سے اس کی رائے لیتی رہی تھی۔ اور اب کی بار وہ اسے بھرپور مشورے دے رہا تھا۔ جو مسکراتے ہوئے اِزابیل نے قبول کیے تھے۔

اس نے اویس کے مشورے پر اپنے لئے سُرخ اور سیاہ کے امتزاج کی اسکرٹ لی تھی۔ شاپنگ کے بعد وہ اسے سڑک کنارے بنے ایک ریسٹورنٹ میں لے آئی تھی۔ وہاں ان دونوں نے کھانا کھایا تھا۔ اور پھر واپس جانے لگے۔

سڑک کے ساتھ ساتھ دور، دور تک شفاف شیشوں والی چمکدار اور دلکش دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ اِزابیل احتیاط سے چیئر کو دھکیل کر جا رہی تھی کہ ایک دکان کے سامنے جا کر اویس رک گیا۔ اس نے وہیل چیئر آگے بڑھانے سے منع کر دیا۔

"کیا ہوا؟" اِزابیل نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔

+++

عائشہ گل چائے اور اُبلے ہوئے انڈے لے آئی تھی محمد امیر لباس تبدیل کر کے آ گیا تھا۔ وہ مسلسل چھینک رہا تھا۔ اسے فلو ہو چکا تھا۔ اور عائشہ گل دونوں ہی پریشان ہو رہی تھیں۔

"معمولی سا فلو ہے خالہ جان، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے"۔ وہ مسکراتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولتا ہوا عائشہ گل کے متفکر چہرے کو دیکھنے لگا۔

"منع بھی کیا تھا بارش میں مت نہاؤ اور پھر بارش بھی سخت سردی کی"۔ امی گویا ہوئیں۔

"سچ میں خالہ جان بہت مزہ آیا" وہ ہنس دیا۔ اسی لمحے اس کے موبائل فون پر کال آئی۔ اس نے کال [illegible] کر کے موبائل فون کان کو لگایا تو اس کے مسکراتے لب فوراً سمٹ گئے۔ اور چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔

امی اور عائشہ گل نے اسے بغور دیکھا۔ نا جانے کیا بات تھی جو اس کے چہرے کا رنگ اچانک بدلا تھا......!

جاری ہے

+++

اپنی ضد اور انا کی وجہ سے۔۔۔'' عالیان نے جتاتے ہوئے لہجے میں باپ کو سنایا۔

''وجہ جو بھی ہو۔ وہ میری ماں ہیں اور میں ان کا بیٹا۔ انہیں منانا مجھ پر فرض ہے۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔'' سلطان اس کا طعنہ برداشت نہیں کر پائے اور غصے میں چیخ پڑے۔ عالیان کچھ لمحے انہیں لب بھینچے دیکھتا رہا پھر غصے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

+++

''آج تمہیں احساس ہوگا سلطان کہ جوان اولاد جب محبت کے چکر میں پھنس کر منہ کو آتی ہے تو ماں باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ ماں کے سینے پر کیسے سانپ لوٹتے ہیں جب جوان اولاد منہ زور ہو کر کسی اور کی محبت کا دم بھرے تو کلیجہ کیسے منہ کو آتا ہے۔'' نجم النساء اپنے کمرے میں بیٹھیں گہری سوچ میں گم تھیں۔ ان کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ پھیلی تھی۔

''آج تم اپنے گھر کی بنیاد ہلنے کی اذیت جان جاؤ گے سلطان۔۔۔۔!!'' ان کے لبوں نے ہولے سے سرگوشی کی۔

''یہی میرا حساب ہے۔ یہی میرا انصاف ہے اور یہی میرا انتقام ہے۔'' وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائیں۔

''تمہارے گھر کی بنیادیں بھی ہلیں گی جس کیلئے تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے آج اسی کو تم اپنی زندگی سے باہر کرو گے یا تو پھر اسے میرے قدموں میں لا جھکاؤ گے۔'' نجم النساء کے چہرے پر پھیلی فاتحانہ مسکراہٹ اچانک سے انتقام کا رنگ اوڑھ گئی۔

''میں آج اس عورت کو دیکھنا چاہتی ہوں جو تمہیں اپنی محبت کے زعم میں مجھ سے چھین کر لے گئی تھی۔ اس دہکا ہوا چہرے پر میرے سینے میں آگ بجھا پائے۔۔۔'' نجم النساء مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئیں۔ نیچے لان میں شمع پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ ان کی نظریں شمع پر ٹھہر گئیں۔

''تم وہ رانی ہو شمع بنی جس کیلئے اس حویلی میں جنگ چھڑ چکی ہے۔ کوئی تمہیں پانا چاہتا ہے، کوئی تمہارے لئے لڑنا چاہتا ہے اور کوئی تمہاری خاطر خود کو ہارنا چاہتا ہے۔۔۔۔'' نجم النساء شمع پر نگاہیں ٹکائے ہولے سے مسکائیں۔

''مگر تمہاری قسمت کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ تم اسی کا نصیب بنو گی جسے میں چاہوں گی۔'' وہ معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے بڑبڑائیں۔

''منصوبہ تو بہت اچھا بنایا تھا تم نے مگر وقت سے پہلے چال چل کر تم اپنا سارا کھیل خراب کر گئیں۔ مگر میں تمہاری طرح کسی جلد بازی سے کام نہیں لوں گی۔ ایسے معاملات پیدا کروں گی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' کھڑکی سے ہٹ کر وہ کمرے میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چہل قدمی کرتے ہوئے وہ آگے کے منصوبے بنانے لگیں۔

''سلطان ایک بار پھر تم اس مقام پر آ پہنچے ہو۔ ایک بار پھر تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا۔۔۔۔ تو بیوی یا پھر ماں۔۔۔!!!!'' نجم النساء ایک گہری سانس بھرتے ہوئے سوچ میں بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔

+++

''او یار شاہ ویز۔۔۔۔ کس سے جھگڑ کر آیا ہے جو یوں منہ بنائے بیٹھا ہے۔۔۔۔ بتا تو یار۔۔۔ ہوا کیا ہے۔۔۔؟؟'' ملک شاہ ویز اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر مسلسل بارہ بجے ہوئے تھے۔ کاشی، رؤف اور عابد اس کے اردگرد گھیرا ڈالے بیٹھے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کافی وقت گزرنے کے بعد بھی جب وہ ہونٹ پر قفل ڈالے منہ پھلائے بیٹھا رہا تو زچ آ کر کاشی بالآخر پوچھ بیٹھا۔

''ہونا کیا ہے۔۔۔۔ میرا سارا بھید کھل گیا ابا جی کے سامنے۔۔۔۔'' شاہ ویز چڑتے ہوئے انداز میں بولا۔

''اب یہ کون سا نیا چاند چڑھایا تھا تم نے جو ابا جی کے سامنے بیچ چوراہے ہنڈیا پھوٹی۔۔۔'' عابد نے مشکوک نگاہوں سے ملک شاہ ویز کو گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

''اوئے تجھے نہیں پتا۔۔۔۔؟؟'' رؤف ایکدم سے بیچ میں کودا اور حیرانگی بھری نظروں سے عابد کو دیکھنے لگا۔

''اوئے کیا چھپا رہے ہو تم لوگ مجھ سے۔۔۔ کیا کوئی نیا گل کھلایا ہے تم لوگوں نے۔۔۔؟؟'' عابد کے شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ اُن تینوں کو باری باری گھورنے لگا۔

''اوئے یار ہم نے کچھ نہیں کیا۔ یہ شاہ ویز ہے ناں اس نے اپنے ابا جی سے جھوٹ بول کر حویلی میں رشتہ بھیجا تھا۔'' رؤف نے ملک شاہ ویز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''حویلی میں رشتہ بھیجا تھا۔۔۔ مگر کس کیلئے۔۔۔ کہیں اس سیمن کیلئے تو نہیں۔۔۔؟؟'' عابد ایکدم سے ایکسائٹڈ ہوا۔

''اوئے سمجھا دا اسے۔۔۔ اُس بال کی سیمن کیلئے ملک شاہ ویز رشتہ وشتہ بھیجنے نہیں والا۔'' ملک شاہ ویز ایک دم سے برا منا گیا۔ عابد تو دل پر ہاتھ رکھ بیٹھا۔

''تو پھر کس کیلئے۔۔۔۔۔؟؟'' عابد حیرت سے بولا۔

''اسی کیلئے۔۔۔ جو پہلے تو تجھ پر بڑی مہربانی سے نکلی بھی تھی۔۔۔۔'' کاشی نے بائیں آنکھ دبا کر خباثت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اوئے بکواس نہ کر۔۔۔۔!!'' ملک شاہ ویز نے کاشی کے نقش سے پر تنو ہوتے ہوئے ایک دھموکا جڑا۔ کاشی یکدم سے بلبلا اٹھا۔

''تیرا بھائی اس سے شادی کے چکر میں خوار ہو رہا ہے اور تو اپنی بھابھی جیسی لڑکی سے بکواس کر رہا ہے۔'' ملک شاہ ویز نے کاشی کو غصے سے گھورتے ہوئے جھڑکا۔

''اوئے نہیں یار۔۔۔ میں تو بس ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔'' کاشی یکدم سے سٹپٹا گیا۔

''چل چھوڑ ان باتوں کو۔۔۔ یہ بتا پھر ہوا کیا ہے۔۔۔۔؟؟'' رؤف اصل مدعے پر لوٹتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

''حویلی گئے تھے ابا جی دادا جی کے ہمراہ۔۔۔ وہاں انہیں میری اور اس منحوس سیمن کی ساری داستان پتا لگ گئی۔ بڑے جلال میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میری شادی اب اسی سیمن سے کروائیں گے۔'' ملک شاہ ویز پریشانی سے بولا۔

''ابے تو اس سے اچھی بات ہو گئی ہے۔۔۔ یاد نہیں کتنا پسند کرتا تھا اُسے۔۔۔؟؟'' کاشی بیچ میں کودے بنا نہ رہ سکا۔

''کرتا تھا۔۔۔ مگر اب نہیں کرتا۔ جب سے اُس حور پری کو دیکھا، نظروں کو کوئی اور جچتا ہی نہیں۔۔۔ اوئے بڑی معصوم ہے

وہ۔۔۔بالکل پھولوں کی طرح نازک اندام' خوشبوؤں کی طرح تروتازہ' مہکتی ہوئی۔۔۔۔" شاہ ویز' شمع کے تصور میں کھویا' کہتا چلا گیا۔

"ہاں لیکن یہ مت بھول کہ وہ ابھی بھی حذیفہ کی منگیتر ہے۔" رؤوف نے یاد دلایا۔

"اس منگنی کو برقرار رکھنے کیلئے اب کوئی وجہ نہیں بچی۔ حذیفہ کے دل میں' میں نے بدگمانی کا ایسا بیج بویا ہے کہ اب کبھی بھی وہ شمع پر اعتبار نہیں کر سکے گا۔" ملک شاہ ویز نے مکاری سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن یہ تو بتا یاد کر کہ اپنے اباجی کو کیسے منائے گا۔ وہ تو کسی صورت تیری شادی اب شمع سے کروانے والے نہیں۔۔۔۔!!" عابد نے فوراً یاد دلایا۔

"اباجی کو رام کرنے کیلئے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔" ملک شاہ ویز نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

"ہاں تو پھر کیا کرو گے تم۔۔۔۔؟؟" کاشی بے تابی سے پوچھ بیٹھا۔

"ابے گدھے وہی تو سوچ رہا ہوں۔۔۔۔!!" شاہ ویز نے کاشی کی پشت پر دھموکا جڑتے ہوئے کہا۔ کاشی منہ بسورے شاہ ویز کو گھورنے لگا۔ جبکہ عابد اور رؤوف اس کی دھلائی پر خوب ہنستے ہوئے اسے چڑانے لگے۔

+++

"اماں جی اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کیسے کر سکتی ہیں۔۔۔؟؟" آفاق الدین مضطرب سے انداز میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہے تھے۔

"اوہو ہوا کیا ہے۔۔۔ جب سے کمرے میں آئیں ہیں مسلسل پریشانی سے بڑبڑائے جا رہے ہیں۔" انیسہ الماری میں کپڑے سیٹ کرتے ہوئے ان کی بڑبڑاہٹ سن کر تعجب سے استفسار کرنے لگیں۔

"اماں جی نے آج حد کر ڈالی ہے۔ سلطان سے شمع اور عالیان کے رشتے کی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں۔ اور تو اور وہ سلطان کی بیوی کو بھی معاف کرنے کیلئے تیار بیٹھیں ہیں۔" انیسہ کے سوال پر آفاق الدین تیزی سے ان کی جانب بڑھتے ہوئے بتانے لگے۔

"چلو شکر ہے بھئی۔۔۔۔ اماں نے بات کر لی۔ ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ یہ بلا سر سے نہیں ٹلنے والی۔۔۔۔" انیسہ کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

"کیا مطلب تم جانتی ہو اس بارے میں۔۔۔؟؟ اور یہ کس بلا کی بات کر رہی ہو تم۔۔۔؟؟" آفاق الدین ایک دم سے مشکوک ہوئے۔

"نن۔۔ نہیں بھئی میں کیا جانوں۔۔۔ ابھی تو آپ نے بتایا۔۔۔۔ اور میں تو شمع کے حوالے سے کہہ رہی تھی کہ اچھا ہے عالیان سے اس کا رشتہ ہو تا۔ حذیفہ ویسے بھی اس سے شادی کیلئے آمادہ نہیں۔ اچھا ہی ہوا جو گھر بیٹھے رشتہ مل گیا۔" آفاق الدین کے ماتھے پر بل پڑتا دیکھ کر انیسہ نے فوراً سے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اچھا نہیں بہت غلط ہونے جا رہا ہے۔ شمع کا عالیان سے رشتہ ہونا تمہارے نالائق بیٹے کیلئے کوئی اچھا شگن نہیں ہے۔" آفاق الدین نے ناگواری سے جتاتے ہوئے کہا۔

"لو اس میں برا شگن کیا ہے بھلا۔۔۔؟؟" انیسہ ٹھٹکیں۔

"اس حویلی سے اپنی تمام قدر و قیمت کھوتا جا رہا ہے تمہارا بیٹا۔ اور اگر عالیان کا رشتہ جڑ گیا ناں شمع سے تو حذیفہ کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

اس کی پہچان اس حویلی میں یہی ہوگی کہ اس کی وجہ سے حویلی کی بیٹی کی عزت داؤ پر لگی۔ اور وہ اتنا کم ہمت نکلا کہ اپنی عزت کی حفاظت بھی نہیں کر سکا۔" آفاق الدین نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔ انیسہ لب بھینچے انہیں دیکھتی رہیں۔

"اور صرف اتنا ہی نہیں' اس شادی کی صورت میں سلطان اور اس کی فیملی ایک بار پھر اس حویلی میں آباد ہو جائے گی۔ ایک طرف شافع الدین اور دوسری جانب سلطان اماں پر حاوی رہیں گے۔ اور میں۔۔۔۔ جس نے ساری زندگی اس حویلی کے بگڑے معاملات' درست کرنے میں صرف کر ڈالی۔ تم ماں بیٹے کے الٹے کرتوت کی بدولت کسی کھاتے میں شامل نہیں رہوں گا۔" وہ بگڑے ہوئے مزاج کے ساتھ انیسہ کو باتیں سنانے لگے۔

"اوہو۔۔۔۔ اب اگر اماں نے رشتے کی بات کر دی ہے تو ضروری نہیں کہ عالیان مان بھی جائے۔ جوان جہاں لڑکا ہے۔ باہر ملک میں رہتا آیا ہے۔ یوں اچانک چھوٹے سے قصبے میں آ کر باپ کی پسند سے شادی کیلئے راضی تھوڑی ہو جائے گا۔ آپ دیکھ لیجئے گا وہ انکار کر دے گا۔" انیسہ بڑے وثوق سے اندازے لگاتے ہوئے شوہر کو سمجھانے لگیں۔

"تمہیں لگتا ہے کہ عالیان کے انکار کی کوئی اہمیت ہو گی۔۔۔۔۔؟؟" آفاق الدین ماتھے پر بل ڈالے انیسہ کو گھورتے ہوئے سوال کرنے لگے۔

"ہاں تو کیوں نہیں ہو گی اہمیت۔۔۔۔۔؟؟ سلطان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ انکار کرے گا تو سلطان کو بات ماننی پڑے گی اس کی۔" انیسہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے آفاق الدین کو سمجھانا چاہا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری۔۔ تم جانتی نہیں ہو سلطان کو۔۔۔ انتہائی ضدی اور اپنی من مانی کرنے کا عادی ہے وہ۔ ایک بار جو فیصلہ کر لیتا ہے پھر اُس سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کا روادار نہیں ہوتا۔ اگر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ عالیان کی شادی شمع سے ہو گی تو یقین جانو اس کے فیصلے کو کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔" آفاق الدین نے انیسہ کی ساری خوش فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔

"بات یہ نہیں ہے۔۔۔ معاملہ دراصل یہ ہے کہ عالیان اپنے ماموں کی بیٹی سے محبت کرتا ہے۔ بلکہ ان دونوں کا رشتہ بھی طے ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں سے واپس لوٹتے ہی وہ اُس لڑکی سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب خود ہی بتائیں کہ وہ کیسے یہاں شمع سے شادی کیلئے راضی ہو گا۔۔۔؟؟" انیسہ چار و ناچار اصل بات کہنے پر مجبور ہوئیں۔

"اور تم یہ سب کیسے جانتی ہو۔۔۔۔؟؟" اس بار آفاق الدین ٹھٹھکے۔

"وہ دراصل۔۔ میں نے عالیان کو موبائل پر بات کرتے سنا تھا۔" انیسہ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور کیا یہ بات اماں کو بھی معلوم ہے۔۔۔؟؟" آفاق الدین کو اندیشہ لاحق ہوا۔ انیسہ آہستگی سے اثبات میں سر ہلا گئیں۔

"اب سمجھا۔۔۔۔۔ اماں حقائق جان کر اس خواہش کا اظہار کر کے سلطان کو اس کی ماضی کی بغاوت کی سزا دے رہی ہیں۔" آفاق الدین لمحے بھر میں بات کی تہہ تک جا پہنچیں۔

"اب آپ بالکل صحیح سمجھے۔۔۔۔!!" انیسہ بھی شوہر کو نتیجے پر پہنچتا دیکھ کر کچھ حد تک مطمئن ہوئیں۔

"اچھا نہیں ہو رہا یہ۔۔۔۔ اماں آگ سے

نشانہ بنی تھی۔ پھر کیوں میری وضاحت اتنی بے وقعت رہی۔۔۔؟؟" شمع کیلئے حذیفہ کی کوئی بھی دلیل قابل قبول نہیں تھی۔ اس کی ہر وضاحت اس کے لفظوں اور جذبوں کی طرح کھوکھلی نکلی تھی۔

"نہ تم مجھے بچا سکے نہ تم میرا یقین کر سکے۔ بلکہ تمہاری وجہ سے میری امی بستر مرگ تک جا پہنچیں۔ میرے بابا کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں جا لگیں اور تم گھر میں اپنی ماں کی قدر و منزلت بڑھانے میں مصروف رہے۔ تمہاری محبت کتنی پائیدار ہے یہ میں اچھی طرح جان چکی ہوں۔ تم محبت کے اول امتحان میں ہی اپنی ناکامی کا ثبوت دے چکے۔ اب کیا رہ گیا کہنے سننے کو۔۔۔" شمع اتنا کہہ کر بنا رُکے وہاں سے چلی گئی۔ حذیفہ لب بھینچے اُسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

+++

"سمجھ نہیں آ رہا بابا کو ہوا کیا ہے۔ اس طرح تو وہ کبھی نہ تھے۔ نہ مما کا احساس ہے نہ ہی ماموں کی محبتوں ان کے خلوص کا خیال۔۔۔" عالیان چڑے ہوئے انداز میں اپنا سامان بیگ میں پیک کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

"کتنی آسانی سے وہ دادی کی اتنی بڑی بات مان گئے۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اور نویرا ایک دوسرے سے انگیجڈ ہیں۔ اُس کے باوجود وہ دادی کے فیصلے پر رضامند ہو گئے۔۔۔" سامان رکھتے رکھتے وہ سلطان کے رویے کو سوچتے ہوئے تذبذب کا شکار ہوا۔

"اور یہ دادی کو چانک کیا ہوا ہے۔ مما کا تو نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں اور اب انہیں سینے سے لگانے کی باتیں کر رہی ہیں۔۔۔ اتنی جلدی ان کی سوچ میں تبدیلی بھلا کیسے آ سکتی ہے۔" وہ شش و پنج میں گھرا بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ۔۔۔" اس نے چونک کر دروازے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جواب ملتے ہی شمع دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ عالیان اُسے کمرے میں دیکھتے ہی چونک کر فوراً سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہیں جانے کی تیاری ہے۔۔۔؟؟" شمع نے سامان سے بھرے بیگ کی جانب دیکھ کر سوال کیا۔

"ہم۔۔۔ واپسی کی تیاری ہے۔۔۔!!" عالیان نے سرسری سے انداز میں بیگ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنی جلدی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی کچھ دن ہی تو ہوئے ہیں آپ لوگوں کو یہاں۔۔۔" شمع بے ساختہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہم لوگ تو یہاں بس مہمان ہیں۔ اور مہمانوں کو جلد یا بدیر واپس تو لوٹنا ہی ہوتا ہے۔" عالیان نے شمع کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے خاص طور پر جتایا۔ شمع اس کے چہرے پر پھیلی بے نیازی لہجے میں مخفی اجنبیت کو محسوس کر کے تھوڑی جز بز ہو گئی۔

"ویسے خیریت۔۔۔ آج آپ نے میرے کمرے میں آنے کا تکلف کیسے کر لیا۔۔۔؟؟" وہ اُسے الجھا الجھا سا کھڑا دیکھ کر طنز کرتے سوال کر گیا۔

"وہ دراصل آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ آپ نے حقیقت سب کے سامنے لا کر میری ذات پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ کی گواہی نے ایک بار پھر مجھے اپنے گھر میں معتبر بنا ڈالا۔" شمع اس کے سوال میں چھپے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے شکر گزار لہجے میں اپنے آنے کا مدعا بیان کرنے لگی۔ اس کی بات کے جواب میں عالیان ایک لمحے کیلئے چپ سا ہو گیا۔

"دراصل کچھ دن قبل ہی میں نے حذیفہ اور سبین کی گفتگو سے سچائی جانی تھی۔ اس لئے جب آپ کے کردار پر بات ہوئی تو حقیقت جانتے بوجھتے چھپانہ سکا۔ اسے آپ میرا کوئی احسان نہ سمجھیں بلکہ یہ میری فطرت میں ہے۔ میں کسی کی بھی کوئی بھی غلط بات برداشت کرنے کا قائل نہیں ہوں۔" وہ دھیمے مگر دو ٹوک انداز میں اپنے اس عمل کی وضاحت کر گیا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا تب سے ہی اس معصوم لڑکی کو پے در پے مشکلات سے نبرد آزما دیکھا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک ہمدرد فطرت کا مالک نیک دل انسان ہے اور شمع کو اکیلے ہی درپیش حالات سے لڑتا دیکھ کر انسانی ہمدردی کے ناطے مدد کرتا چلا گیا۔ مگر اس کی ہمدردی دوستانہ انداز کو یہاں کے لوگوں نے نہایت غلط انداز میں دیکھنا شروع کر ڈالا تھا۔ اور ان اندازوں کی بدولت ایسے فیصلے کئے جانے لگے تھے کہ جو نہ صرف احمقانہ بلکہ اس کی ماں کی زندگی پر بھی انتہائی خوفناک انداز میں اثر انداز ہونے والے تھے۔ عالیان کو گمان گزر رہا تھا کہ شمع کو اس فیصلے کا علم ہے مگر اس کے تاثرات جان کر اُسے یقین ہو گیا کہ جو فیصلہ ان دونوں کو لے کر کیا جا رہا ہے اس کی طرح وہ بھی اُس فیصلے سے انجان ہے۔ لیکن اس کے باوجود حقائق جان کر اُس نے شمع کے ساتھ اپنا رویہ محتاط رکھا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے دوستانہ انداز و ہمدردی کو شمع بھی کسی اور جذبے سے معمور کرے۔

"آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے میری سچائی کی گواہی دے کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اور اس کیلئے میں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔" شمع اس کے رویئے سے محسوس ہوتی تپش بھانپ کر مختصر لفظوں میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے وہاں سے چلی گئی۔

عالیان شمع کے جانے کے بعد ایک گہری سانس اپنے اندر اتار کر اُس کی کہی گئی باتوں کو سوچنے لگا۔

+++

"او شاہ ویز پتر۔۔۔ ادھر آ ذرا۔۔۔" ملک فیاض پرسوچ انداز میں راہداری میں ٹہل رہے تھے۔ شاہ ویز سارا دن آوارہ گردی میں گزار کر جیسے ہی اندر داخل ہوا۔ ملک فیاض نے آواز لگا کر اُسے روک لیا۔

"خیر تو ہے دادا جی۔۔۔ آج پوتے کی یاد کیسے آ گئی۔" ملک شاہ ویز نے خفگی بھرے انداز میں ملک فیاض کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس دن ملک جمیل نے جب اس کی ٹھیک ٹھاک کھنچائی کی تھی تب وہ اُن سے امید لگائے بیٹھا تھا کہ اس نازک موقع پر وہ ہمیشہ کی طرح اس کا ساتھ دیں گے۔ مگر انہوں نے طوطا چشمی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے اُس سے منہ پھیر لیا تھا۔ اسی بات کی ناراضگی کا اظہار اس نے موقع ملتے ہی جتا ڈالا تھا۔

"اوئے یار کو گولی مارو۔۔۔ تیری تو فکر ہی مجھے راتوں رات جگائے رکھتی ہے۔" ملک فیاض نے پوتے کی ناراضگی کو ناک پر سے مکھی کی طرح اڑاتے ہوئے سنایا۔

"کیوں دادا جی۔۔۔ میری فکر کیوں ستائے رکھتی ہے۔ میں کوئی لڑکی ہوں کیا جو آپ کی راتوں کی نیندیں حرام ہوئی پڑی ہیں۔" ملک فیاض کی بات پر شاہ ویز سخت برا مناتے ہوئے بولا۔

''کاش تو لڑکی ہوتا تو کم از کم یوں ہاتھ سے تو نہ نکلتا۔۔۔!!'' شاہ ویز کی بات پر ملک فیاض زیرلب بڑبڑائے۔

''دادا جی اب کیا منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے ہیں۔ بتائیں بھی کہ مجھے کیوں روکا ہے۔'' ملک فیاض کی بڑبڑاہٹ پر ملک شاہ ویز بدمزہ ہوتے ہوئے بولا۔

''بس بس۔۔۔ زیادہ عجلت مچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چل ادھر آ۔۔۔ میرے پاس بیٹھ۔۔ کچھ ضروری بات کرنی ہے تجھ سے۔'' وہ رراہداری سے مڑ کر ہال نما لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ ملک شاہ ویز کو مجبوراً ان کے پیچھے ہال میں آنا پڑا۔

''یہاں بیٹھ جا پتر۔۔۔۔!!'' وہ اپنی نشست سنبھالتے ہوئے سامنے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''اب بتا بھی دیں دادا جی۔۔۔ آخر بات ہے کیا۔۔۔؟؟'' ملک شاہ ویز کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بےزاری سے بولا۔

''بات سن پتر۔۔۔ تیرے باپ نے آج آفاق الدین سے تیری اور اُس بچی سبین کی رشتے کی بات کر ڈالی ہے۔ آفاق نے بھی آگے سے اچھی امید دلائی ہے اور مجھے توقع ہے کہ اس ہفتے کی آخر تک معاملہ طے ہو جائے گا۔'' ملک فیاض پوتے کو بغور دیکھ کر رسان سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے دادا جی۔۔۔ میں تیار ہی نہیں اُس باندری سبین سے شادی کیلئے۔۔۔ میری مرضی کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے بھلا یہ رشتہ۔۔۔'' ملک شاہ ویز بات سنتے ہی غصے سے اکھڑ گیا۔

''او پتر اب ڈرامے نہ کر۔۔۔ یاد نہیں کیسے مرا جا رہا تھا اس لڑکی کے عشق میں۔۔ اُس حذیفہ پر بھی تم نے اس لڑکی کے چکر میں حملہ کیا تھا۔ سب جانتا ہوں میں۔۔۔ میرے سامنے زیادہ تماشے نہ لگا۔'' ملک فیاض بھی بگڑ کر ڈپٹے۔

''اُو نہیں دادا جی۔۔۔۔ وہ تو بس مجھے ضد چڑھ گئی تھی۔ حذیفہ نے پولیس سے میرے فارم پاؤس پر چھاپہ پڑوا کر مجھے بڑی تذلیل کا نشانہ بنایا تھا۔ اُس پر حملہ بس میں نے اسی تذلیل کا انتقام لینے کی غرض سے کیا تھا۔ کوئی پاگل واگل نہیں تھا میں اُس لڑکی کے عشق میں۔۔۔'' ملک شاہ ویز ڈھٹائی سے صاف مکرتے ہوئے بولا۔

''دیکھ پتر اب تیرا مقصد جو بھی ہو۔۔۔ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ جمیل نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اور تُو اپنے باپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک بار جو وہ فیصلہ کر لے اُس سے پھر وہ کسی صورت پیچھے نہیں ہٹتا ہے۔'' ملک فیاض نے پوتے کو بتھے سے اکھڑتا دیکھ کر اپنا لہجہ دھیما کرتے ہوئے سمجھانا چاہا۔

''میں اپنے باپ کا پتر ہوں دادا جی۔۔۔ میں نے بھی جو فیصلہ کر لیا اُس سے ایک سینٹی میٹر بھی پیچھے نہیں ہٹنے والا۔۔۔ شادی تو میں شمع سے کروں گا۔ کسی کو آگ لگتی ہے تو لگ جائے شاہ کر کے۔۔۔'' ملک شاہ ویز بھی جوش میں آ کر بڑے بول کر گیا۔

''اُو بس کر پتر۔۔۔۔ آنکھ کھول اور اپنی حقیقت پہچان۔۔۔ تیری جو فیض پور میں حیثیت ہے وہ تیرے دادا اور باپ کی وجہ سے ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی نہ مانی تُو نے تو اس فیض پور میں ہی تیری کوئی حیثیت رہے گی نہ وقعت۔۔۔ پوری بستی میں کوئی منہ بھی نہ لگائے گا تجھے۔۔۔ نہ ہی تیری اول جلول حرکتوں پر کوئی

پردہ پوشی کیلئے آگے بڑھے گا۔ اور یاد رکھ یہ جو تیرے یار دوست ہیں ناں جن کی یاری پر تُو بڑا نازاں پھرتا ہے۔۔۔ تیری اوقات بدلتی دیکھیں گے تو سب سے پہلے یہی تجھے چھوڑ کر بھاگیں گے۔'' ملک فیاض نے زندگی میں پہلی بار اپنے عزیز از جان پوتے کو انتہائی تلخی سے آئینہ دکھایا تھا۔ ملک شاہ ویز ان کے اس غیر متوقع بات پر ہکا بکا سامنہ کھولے دیکھتا رہ گیا۔

''ایک بات ذہن نشین کر لے شاہ ویز پتر۔۔۔ تیرا دادا اب بڈھا ہو گیا ہے۔ تیری غلطیوں کی بھرپائی کرتے کرتے تھک چکا ہے۔ مگر تو ایسا کم عقل ہے کہ روز ایک نیا گل کھلاتے نہیں تھکتا۔۔۔ اب بس کر دے پتر۔۔۔ تماشہ اتنا ہی لگایا جاتا ہے جتنا بکھیڑا سمیٹا جا سکے۔ اپنی اوقات سے بڑھی بات ہو یا حالات۔۔۔ انسان کو ذلیل ہی کرواتے ہیں۔ تو بھی اب اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ اور اپنی بات کی مان۔۔۔ اسی میں تیرے لئے اور ہم سب کیلئے آسانی ہے۔'' وہ اُسے احساس دلا کر نصیحت کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ سب اُس حذیفہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ ہی وہ اپنی گز بھر لمبی زبان کھولتا۔ نہ ہی ابا جی کو میرے اور سبین کے متعلق کچھ پتا چلتا۔۔۔۔ پھر وہ میری اور سبین کے رشتے کی بات بھی نہیں کرتے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر گیا یہ حذیفہ۔۔۔ اِسے تو میں چھوڑوں گا نہیں۔۔۔'' ملک فیاض کے اٹھتے ہی شاہ ویز تلملائے ہوئے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کرسی سے اٹھا۔

''اوئے پتر۔۔۔ تجھے کس نے کہا کہ تیرے باپ کو یہ سچائی حذیفہ نے بتائی ہے۔۔؟؟'' اس کی بڑبڑاہٹ سن کر ملک فیاض کے قدم ٹھٹھک کر رُکے۔ وہ حیرانگی سے پلٹ کر شاہ ویز کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''تو اور کون بتائے گا۔ میرے اور حذیفہ کے جھگڑے کی وجوہات کیا تھیں یہ صرف مجھے اور حذیفہ کو پتا تھیں۔ میں نے اگر کسی کو نہیں بتایا تو اُسے بھی کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہئے تھا۔

''اوئے نہیں یار۔۔۔۔۔۔ تو غلط سمجھ رہا ہے۔ حذیفہ نے نہیں بتایا یہ سب کچھ۔۔۔ اُس سے پھر سے بدلہ لینے کیلئے اب کوئی نئی مہم جوئی اختیار مت کر بیٹھنا۔۔۔ !'' ملک فیاض اس کے خیال کی نفی کرتے ہوئے خفگی سے بولے۔

''حذیفہ نے نہیں بتایا تو پھر کس نے بتایا ہے یہ سب کچھ۔۔۔۔ دادا جی اور کون ہے جو یہ ساری سچائی جانتا ہے۔'' ملک شاہ ویز ان کی بات پر ایکدم سے حیران و پریشان ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''وہ جو شہر سے لڑکا آیا ہے۔۔۔ سلطان کا بیٹا۔۔۔ بڑا اچھا سا نام ہے اُس کا۔۔۔'' ملک فیاض ذہن پر زور ڈالتے ہوئے نام یاد کرنے لگے۔

''عالیان۔۔۔؟؟'' ملک شاہ ویز نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے عالیان کا نام لیا۔

''ہاں ہاں عالیان۔۔۔۔۔۔ اُسی لڑکے نے سارے حقائق سے سب کو آگاہ کیا ہے۔ اور صرف یہی نہیں وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم شافع کا کیس واپس لینے کے بعد اس کی بیٹی شمع کو بلیک میل کر رہے ہو۔ تمہارے باپ کو تم پر اصل غصہ تو اس معصوم لڑکی کے ساتھ یہ کریہہ کھیل کھیلنے پر ہے۔'' ملک فیاض خفگی سے جتا کر وہاں سے چلے گئے۔ مگر شاہ ویز بھونچکا سا وہاں بیٹھا رہ گیا۔

''تو یہ ساری کارستانی تمہاری ہے

عالیان۔۔۔“ حقائق سامنے آنے پر اس کے چہرے پر غصہ وانتقام دوڑنے لگا۔

”غلط انسان سے پنگا لے لیا ہے تم نے عالیان۔۔۔اب دیکھتے جاؤ کہ میں تمہاری کیسی درگت بنواتا ہوں۔“ ملک شاہ ویز تصور میں عالیان کو دھمکاتے ہوئے دانت پیس کر غرایا۔

+++

”امی۔۔۔!!“ شمع ہولے سے دستک دے کر‘ آہستگی سے دروازہ کھول کر سفینہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”ہاں میری جان ۔۔۔!!“ سفینہ آرام کی غرض سے بستر پر دراز تھیں۔ اس کی آواز سنتے ہی فوراً اٹھ بیٹھیں۔ شمع انہیں اٹھ کر بیٹھتا دیکھ کر کھانے کے برتن لئے ان کے پاس چل آئی۔

”آؤ بیٹھو۔۔۔!!“ بیٹی کو محبت سے دیکھتے ہوئے انہوں نے ممتا بھرے لہجے میں کہا۔

”گرما گرم روٹی بنائی ہے اور ہلکے مصالحے میں چکن بنائی ہے۔ چلیں اب جلدی سے آپ کھانا‘ کھانا شروع کریں۔“ شمع مسکراتے ہوئے ان کے روبرو بیٹھ کر‘ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ماں کو کھانا کھلانے لگیں۔

”سدا خوش رہو میری جان ۔۔۔ اللہ کرے تمہارا نصیب چودھویں کی چاند کی طرح روشن رہے ہمیشہ ۔۔۔“ چند لقمے کھاتے ہی سفینہ‘ شمع کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دینے لگیں۔

”میرا نصیب اور چودھویں کے چاند جیسا روشن۔۔۔۔۔“ وہ بے ساختہ ماں کو دیکھنے لگی۔

”ہاں کیوں نہیں ہوسکتا تمہارا نصیب چاند جیسا روشن اور چمکدار۔۔۔۔؟؟ سفینہ اس کی حیرانگی پر مسکراتے ہوئے سوال کرنے لگیں۔

”چاند جیسا تو ہے میرا نصیب امی۔۔۔مگر اماوس کے چاند جیسا۔۔۔“ شمع دلگرفتگی سے بیتی باتوں کو یاد کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں میری جان۔۔۔تمہارے نصیب کا گرہن تمہاری ماں نے اپنی دعاؤں سے دھو ڈالا ہے۔ اب دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب سب اچھا ہوگا تمہارے حق میں۔۔۔“ بیٹی کو رنجیدہ دیکھ کر سفینہ نے بے اختیار اس کا ماتھا چومتے ہوئے امید دلائی۔

”ایسا کیا ہوا ہے حویلی میں امی جو آپ اچانک اتنی پر امید نظر آ رہی ہیں۔۔۔؟؟“ شمع ان کے بدلے بدلے انداز‘ آنکھوں میں چمک‘ اور لبوں پر کھلی مسکراہٹ کو بغور دیکھتے ہوئے متجسس ہوئی۔

”تمہارے بابا بتا رہے تھے کہ تمہاری دادی نے سلطان سے تمہارے اور عالیان کے رشتے کی بات کی ہے۔ شافع کہہ رہے تھے کہ سلطان نے امید دلائی ہے کہ وہ جلد خوشی کی خبر سنائیں گے۔“ سفینہ نے پر مسرت لہجے میں اسے تفصیلات سنائیں۔ شافع الدین کچھ دیر قبل ہی اُسے یہ خبر سنا کر گئے تھے۔

”میرا رشتہ عالیان سے۔۔۔؟؟“ شمع ہکا بکا سی رہ گئی۔

”ہاں ۔۔۔ اور نہیں تو کیا۔۔۔ بھئی سچ کہوں تو مجھے یہ لڑکا عالیان پہلی نظر میں ہی بہت بھایا تھا۔ اور یہ بھی تو دیکھو کہ اُس نے ہر موقع پر تمہارا ساتھ بھی کتنا دیا ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ بھی تمہیں دل ہی دل میں پسند کرتا ہوگا۔“ سفینہ پُرجوش سی کہتی چلی گئیں۔

”مجھے دل ہی دل میں پسند کرتا ہوگا۔۔۔ امی یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ۔۔۔؟؟“ ان کے آخری جملے پر شمع نے بے ساختہ چونکتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

”ارے تمہیں پسند نہیں کرتا تو کیا ایسے ہی مشکل میں تمہارے ساتھ کھڑا رہتا۔ اور دیکھا نہیں تم نے۔۔۔اُس بدبخت شاہ ویز کا رشتہ آیا تو کیسے ملکوں کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔۔۔یہ سارے آثار محبت کے ہی تو ہیں۔۔۔۔“ سفینہ اپنے اندازے لگا تیں اسے باور کرانے لگیں۔

”اسے محبت نہیں‘ نیکی کہتے ہیں۔۔۔ بھلائی کہتے ہیں۔ اُس نے انسانی ہمدردی کے ناطے یہ سب کچھ کیا۔ اور آپ لوگ اس کی اچھائی کو نہ جانے کیا کیا نام دے بیٹھے۔۔۔۔“ شمع شرمندگی سے ماں کو دیکھتے ہوئے سمجھانے لگی۔ کچھ دیر قبل عالیان کے سرد و بے نیاز سے رویے کی وجہ اُسے اب اچھی طرح سمجھ آچکی تھی۔ کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی وہ دل ہی دل میں اس رشتے کا سوچ کر بے حد شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

”اوہو۔۔۔تم بہت بھولی ہو بیٹا۔ مردوں کی کچھ سمجھ نہیں۔ جس عورت پر مرد کا دل آجاتا ہے ناں اپنی تمام ہمتیں وہ اسی کیلئے مجتمع کر کے زمانے سے بھڑ جاتا ہے۔ جیسے عالیان تمہارے لئے بنا سوچے سمجھے سب سے لڑ گیا۔ اور تم ہو ہی اتنی من موہنی میری جان تو پھر کیوں نہ ہو اُسے تم سے محبت۔۔۔۔؟؟“ سفینہ اپنی دھن میں کہتی چلی گئیں مگر شمع کے دل میں ایک بوجھ سا آن گرا۔

”مجھ سے بھلائی کے چکر میں‘ تم پر بھی ایک آزمائش آن پڑی عالیان۔۔۔۔شاید اسی وجہ سے تم مجھ سے ناراض ہو۔ اور واپس لوٹ کر جا رہے ہو۔۔۔؟؟“ وہ ندامت کے احساس تلے سوچ کر رہ گئی۔

+++

”سبین تُو نے میرے ساتھ ذرا بھی اچھا نہیں کیا۔ ارے تجھے تو میں نے اس حویلی کی بہو بنانے کا سوچ رکھا تھا۔ مگر تم نے تو میرے سسرال میں میری ناک ہی کٹوا کر رکھ ڈالی۔“ انیسہ‘ سبین کے کمرے میں بیٹھی اُسے خونخوار نظروں سے گھورتی کوس رہی تھی۔

”خالہ‘ حذیفہ نے منع کیا تھا مجھے آپ کو بتانے سے۔۔۔۔“ سبین اس مسلسل لعن طعن پر منمناتے ہوئے بولی۔

”حذیفہ نے منع کیا تھا۔۔۔۔۔۔“ بیٹے کا نام سنتے ہی انیسہ بری طرح چڑ کر اس کی منمناہٹ پر نقل اتارتے گھور کر دیکھنے لگیں۔

”سچ کہہ رہی ہوں خالہ۔۔۔حذیفہ ہی نے مجھے منع کیا تھا آپ کو کچھ بھی بتانے سے۔۔۔؟“ انیسہ کے غصے پر گھبرا کر سبین اپنی بات کے وضاحت پر مزید زور دیتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔۔!! حذیفہ نے منع کیا تھا۔۔۔اور تم اتنی فرمانبردار حذیفہ کی‘ جیسے اُس سے اجازت لے کر ہی تو اس کم بخت شاہ ویز کے ساتھ پورے فیض پور میں گھوڑے اڑاتی پھرتی تھیں۔“ سبین کی دوبارہ وضاحت پر انیسہ بری طرح آگ بگولہ ہوتے ہوئے بھڑک اٹھیں۔ ان کی بات پر سبین بری طرح گڑبڑا گئی۔

”مجھ سے غلطی ہوگئی خالہ۔۔۔ میں بس ملک شاہ ویز کے دھوکے میں آگئی تھی۔۔۔۔“ سبین شرمندہ سی بولی۔

”غلطی نہیں گناہ کہو سبین بی بی۔۔۔ گناہ کہو اپنی حرکات کو۔“ انیسہ اسے گھرکتے ہوئے ٹوک گئیں۔ سگی خالہ کا کرخت روپ دیکھ کر سبین کا حلق خشک ہونے لگا۔

''یہ مت سمجھنا کہ مجھے کچھ علم نہیں۔۔۔ حذیفہ نے مجھے اک اک بات تفصیل سے سنا ڈالی ہے۔ اب کچھ ڈھکا چھپا نہیں رہا مجھ سے۔۔۔'' نفیسہ نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ سبین بے اختیار خالہ سے نظریں چرا گئی۔

''ہائے میں تو یہ سوچ کر شرم سے پانی پانی ہو رہی ہوں سبین کہ میرے بچے نے تجھے اس مردود شاہ ویز کے ساتھ کس حال میں دیکھا تھا۔'' نفیسہ خود تو سر پکڑ کر بیٹھ گئیں مگر سبین پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ منظر یکدم اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

''تب ہی میں کہوں کہ تم سے شادی کے ذکر پر وہ کیوں اتنا بدک جاتا ہے۔ ہائے میری عقل پر خاک پڑ گئی تھی جو اس کی جھنجھلاہٹ سمجھ نہیں پائی۔'' نفیسہ ساری باتیں یاد کر کے خود کو کوسنے لگیں۔ سبین کا آج اس کی سگی خالہ کا تلخ و سرد رویہ شدت سے احساس دلا رہا تھا کہ جب کسی کی ذات پر تیز و تلخ لفظوں کے نشتر چبھوئے جاتے ہیں تو وہ جسم کو سنگباری سے زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔ اُسے بے ساختہ اپنے وہ الفاظ یاد آ گئے جو وہ صرف شمع کو نیچا دکھانے کی خاطر زہر میں ڈبو کر اس پر نشانے کی صورت باندھتی تھی۔ جبکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شمع بے قصور ہے۔ اور اصل قصوروار وہ خود ہے۔ مگر انسان کو اس کی خود غرضی کی انتہا عموماً گہری کھائی تک لے جاتی ہے۔ آج سبین کو بھی اس حقیقت کا ادراک اچھی طرح ہو چکا تھا۔

''ہائے سبین تیرا بیڑہ غرق ہو۔۔۔ تو اگر پاکباز اور باکردار ہوتی ناں تو میرا بیٹا میری بات ہرگز نہ ٹالتا۔۔۔ پہلے دن ہی شمع پر چار حرف بھیج کر میرے اشارے پر شادی کیلئے راضی ہو جاتا

''نفیسہ اب خود کو کوستے کوستے سبین کو کوسنے لگیں۔ سبین کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

''بس کر دیں خالہ اب۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں شرمندہ بھی ہوں۔ اور اب مجھے یہاں نہیں رہنا' اپنے گھر واپس جانا ہے۔'' سبین روہانسی سی کہنے لگی۔

''بیٹا شرمندہ ہونا بہت چھوٹا لفظ ہے تمہارے لئے۔۔۔ اور جہاں تک بات ہے اس حویلی میں رہنے کی تو۔۔۔ ہاں بھی تمہیں اب اس حویلی سے جانا پڑے گا۔ اور اپنے گھر نہیں' بلکہ بیاہ کر اسی مردود ملک شاہ ویز کے گھر جانا ہو گا۔ ملک جمیل نے ساری سچائی جان کر اپنے بیٹے کیلئے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ اور میں نے تمہاری ماں کو بھی ساری بات بتا ڈالی ہے۔ تمہاری اس آوارہ لڑکے سے عشق کی داستان سن کر وہ بھی اپنی عزت بچانے کی غرض سے اس رشتے پر راضی ہے۔'' نفیسہ نے اصل بم اب اس کی سماعتوں پر چھوڑا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں خالہ۔۔۔؟؟''' سبین حق دق سی انہیں دیکھے چلی گئی۔

''وہی جو تم سن رہی ہو۔۔۔ تیار رہنا۔ اس ہفتے کے آخر تک تمہاری ماں باپ کی موجودگی میں تمہیں یہاں سے سادگی سے رخصت کر دیا جائے گا۔'' نفیسہ' سبین کے ہوش مکمل طور پر اڑا کر وہاں سے چلی گئیں۔ سبین کو آج پہلی بار علم ہوا کہ سر پر جب آسمان ٹوٹ پڑتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے۔

''یا اللہ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔۔۔!!'' سبین سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

+++

ایک چھوٹے' تنگ سے خالی کمرے میں مونا کو قید کیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ' پیر رسیوں کی

مدد سے باندھے گئے تھے۔ وہ متوحش سی بیٹھی ہوئی اپنے ساتھ پیش ہونے والے حالات و واقعات کے متعلق سوچ رہی تھی تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نقاب پوش شخص اندر داخل ہوا۔ مونا الرٹ سی ہو کر اس شخص کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہ شخص اسے گھورتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے پاس چلا آیا۔

''دیکھو تم نے میرے بھائی کو چند دن کی مہلت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر مجھے ایک بار پھر اغوا کر کے تم لوگ اپنی بات سے مکر رہے ہو۔۔۔'' مونا نے ہمت کر کے اسے مخاطب کیا۔

''تمہارے بھائی کو مہلت دینے کا وعدہ اسلم بھائی نے کیا تھا۔ میں نے نہیں۔۔۔!!'' وقار نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''تو کیا تم اسلم بھائی کے آدمی نہیں ہو۔۔۔؟؟'' مونا حیران و پریشان ہوئی۔

''نہیں۔۔۔!!'' اس یک لفظی جواب نے مونا کی رگوں میں دوڑتے لہو کو منجمد کر ڈالا۔

''تو پھر کون ہو تم۔۔۔؟؟'' مونا ایک دم سے گھبرا گئی۔ اسلم بھائی سے غضنفر کی دشمنی کا تو اسے علم تھا مگر اب یہ کون نیا دشمن آ نکلا جو اسے چارہ بنا کر غضنفر کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ سوچ اس کے چہرے پر خوف بن کر طاری تھی۔ اس کے سوال کے جواب میں اس شخص نے آہستگی سے اپنے چہرے سے نقاب ہٹایا۔

''وقار۔۔۔ یہ تم ہو۔۔۔؟؟'' مونا نقاب کے پیچھے سے ظاہر ہوتے وقار کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

''ہاں یہ میں ہوں مونا۔۔۔ تمہارا وقار۔۔۔!!'' وقار نے استہزائیہ نظروں سے مونا کے رنگ اڑے چہرے کو دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

''ذلیل' کمینے انسان۔۔۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے اس طرح اغوا کرنے کی۔۔۔؟؟'' مونا کے حواس جیسے ہی بحال ہوئے' وہ سخت مشتعل ہوتی ہوئی وقار پر جنگلی بلی کی طرح جھپٹ پڑی۔ مگر اگلے ہی پل اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ وقار نے اُسے سخت نفرت سے پرے دھکیل ڈالا۔

''مردوں کو اپنے حسن و محبت کے جال میں پھانسنے والی بد ذات عورت۔۔۔ تمہیں' تمہارے عشق میں مبتلا ہو کر نہیں یہاں اٹھا لایا ہوں۔ بلکہ تمہارے دھوکے کا حساب چکتا کرنے یہاں لایا ہوں۔ اپنے نقصان کی بھرپائی کرنے یہاں لایا ہوں۔'' اس کے لبوں سے ادا ہونے والے لفظوں سے زہر ٹپک رہا تھا۔ مونا اس دھتکار پر شاکڈ کی سی کیفیت میں وقار کو دیکھنے لگی۔

''تم نے میری محبت کا مذاق اڑایا۔۔۔ پیسے چاہئے تھے تو کہہ دیتیں۔۔۔ تمہاری محبت میں ایسے ہی وار دیتا تم پر۔۔۔ دھوکہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔؟؟'' وقار بری طرح چیخ پڑا۔ مونا لب بھینچے اسے دیکھنے لگی۔

''کتنی ہوس ہے تمہیں ان پیسوں کی مونا۔۔۔ عزت' محبت' خودداری۔۔۔ ان سب سے بڑھ کر ہے تمہارے لئے یہ کاغذی نوٹ۔۔۔'' وہ اپنے جیب سے چند نوٹ نکال کر مونا کی جانب اچھالتے ہوئے اسے ملامتی نظروں سے دیکھنے لگا۔ مونا بھی اپنے چاروں اطراف بکھرے نوٹ تو کبھی وقار کی آنکھوں سے جھلکتے غصے کو دیکھنے لگی۔

''میں تو تمہیں بہت انمول سمجھتا تھا مونا مگر

اُس دن تمہاری اصلیت جان کر اندازہ ہوا کہ تم کتنی بے مول ہے۔ اور یہ دیکھ کر شدید افسوس ہوا کہ خود کو اتنی پستی میں تم نے خود اپنی مرضی سے گرایا ہے۔" وقار نے اُسے متاسف نظروں سے دیکھتے ہوئے لتاڑا۔

"غربت کیا ہوتی ہے تمہیں ابھی ادراک نہیں ہے اس کا۔ پیٹ خالی رہے تو انسان سے وہ سب کچھ بھی کرواتا ہے جو بھرے پیٹ کے لوگوں کیلئے شاید ہیچ و حقیر ہو۔" مونا خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے دفاع میں بولی۔

"غربت کو مت الزام دو۔۔۔۔غربت کسی جرم کا جواز نہیں ہوتی۔ ہزار مجبوریوں' پریشانیوں میں میری ذات بھی جکڑی ہوئی ہے۔ میرے اوپر بھی بیوہ بوڑھی ماں کی ذمہ داری ہے۔ میں چاہتا تو میں تمہاری التفات کا فائدہ اٹھاتے' تمہیں بلیک میل کر کے پیسے بٹورتا۔ مگر میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ میں ایک معصوم لڑکی کی محبت کا فائدہ اٹھاؤں۔ تمہیں میں محبت کے اونچے منصب پر بٹھاتا رہا مگر تم کیا نکلیں۔۔۔۔ زہریلی ناگن۔۔۔!!" وہ نفرت سے پھنکارا۔

"اتنے تم محبت میں باوفا ٹھہرے ہوتے تو آج میرے ساتھ یوں نہ کرتے جو تم نے کیا ہے۔۔۔" مونا کے پاس اپنے دفاع میں کچھ نہ تھا کہنے کیلئے' اسی لئے اُس نے وقار کی محبت پر انگلی اٹھاتے ہوئے شکوہ شروع کر ڈالا۔

"تمہارے منہ سے محبت والفت کی باتیں اچھی نہیں لگتیں مونا بی بی۔۔۔۔اور بے وفا سے کیا وفا کرنا۔۔۔۔ تمہیں تو میں یہاں اپنا تمام حساب چکتا کرنے آیا ہوں۔ وہ کیا ہے ناں جب کسی کا حساب حد سے بڑھ جائے تو چکانا فرض ہو جاتا ہے۔۔" وقار نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے مونا کو دیکھا۔

اس کی سرد نظروں نے مونا کے تن بدن میں کپکپی سی دوڑا دی۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا یہ سمجھنے کیلئے اندازہ لگانا مشکل تھا مگر یہ بات تو طے تھی کہ وہ اُس کے ساتھ کچھ بہت خطرناک کرنے والا ہے۔

ہم آدمی ہیں تمہارے جیسے
جو وفا کرو گے' وفا کریں گے
جفا کرو گے' جفا کریں گے
ستم کرو گے' ستم کریں گے
ہم آدمی ہیں تمہارے جیسے
جو تم کرو گے' وہ ہم کریں گے

وقار دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نگاہوں سے جھلکتی سفاکی مونا کے رگوں میں سنسنی کی لہر دوڑا گئی۔

+++

نجم النساء اپنے کمرے میں پرسوچ انداز میں ٹہل رہی تھیں۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ سلطان۔۔۔۔۔!!" انہوں نے دروازے کی طرف چونک کر دیکھتے ہوئے کہا۔ سلطان الدین آہستگی سے دروازے کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔

"اماں۔۔۔۔آپ نے بلوایا تھا۔۔۔" سلطان نے نجم النساء کے روبرو کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں سلطان۔۔۔آؤ بیٹھو۔۔" نجم النساء سامنے موجود کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ سلطان نے ماں کے پُرسوچ چہرے کی جانب دیکھا اور پھر ایک توقف کے بعد کرسی پر بیٹھ گئے۔

"دیکھو سلطان میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔ عالیان اور تبع کے رشتے میں ہی ہم سب کی اور اس حویلی کی بھلائی ہے۔" نجم النساء نے بیٹے کو بغور دیکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ سلطان ان کی بات پر خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔

"تم جب سے یہاں آئے ہو' مجھ سے معافی کے طلب گار ہو۔ اور بیٹا ایسا نہیں ہے کہ میرا دل تمہاری جانب نہیں جھکتا۔ میں تمہاری ماں ہوں' تم سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتی۔ مگر جس طرح تم ہم سب سے دامن چھڑا کر یہاں سے گئے تھے اُس کے بعد یہاں سب کے دلوں میں تمہارے لئے بہت شکوے شکایتیں جمع ہو چکی تھیں۔ تمہارے اس عمل نے یہاں سب کو باور کروا دیا تھا کہ اب تمہارے اس حویلی میں لوٹنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں بچی اور آج بھی اس حویلی میں کسی کے بھی خیالات تمہارے متعلق تبدیل نہیں ہوئے۔" نجم النساء بہت سوچ کر ایک ایک لفظ ادا کر رہی تھیں۔ سلطان چہرے پر شرمندگی سجائے ماں کی باتیں بغور سنتے چلے گئے۔

"میں جانتی ہوں کہ آفاق تم سے مسلسل رابطے میں تھا اور تمہیں بار بار واپسی کیلئے اکساتا رہا۔ مگر اس میں اس کی غرض تھی۔ دراصل شائع کی کاروبار اور حویلی کے معاملات میں عدم دلچسپی کے باعث وہ اپنے کاندھوں پر پڑتی ذمہ داریوں سے گھبرانے لگا تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ تم واپس لوٹ آؤ۔ یوں بھی اسے علم ہوا تھا کہ تم اب بڑے آدمی بن چکے ہو اور تمہارے اب لوگوں میں بڑے تعلقات بن چکے ہیں۔ اسے یہی مناسب لگ رہا تھا کہ تمہارے لوٹ آنے سے' تمہاری واقفیت سے اسے کچھ سہارا مل جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمہیں بار بار فیض پور لوٹنے کی دعوت دے رہا تھا۔" نجم النساء بہت چالاکی سے آفاق الدین کی خواہش اور مقصد کو اپنے مطلب کے معنی پہنا کر سلطان کا ذہن بدلنے لگیں۔ سلطان لب بھینچے ان کی تمام باتیں سنتے چلے گئے۔

''مگر جو کچھ آفاق چاہتا تھا' میں نہیں چاہتی تھی۔ بیٹا میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری اس حویلی میں واپسی کسی غرض یا مطلب سے ہو۔ کیونکہ ایسا ہوتا تو پھر مطلب پورا ہوتے ہی یہاں کے لوگ تمہیں واپسی کا راستہ دکھا دیتے۔ اور میں چاہتی تھی کہ تمہاری واپسی ایسی ہو کہ پھر جانے کی کوئی راہ نہ بچے۔ اسی لئے تمہارے لوٹنے کی مخالفت کر رہی تھی۔'' نجم النساء نے نہایت مکاری سے پانسہ پلٹ ڈالا تھا۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ سلطان کی واپسی میں ان کا کوئی عمل دخل ہونے کے بجائے صرف آفاق الدین کی خواہش شامل ہو۔ ان کے تینوں بیٹے ایک ہوجائیں اور وہ پس منظر میں چلی جائیں۔ یہ انہیں کسی صورت گوارا نہ تھا۔ وہ اس حویلی کی چوہدرائن تھیں۔۔۔۔۔ حویلی کی کرتا دھرتا۔۔ ان کے بیٹوں پر ان کی حکمرانی تھی۔ مگر وقت نے اچانک تیزی سے پلٹا کھایا تھا اور انہیں کمزور کرنا شروع کر ڈالا۔ مگر وہ اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہ تھیں۔ ہاری بازی کو اپنی جیت میں بدلنا انہیں بہت اچھے طریقے سے آتا تھا۔ اور اس بار انہیں موقع خود انیسہ نے ترے میں سجا کر دیا تھا۔ جس سے اب وہ بھرپور انداز میں فائدہ اٹھانے والی تھیں۔

''دیکھو سلطان یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب تمہارے سامنے ہے۔ انیسہ نے حذیفہ کے کان بھر بھر کر اسے شمع سے رشتے کیلئے متنفر کر ڈالا ہے۔ شمع مجھے بہت عزیز ہے سلطان۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ انیسہ اور حذیفہ کی کم ظرفی کا شکار شمع بنے۔ اسی لئے میں نے آفاق اور شافع کے سامنے تمہارے بیٹے اور شمع کے رشتے کی بات کی۔ اگر یہ رشتہ ہو جاتا ہے تو تم اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ اس گھر میں بحیثیت مہمان نہیں بلکہ اس حویلی کے مالک کی طرح واپس لوٹ سکتے ہو۔'' وہ اب بڑی ہوشیاری سے سلطان کے دماغ سے کھیل رہی تھیں۔ ان کی بات پر سلطان نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ نجم النساء کے کہے گئے ایک ایک جملے کا انہیں بے انتہا وزن محسوس ہوا تھا۔

''اور ایسا نہیں سمجھنا کہ شمع کی بدنامی کے باعث میں تم سے تمہارے بیٹے کی قربانی مانگ رہی ہوں۔ شمع بہت معصوم اور پاکیزہ بچی ہے۔ شافع کی تمام جائیداد کی اکلوتی وارث ہے۔ عالیان سے شادی ہونے کی صورت میں شمع کا سب کچھ عالیان کا ہی ہوگا۔ آفاق یہ بات بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ تم دیکھ لینا وہ کسی صورت اس رشتے کیلئے تیار نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اور اس کی بیوی ہرگز نہیں چاہیں گے کہ تم اور تمہاری فیملی اس حویلی پر راج کریں۔'' نجم النساء نے اپنا چال چل دی تھی۔ اور یہ ایسی چال تھی کہ ہر حال میں جیت اُن ہی کی تھی۔

''میں آپ کی ساری بات سمجھ چکا ہوں اماں۔ ایک بار اس حویلی کو چھوڑ کر جانے کی غلطی کر چکا ہوں۔ دوبارہ نہیں دہراؤں گا۔ آپ شافع بھائی کو بتا دیجئے گا کہ میں عالیان اور شمع بٹی کے رشتے کیلئے راضی ہوں۔'' سلطان نے نجم النساء کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے سنجیدگی سے یقین دلایا۔ نجم النساء اپنا من چاہا جواب سن کر بے اختیار فاتحانہ انداز میں مسکرا اٹھیں۔ مگر ان کے کمرے کے باہر دروازے سے کان لگائے کھڑیں انیسہ بیاس کے ارادے اور سارا کھیل جان کر ششدر رہ گئیں۔

(باقی اگلے ماہ)

رگ و جاں سے آگے

نادیہ طاہر

آزادی ...... ہاں آزادی ...... ہر سو بس ایک ہی نعرہ سنائی دے رہا تھا ...... خون میں ڈوبی ہر لاش کی کہانی محض آزادی کے خواب لیے منوں مٹی میں سو جاتی ...... لیکن دشمن غالب تھا ایسے کہ ہر اہل زبان کو، ہر اہلِ ایمان کو موت کی نیند سلا دیا جاتا لیکن آزادانہ دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کرنے کا جذبہ اہل زبان کو زبان کٹوانے اور تمام اہل ایمان کو اپنے ایمان پر مرمٹنے پر فخر محسوس کروا رہا تھا ...... ہر سو جیسے ان دلوں میں سوگواری تھی ...... جیسے ہر طرف سے خون کی بو اٹھ رہی ہو اور ماؤں کے سینے درد سے چھلنی کر رہی ہو ...... وہیں بیٹیں بنجر آنکھوں سے باپ اور بھائیوں کی گھروں کو واپسی کی امید لیے کھلے دروازوں کو تک رہی تھیں ..

اس سب میں ایک نوجوان موسیٰ ابن حیدر جو لگ بھگ پچیس برس کا ہوگا ...... زخمی لوگوں کو طبی امداد فراہم کر رہا تھا ...... وہ سب آسان نہیں تھا کیونکہ غالب حکمران کافر تھے ...... ان کی طاقت مسلمانوں کو کمزور کر رہی تھی ...... مسلمانوں پر حملے آئے روز بڑھتے چلے جا رہے تھے جس کے باعث مرنے والے زیادہ اور دفنانے والے کم پڑنے لگے تھے ......

کافروں کی جانب سے یہ حملہ آج پھر کچھ روز بعد ہوا تھا جس کی وجہ ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کا آزادی کا مطالبہ کرنا تھا جہاں وہ سب اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں ...... جہاں سب پرنور صبح کے مناظر میں پھولوں کی کلیوں کو بے خوفی سے کھلتے دیکھیں ...... مردہ دل پھر سے زندگی کو محسوس کرنے لگیں ...... جہاں کسی ماں کو اپنے بیٹے اور بھائی کو اپنی بہن کی عزت کے داغدار ہونے کا خوف نہ ہو ...... جہاں بس امن ہو لیکن جب بھی وہ یہ خواب تعبیر دینے کو لب کھولتے تو ان کے اپنوں میں سے کسی کو مار گرایا جاتا اور اپنوں کو کھو دینے کا غم آزادی کی خواہش کو کہیں پیچھے چھوڑ دیتا ......

موسیٰ عام سی شکل و صورت کا بہادر نوجوان اپنی بہن کو دفنا کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا ان زخمیوں میں اس نے اپنی بہن کو بھی کھویا تھا ......

"آج مجھے واقعی لگ رہا ہے کہ میں نے اس جنگ میں سب سے خاص انسان کو کھو دیا ...... آج مجھے لگ رہا ہے گیتی کہ یہ آزادی کی جنگ جتنی مشکل لگ رہی تھی یہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے ......"

موسیٰ نے چہرے پر آتے آنسوؤں کو صاف کیا ...... اور پھر سے کہنے لگا۔

"میں تمہیں نہیں بچا سکا ...... مجھے معاف کر دینا ...... میں بھائی ہونے کا حق صحیح سے ادا نہیں کر سکا ......

مجھے افسوس ہے ...... دکھ ہے ...... یہ غم و غصہ شاید کبھی ہلکا نہ ہو ...... کبھی میں خود کو مطمئن نہ کر سکوں ...... لیکن تمہاری یہ قربانی ضائع نہیں ہوگی یہ وعدہ کرتا ہوں ......"

✦✦✦

زلیخا گھر کی منڈیر پر بیٹھی ٹانگوں کو مسلسل ہلاتی ماں کو تندور میں روٹیاں لگاتے دیکھ کر کہہ رہی تھی ......

"امی ...... جب ہمارا ملک مطلب پاکستان میں ہم ہوں گے ...... جسکی ہمارے قائد بات کرتے ہیں .. وہ مل جائے گا تو پھر بس آپ ہمارے لیے روٹیاں بنانا ...... ان ہندو لوگوں کے لیے نہیں ......"

وہ ایک ہندو گھرانے کی بات کر رہی تھی جہاں اسکی ماں خدیجہ کام کرتی تھی ...... وہ گھرانہ گوپال پانڈے کا تھا جو کہ کانگریسی لیڈروں میں سے ایک تھا اور جس کی آمدنی اچھی خاصی تھی۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا جب آپ ایسے اتنی گرمی میں ان کے لیے کام کرتی ہیں ......"

زلیخا اداس ہوئی تھی۔

"دعا کرو میری بیٹی وہ دن ہماری زندگی میں جلدی آ جائے ورنہ ان کافروں کا گند صاف کرنا ...... ان کے لیے نوالے تیار کرنا زندگی کو موت سے بدتر بنا دے گا ......"

"امی آپ روئیں نہیں ......" زلیخا منڈیر سے اتر کر ماں کے پاس آ گئی۔

"خودکشی حرام نہیں ہوتی تو شاید ہم اب تک حلال نیند سو چکے ہوتے لیکن ہمارے لیے تو ہمارے رب کا حکم سب سے پہلے ہے ......"

خدیجہ کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔

"امی ہم روئیں گے تو یہ لوگ ہمیں کمزور سمجھ کر ہم پر ہنسیں گے ...... گیتی آپی کہتی تھیں کہ ہم سب کو خود کو اندر سے مضبوط کرنا ہے اتنا کہ کافروں کی چالیں ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں ...... ہمارے مقصد میں ہمیں ہرا نہ سکیں۔"

"وہ کہتی تھیں امی کہ اگر ہم حق گوئی پر مر بھی جائیں ...... تو تو ذلت کیسی ...... تو پھر عزت سے کیوں نہیں مریں ...... ذلیل ہو کر کیوں؟ اگر اس سب سے ہم آزادی نہ بھی کر سکے حاصل تو کیا ...... اللہ کے سامنے تو ہم سرخرو ہو جائیں گے نا ......"

وہ اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کر رہی تھی شاید حالات نے کم عمری میں ہی بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

"ایسا ہوگا ایک روز میری بیٹی ...... ایسا ہوگا"

خدیجہ چھوٹی زلیخا کا جذبہ دیکھ کر فخر محسوس کرنے لگی ...... اس چھوٹی سی بچی میں کتنی تمنا تھی ...... کتنی لگن تھی کہ آزادی کو وہ حاصل ایک روز کر لیں گے لیکن کون اس ننھی دل کے سپنوں کو جان سکتا تھا سوائے ان کے جو اس قرب سے دوچار تھے ......

زلیخا کی آنکھوں میں ایک امید تھی جس نے اس کمزور پڑتی ماں کو بھی ہمت دلائی تھی کہ وہ دن جلد آئے گا جب ان سب کی خواہشات کے مطابق سب ہوگا کیونکہ وہ ذات کہتی ہے کہ وہ اپنے بندوں پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ...... وہ تنہا انہیں کیسے چھوڑ سکتا تھا وہ چہرہ ہمیشہ کی طرح سوچ کر بھیگ گیا تھا اور ہاتھ مسلسل مجبوری کی روٹیاں بنانے پر مجبور تھے۔

✦✦✦

"اٹھ جاؤ کب تک ایسے بازو کھلی آنکھوں پر رکھے سونے کا دکھاوا کرو گے ...... جانتی ہوں سو نہیں سکو گے ...... آج دس دن گزرنے کو ہیں گیتی کو مرے ...... اب تو سب کے لیے سب کچھ پہلے جیسا ہو چکا ہے ...... کانگریسی، لیگی سب اپنے کاموں پر لوٹ چکے ہیں لیکن ہم سب کھو چکے ہیں اس جنگ میں۔"

نوراں بی بی موسیٰ کو جگاتے پاس ہی بیٹھ گئی جسکی آنکھوں میں نمی دھر آئی تھی۔

"تمہیں کون کہتا تھا موسیٰ کہ اس سب میں بولو ...... بات کرو ...... ان سب کی امداد کرنے کو تو کوئی نہ کوئی آ جائے گا ...... لیکن ہمارا کیا ...... ہمیں تو کوئی نہیں پوچھنے والا ...... تم کیوں بھول جاتے ہو کہ ہم جس طبقے سے تعلق رکھنے والے ہیں جو مرتے ہوئے چیختا رہے گا لیکن مدد کو کوئی نہیں لیے کوئی نہیں آئے گا ...... تم کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایسے انسان کے بیٹے

کے لیے کرسیاں بناتا
ہو جوان گوروں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں بناتا
تھا... اور ایک روز ان ہی کے ہاتھوں کہاں
غائب ہوا معلوم نہیں.... اس کا قصور کیا تھا یہ
تک معلوم نہیں.... اس سب کے باوجود انہیں
کے خلاف محاذ پر کھڑے ہو گئے تم.... تو دیکھو
موسیٰ آج عزت سے بھی گئے"
ماں نے کہتے ہوئے بے بسی سے ماتھا

پیٹا۔ وہ ماں کی آخری بات کو برداشت نہ کر سکا تو
اٹھ بیٹھا۔ چہرہ غصے سے سرخ پڑ چکا تھا۔
"میرے سامنے بار بار یہ بات نہیں دہرایا
کریں میں یہ کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں آپ سے اور
ابا کا قصور حق پر آواز بلند کرتا تھا تو امید ہے وہ
اس دنیا سے اچھی جگہ پر ہی ہوں گے اور اگر
زندہ ہیں تو دعا کرتا ہوں کہ انہیں اللہ ان کافروں
کی غلامی سے موت دے دے" وہ کہہ کر لب
کاٹنے کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا وہ سب
کہنا آسان نہیں تھا۔
"حق بلند کرنے کا درس ہمیشہ ابا نے دیا تھا
وہ کبھی بھول نہیں سکتا میں چاہے اس کے لیے پھر
جان سے جاؤں یا عزت سے کوئی فرق نہیں پڑتا
مجھے وہ اپنی بات مکمل کرتا کمرے سے باہر نکل
گیا۔
اس گھر میں خوشی اب کہیں باقی نہیں
تھی۔ تھی تو فقط گھٹی گھٹی سی آہیں جو وہ اس
بضعیفی کو سر پر اوڑھے ماں کی تھیں۔

+++

کچھ روز پہلے کے غم ابھی تازہ ہیں جانتا
ہوں لیکن ہمیں اپنے انہیں زخموں کو بھرنے سے
پہلے ان کافروں کو یا تو موت کی نیند سلانا ہے یا
پھر خود کو اپنے وطن کے حصول کی خاطر شہید یا
غازی ٹھہرانا ہے تاکہ زخم بھر جائیں ناسور نہ

بنیں.... تو آپ میں سے کون کون ابھی بھی اس
جنگ کو جیتنے کے لیے میرا ساتھ دینا چاہتا
ہے.... ؟ کون ہے جو آج بھی اپنی آنے والی
نسلوں کے اچھے مستقبل کو بہتر بنانے کی خاطر اپنا
آج قربان کرنے پر آمادہ ہے.... ؟
اس نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی مسلمان
نوجوان کی جماعت کو دیکھتے ہوئے انہیں مزید
سمجھاتے ہوئے کہا۔
"اور میں موسیٰ ابن حیدر آپ سب کو اس
بات کا یقین دلاتا ہوں کہ مل کر کوشش کریں گے
تو کامیاب ٹھہریں گے ورنہ بکھر جائیں گے....
سب بٹ کر رہ جائیں گے اور ہماری اپنی ذات
کی کوئی حیثیت کسی کٹ پتلی سے بڑھ کر نہ ہوگی
ان سب کے لیے....
وہاں ہر کسی کے دل میں ایک جذبہ تھا کہ یا
تو مر جائیں گے یا آزادی پا لیں گے۔
"موسیٰ بھائی ہم سب آپ کے ساتھ ہیں"
وہاں موجود نوجوانوں میں سے ایک نوجوان اٹھا
اور اپنی رضامندی پورے جذبے سے ظاہر کی
اور اس کے پیچھے پیچھے سب نے آزادی حاصل
کرنے کے لیے اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔
"شاباش میرے ساتھیوں" "جانتے ہو
جب فتح مکہ کا وقت تھا تو بہت سی مشکلات سے
دو چار مسلمان پھر بھی اپنے مقصد پر قائم رہے
کیونکہ ان سب کو فتح اپنی جان و مال، اولاد سب
سے زیادہ عزیز تھی کیوں کہ ان کے پاس
ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد درکار
تھی۔ .... تو وہ گھبرائے نہیں بس وہ لوگ اپنے
خون میں تر وجود لیے حق کی راہ پر گامزن رہے
یہاں تک کہ کامیابی ان کا مقدر بنی تو ہمیں بھی
بس اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی باتوں
کو مدنظر رکھنا ہے ہمارا اس آزادی کے حصول کا

مقصد اپنے ایمان کی مضبوطی حقوق اللہ اور حقوق
العباد کی صحیح معنوں میں ادائیگی ہونا چاہیے..
جب اتحادی گروپ ہر حلقے سے نکلیں گے تو یہ
دل کے کمزور گورے، سکھ، ہندو سب ہم ایمان
سے مضبوط دلوں پر کبھی غالب نہ آ پائیں
گے.... سوچیں گے اگر کہ ہماری ذمہ داری
ہمارے گھر والوں کو آزادی دلانا ہے تو ہر گھر
آزاد ہوگا اور جب سوچیں گے ہمیں پوری قوم کو
آزاد دیکھنا ہے تو پوری قوم آزاد ہوگی...... بس
اس وقت ہمیں اپنے ارادوں اور سوچ کو مضبوط
بنانا ہے باقی مدد اللہ کی جانب سے ہوگی۔"
ہر کسی کی زبان سے ان شاء اللہ کے کلمات
ادا ہوئے تھے.... وہ سب واقعی ہی مضبوط
دلوں کے مالک تھے جو اپنی اور اپنوں کی جان
کی بازی لگا کر نسلیں سنوارنے نکلے تھے۔

+++

Muslims are not weak they are strong enough to beat us with their will power with their Unity so Gopal we have to take some actions together that can make them financially too weak".

ہربرٹ سامنے کرسی پر بیٹھا باہمت مسلمان
کے بار بار سر اٹھا کر آزادی کے لیے آواز بلند
کرتے دیکھ کر اپنے ہندوستانی ساتھی گوپال
سے کہہ رہا تھا۔
کیوں کہ وہ بڑی تعداد مٹھی بھر مسلمانوں کی
ایمان کی طاقت سے گھبرا گئی تھی اور وہ جانتے
تھے کہ موت جوان کے لیے سب سے بڑی سزا
تھی مسلمانوں کے لیے وہ جذبہ شہادت رکھتی
تھی.... اسی وجہ سے وہ اب انہیں مالی طور پر

کمزور کرنے اور فاقوں کی نوبت پر لانا چاہتے
تھے انگریز کی چپڑگری تو ہندو اور سکھ ہمیشہ سے
کرتے آئے تھے وہ تینوں قومیں دل ہی دل
میں ایک دوسرے سے بے زار اور ایک
دوسرے کی تباہی کی خواہشمند تھیں.... وہ سب
ان لوگوں کی فطرت میں شامل تھا ہندو اور سکھ
کو اپنی کامیابی انگریز کا ساتھ دینے میں لگ
رہی تھی تو ساتھ دیتے رہے اور وہیں انگریز دبے
قدموں ان کی جڑوں کو کاٹنے میں مصروف تھا۔
گوپال پانڈے نے ہمیشہ کی طرح سامنے
بیٹھے آدمی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

Yes; just a few days ago, we killed the members of their families to weaken them from within, but strangely, their demand for freedom is increasing day by day".

"(جی ہاں، ابھی چند دن پہلے ہم نے ان
کے خاندانوں کے افراد کو اندر سے کمزور کرنے
کے لیے قتل کیا تھا، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پھر
بھی ان کی آزادی کا مطالبہ دن بدن بڑھتا جا رہا
ہے۔)"
گوپال پانڈے نے ہربرٹ کی بات میں
اضافہ کیا جس کے بدلے میں ہربرٹ زور دیتے
ہوئے پھر کہنے لگا۔

That is why I am saying that they should be forced by the hands of their stomachs and hunger so that the word freedom is erased from their minds in

finding bread.

(اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ ان کو اتنا پیٹ اور بھوک کے ہاتھوں مجبور کر دیا جائے کہ روٹی کے لقمے تلاشنے میں ان کے ذہنوں میں سے آزادی لفظ ہی مٹ جائے)

ہربرٹ ظالمانہ انداز اپناتے کہہ رہا تھا جیسے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ امت مسلمہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا عطا......

گوپال پانڈے انگریز بات کو مزید سراہتے ہوئے گوپال پانڈے نے اپنا اور اپنے انگریز ساتھی کو ساتھ مزید مضبوط کرنے کے لیے اپنی مکاریوں میں ایک کیل اور ٹھونک دی جو ثبوت تھا اس بات کا کہ وہ کس قدر گری ہوئی قوم تھی۔

We'll go on doing as you s a y , Sir. You just order hinduwill also separate the , heads of these Muslims from the tan at your behest.

(آپ جیسا کہیں گے سر ویسا ہم کرتے جائیں گے آپ بس حکم کریں ہندو آپ کے حکم پر ان مسلمانوں کے سر تن سے جدا بھی کر دے گا۔)

گوپال پانڈے کے کہے الفاظ پر ہربرٹ کی گردن مزید غرور سے تن گئی تھی۔

✦✦✦

خواتین بھی سب بڑھ چڑھ کر اپنے مردوں کے شانہ بشانہ مسلم لیگ کے مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے کام کرنے لگی تھیں ...... کچھ خواتین اشتہارات اپنے ہاتھوں سے تیار کر رہی تھیں اور تیار کرنے کے لیے گروپ بندی کی گئی تھی...... ہر گروپ کی قیادت کے لیے ایک رہنما باہمت خاتون کو انتخاب کیا گیا تھا...... ایسے ہی مرد حضرات بھی گلی گلی نکل کر خاموشی سے آزادی کی لگن ہر گھر میں اجاگر کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے اور مثبت ردعمل ہر مسلمان گھرانے سے مل رہا تھا سب ساتھ دینے کو تیار تھے...... کیونکہ ہر کوئی آزادی کا خواہشمند تھا......

عورتوں نے اپنے دل کی آزادی کی حسرتوں کو قلم سے اشتہارات کا روپ دے دیا تھا یہ سب کاوشیں ایک بڑی کامیابی کا راز گنگنا رہی تھی ہر کسی کے دل میں اب نئے سرے سے امید بندھی تھی۔ وہ سب بہت پرامید تھے کہ اب کی بار امن کے حصول کی خاطر جنگ میں کامیابی اب کی بار حاصل کرلیں گے۔

✦✦✦

زلیخا نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اور یہی حال اس کے بھائی حمزہ اور باقی سب مسلمانوں کا تھا انگریز کی چال نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ سب مسلمان مرد و خواتین کو ایک وقت کی روٹی کی خاطر جانے کتنے مصائب سے گزرنا پڑ رہا تھا کیونکہ ان سب کافروں کے گٹھ جوڑ نے انہیں ہر طرح کے روزگار سے محروم کر دیا تھا بچے بھوک سے بلکنے لگے تھے لیکن مسائل تھے کہ بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے مسلمانوں کی جانب سے قائدین نے آواز بلند کی لیکن وہ کہیں بہت پیچھے دب کر رہ گئی۔

''امی حمزہ چھوٹا ہے مجھے بھوک لگی ہے لیکن میں برداشت کرلوں گی لیکن اس سے تو نہیں ہوگی اس کے لیے مریم باجی سے کچھ پوچھوں؟ شاید مل جائے۔''

وہ تیسری دفعہ دن میں یہ بات ماں سے پوچھ چکی تھی......

ماں جو ہندو گھرانے میں کام کرتی تھی وہاں سے نکال دیے جانے کے بعد بالکل بے بس ہو چکی تھی وہ ان دونوں بچوں کی واحد کفیل تھی آج

دوسرا روز تھا کہ گھر کا راشن ختم ہو چکا تھا سب ایک دوسرے کی کئی روز سے مدد کر رہے تھے۔ اگر ایک گھر میں سے راشن ختم ہو جاتا تو اپنے برے وقت کی پرواہ کیے بغیر سب ایک دوسرے کی مدد کے لیے دوڑتے اور اپنا راشن مسلمان بہن بھائیوں سے بانٹ لیتے لیکن اب سب کے حالات تقریباً ایک جیسے ہونے لگے تھے۔

''نہیں پہلے ہی دو روز سے وہ بیچاری ہمارے گھر کھانا دے جاتی ہے آج نہیں دے کر گئی تو مطلب یہی ہے نا کہ وہ بھی ہمارے جیسے ہی دن گزار رہی ہوگی......''

کچھ سوچ کر خدیجہ نے دوپٹہ سر پر اوڑھتے ہوئے کہنے لگی

''حمزہ سو رہا ہے تو زلیخا بھائی کے پاس ہی رہنا اندر سے دروازہ بند کرلو میں کچھ دیر میں آتی ہوں......''

''آپ کہاں جا رہی ہیں''

زلیخا نے معصومیت سے پوچھا جس کا چہرہ بھوک کے مارے ماند پڑ چکا تھا۔

''زندہ رہنے کے لیے کچھ کھانا ضروری ہے اور کھانے کے لیے شاید میری دعائیں اثر کھو چکی ہیں''

وہ بے حد مجبوری کے عالم میں نہ جانے کیا بولتی جا رہی تھی شاید اسے خبر نہ تھی کی ناامیدی اپنی جگہ اس کے دل میں بنا رہی تھی...... وہ جیسے اللہ سے شکوہ کر رہی ہو لیکن وہ امتحان لیتا بھی ہے تو ایمان والوں کا اور اس کا امتحان شاید ابھی باقی تھا۔

خدیجہ دروازے کو باہر سے تالا لگا کر جا چکی تھی اور پیچھے سے زلیخا نے بھی ماں کی ہدایت کے مطابق دروازے کی چٹخنی چڑھا لی تھی۔

✦✦✦

گھر میں احمد اکیلا تھا وہ نوجوان مسلم لیگ کی اتحادی گروپوں میں سے ایک لیڈر تھا......

کچھ روز پہلے کانگریس اور مسلم لیگ لیڈروں میں مسلمانوں کے لیے روزگار کے ذرائع فراہم کرنے پر بات ہو رہی تھی جو گفتگو بحث کا رخ اختیار کر گئی بات بڑھتے بڑھتے گھروں تک آن پہنچی......

کچھ روز تو احمد کا مسلسل پیچھا کروایا جاتا رہا جس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے ڈرایا جا رہا تھا کہ وہ خاموش ہو جائے......

آج احمد کو گھر سے نکلتے جیسے ہی دیکھا تو وہ اس کے جاتے ہی گھر میں گھس آئے......

''تم...... تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

احمد نے مخالف پارٹی کے لوگوں کو اپنے گھر میں دیکھا تو ڈرے بنا وہ بہادری سے پوچھنے لگا لیکن وہ ان کا مقصد جانتا تھا وہ سوچنے کے لیے حل تلاشنے چاہتا تھا تو سوال کرنے لگا۔

''بتائیں گے ابھی بیٹھنے تو دو احمد بابو'' ان دونوں میں سے ایک بولا۔

''میری بات سنو میں پارٹی چھوڑوں گا نہیں تو گفتگو کو طول دینے کا فائدہ نہیں اور یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے کسی کے گھر آنے کا'' احمد کو لگا وہ پہلے والے موضوع پر ہی زور دینے اسے دھمکانے آئے ہوں گے تو وہ صاف صاف کہنے لگا۔

''ارے بھئی اتنی بھی کیا جلدی ہے ہم تو تم کو دنیا سے اٹھانے آئے اور تم ہو کے ابھی بھی اسی بات پر ہو'' دوسرا جس کا نام کرشنا تھا بولا اور اچانک چاقو سے وار احمد کی گردن پر کیا لیکن احمد نے پھرتی سے پاس پڑا چاقو کو رخ اس کے دوسرے ساتھ کی جانب موڑ دیا جو چاقو آنکھ میں لگنے کے باعث درد سے تڑپتا چیخنے لگا۔

جوابی حملہ پھر سے کرشنا کی جانب سے ہوا

تھا جس نے قریب ہی پڑی لوہے کی راڈ احمر کے سر پر زور سے دے ماری اور وہ زمین پر لہو میں لت پت گر پڑا۔
کرشنا اپنے ساتھی کو لے کر فرار ہو رہا تھا وہاں سے جب گھر سے نکلتے انہیں احمر نے دور سے دیکھا...
"رکو...... رکو......" وہ دور سے چیختا دوڑا تھا گھر کی جانب......
احمر کے قدموں کی رفتار بہت تیز تھی لیکن جب وہ پہنچا تو احمد اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا...
"بھائی......... تم میرے ساتھی تھے۔ تم کیوں مجھے تنہا چھوڑ گئے؟......
میں ان کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں ضرور تمہاری موت کا بدلہ ان کافروں سے لوں گا۔ میں انہیں نہیں چھوڑوں گا......"
وہ بے بسی سے اپنی بھائی کی میت پر آنسو بہاتے کہہ رہا تھا۔
اس قوم کا ایک اور شیر جوان اپنی جوانی اپنے وطن اور وطن کے لوگوں کے حقوق کے حصول کی خاطر قربان کر چکا تھا۔

+++

گھر میں جو راشن باقی ہے اسے ایسا کریں امی کچھ خود کے لئے رکھ لیں اور باقی تھیلے میں ڈال دیں۔ میں تو پھر کچھ نہ کچھ کر کے آپ کو یا خود کھا لوں گا لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا کوئی نہیں"... نوراں بی بی نے موسیٰ کے کہنے پر گھر میں جو باقی سامان تھا وہ تھیلے میں ڈال کر بیٹے کو تھما دیا
"میں ہمیشہ تم سے کہتی رہی کہ رک جاؤ ان کا ساتھ دینا چھوڑ دو۔ انگریزوں کے کہنے پر کرتے جاؤ جیسا وہ کہتے ہیں۔ کم از کم جان تو سلامت رہے گی لیکن آج یہی ماں تم سے کہتی ہے کہ جاؤ بیٹا اگر تم میری واحد محبت واحد اثاثہ اپنی جان بھی اس وطن کی خاطر لوٹا دو تو مجھے تم پر، خود پر فخر ہوگا کہ جب میرے دین کے چھوٹے سے چھوٹے بچے نے اپنے ایمان کی خاطر، تمہارا اور تمہارے قائدین کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ اس حالت میں بھی کہ ان کے گھر میں کھانے کے لیے ایک وقت کی روٹی میسر نہیں۔ اور انہوں نے ان کافروں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تو بھلا میں اس قدر خود غرض کیسے ہو سکتی ہوں جس کا شیر جیسا بہادر بیٹا اس کے ساتھ ہر قدم پر کھڑا ہے۔"
نوراں بی بی کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا......
وہیں موسیٰ ابن حیدر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے...... وہ ایک اور کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا کیونکہ فتح کے لیے دلوں کو فتح کرنا ضروری تھا دلوں کا ایک دوسرے کے لیے جذبہ ہمدردی ہونا ضروری تھا...... سب سے بڑھ کر اللہ کی ذات پر پختہ یقین کا ہونا لازم تھا۔
"مجھے خوشی ہے امی کہ آپ میرے لیے ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کر رہی ہیں مجھے ابو کی کمی آج محسوس نہیں ہو رہی کیونکہ میں میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ چاہے ابو ہمارے لیے مالی اسباب زیادہ پیدا نہ کر سکے لیکن وہ ہمیں دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ دے کر گئے ہیں...... حق گوئی سکھا کر گئے ہیں جذبہ حب الوطنی سے سرشار کر کے ہم کو غلط کا منہ توڑ جواب دینا سکھا گئے الحمدللہ حق بلند کرنا سکھا کر گئے ہیں۔ آج میں واقعی بہت خوش ہوں امی"
وہ بچوں کی طرح ماں سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

+++

دروازے پر دستک ہوئی اندر سے ایک دس سالہ بچہ باہر نکلا۔
"تم آج پھر آ گئی تمہیں اس روز ماں نے کہا تھا کہ آج کے بعد کام کے لئے یہاں نہیں آنا تو آج پھر کیوں آ گئی ہو؟"
"میں کام کے لیے نہیں آئی مجھے اپنی محنت کی رقم چاہیے جو ابھی باقی ہے میری تنخواہ میں سے وہ لینے آئی ہوں پیچھے ہٹو یا اپنی ماں کو باہر بلاؤ۔"
خدیجہ پورے اعتماد سے دوٹوک الفاظ میں کہہ رہی تھی اس کے چہرے پر کسی قسم کا خوف نہ تھا "کیوں ہٹوں میں پیچھے؟ اور ویسے بھی میری بات سنو تمہیں اب یہاں سے کوئی رقم نہیں ملنے والی......"
وہ لڑکا جو اپنی عمر کے مقابلے میں قینچی کی طرح زبان چلا رہا تھا اس کے عقب سے اس کی ماں پوچھتے اس کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔
"کون ہے؟"
"ماں کام والی آئی ہے...... پیسے لینے" لڑکے نے ناک چڑھا کر خدیجہ کو دیکھتے ہوئے ماں کو بتایا۔
"بیٹا اندر جاؤ اس سے میں خود بات کر لوں گی ابھی تمہارے پاپا آج خاص کر تمہارے لیے مزے کی جلیبی لائے ہیں تم وہ کھاؤ جا کر"
وہ آخری جملہ خدیجہ کی جانب دیکھ کر بول رہی تھی جیسے وہ اس کو جلانا چاہ رہی ہو لیکن خدیجہ کے چہرے پر خود اعتمادی برقرار تھے۔
لڑکا چلا گیا تو خدیجہ نے پھر سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔
"اپنے پیسے تم مانگنے آ گئی لیکن میرے قیمتی برتنوں کا کیا جو تم نے دو ماہ میں توڑ ڈالے سب؟"
وہ عورت سینے پر ہاتھ باندھے کہہ رہی تھی۔
خدیجہ کا حیرت اور بے بسی سے منہ کھل گیا......
"میں نے کب کون سا برتن توڑا اور یہ جھوٹ کیوں بول رہی ہو اس لیے نہ کہ تم پیسے نہ دو مجھے؟"
"ہاں یہی سمجھ لو" وہ ہندو خاتون پوری ڈھٹائی سے کہہ رہی تھی۔
"جھوٹ بولنا تو تم کافروں کی نس نس میں ہے جھوٹ نہیں بولو گے تو معلوم کیسے ہوگا کہ تم کافر ہو۔" وہ ہر لفظ چبا چبا کر کہہ رہی تھی کہ جیسے بچوں کی بھوک کے سامنے اسے ہر بات کا خوف مر چکا تھا کہ اس سب کے بعد وہ اسکے ساتھ کیا کریں گے......
"تم جیسوں پر تو میرا اللہ لعنت بھیجتا ہے سوچو ہمارے پاس تو وہ ذات ہے جو ہمیں ان حالات میں بھی سنبھال لے گی...... اور اگر مر گئے تو اس سے بہتر سے نوازے گی لیکن تم لوگ جب انجام کو پہنچو گے تو کون ہوگا جو تمہاری خبر لے گا" ہندو خاتون کو خدیجہ کا ہر جملہ لال پیلا کر رہا تھا۔ آخری جملہ آخری کیل ثابت ہوا تھا وہ چیخ اٹھی تھی۔
"جیتو کے پاپا جلدی باہر آنا ذرا۔ اس کام والی کو اس کی اوقات یاد دلانی ہے اور اب تم دیکھو تمہارے ساتھ ہوتا کیا ہے" وہ ہندو عورت خدیجہ کو دھمکی دے رہی تھی لیکن خدیجہ کسی قسم کی پرواہ کیے بغیر پھر سے بولنے لگی۔
"آج میں تمہیں اپنی بقیہ رقم اپنے بچوں کا صدقہ سمجھ کر تمہارے اس جیتو کے لیے دیتی ہوں۔" وہ کہہ کر وہاں سے تیز تیز قدم بڑھاتی گھر کو لوٹ آئی اور پیچھے اس ہندو گھرانے میں خدیجہ کی زبان درازی کا تذکرہ اسے بھگتنے پر باتیں ہو رہی تھیں۔

+++

مسلم لیگی کارکنان کی کانگریس اور دوسری جماعتوں سے معاہدے کے بعد مسلمانوں کو ان کے برابر کے حقوق دیے جانے پر زور دیا گیا تھا... جس میں مسلم لیگی قائدین نے مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ رویہ اپنانے پر زور دیا۔

انگریزوں کی برصغیر آمد کے بعد نظام جمہوریت کو فروغ ملا اور اکثریت والی قومی غالب آنے لگیں کیونکہ مسلمان برصغیر پاک و ہند میں کم تعداد میں تھے تو حکومت میں مسلمانوں کا حصہ بھی کم تھا جس کے باعث ان کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ برتا جا رہا تھا۔ ہر لحاظ سے ان کو کمتر سمجھا جاتا۔

اب ہر حلقے میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور تھا جو اپنے ہی مسلمان بہن بھائیوں کے دکھوں کو کم کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہا تھا۔ کہیں ان دنوں میں اقبال کی ولولہ انگیز شاعری، تو کہیں سرسید کے ہمت بڑھاتے الفاظ، تو وہیں قائد اعظم کی دن رات کی محنت سب مل کر عام لوگوں کو مضبوط بنا رہے تھے۔ ایسے ہی ان عام لوگوں میں گمنام سپاہیوں میں شامل موسیٰ ابن حیدر بغیر کسی مفاد کے وہ سب کر رہا تھا جو ساتھی مسلمان بہن بھائیوں کے لیے بڑے بڑے لیڈر نہیں کر پاتے۔ جو اپنے منہ کے نوالے کو کسی اور کے گھر کی ایک مسکراہٹ پر قربان کر دیتا۔ وہ سب کی خوشیوں کی خاطر اپنا سب دان کر رہا تھا۔

+++

خدیجہ گھر لوٹی تو بھوک پہلے کی طرح ویسے ہی محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ حمزہ اب بھوک کے مارے رونے لگا تھا دروازے پر دستک سنائی دی۔ زلیخا نے دروازہ کھولنے کے لیے قدم بڑھانے کی تو ماں نے ان دونوں بچوں کو سینے سے لگا لیا۔

"نہیں دروازہ نہیں کھولو۔ ادھر آ جاؤ میرے پاس زلیخا یہاں آؤ۔"

وہ دونوں کو بار بار اپنی طرف بلانے لگی۔ دروازے پر دستک مسلسل ہو رہی تھی خدیجہ نے ہمت کی اور دونوں بچوں کو کمرے میں چھوڑ کر صحن عبور کرتے دروازے تک آ گئی۔

کپکپاتے ہاتھوں سے دروازے کھولنے سے پہلے چھوٹے سوراخ میں سے خدیجہ نے جھانکا......

وہاں اس کے خوف کے برعکس موسیٰ ابن حیدر کھڑا دکھائی دیا۔

اس نے اطمینان بھرا سانس خارج کیا اور دروازہ کھول دیا۔

کیا ہو گیا باجی؟ بہت دیر لگا دی دروازہ کھولنے میں کب سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کیا ہوا سب ٹھیک ہے نا؟ موسیٰ نے جب خدیجہ کے چہرے کا اُڑا ہوا رنگ اور اسے پسینے سے شرابور دیکھا تو وہ پریشانی سے پوچھنے لگا اور ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ بچے صحیح سلامت تھے یا نہیں......

تبھی وہ دونوں موسیٰ بھائی موسیٰ بھائی پکارتے اس کی جانب دوڑے......

ارے میرا شیر کیسا ہے؟ بہت کمزور لگ رہے ہو۔ دیکھو حمزہ آج موسیٰ بھائی کیا لایا ہے تمہارے لیے......"

ہاتھ میں پکڑے تھیلے کو ان دونوں کی جانب بڑھا دیا جس میں کچھ کھانے پینے کا سامان تھا جس کو دیکھ کر خدیجہ کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے۔ وہ کب اکیلا چھوڑتا تھا۔ وہ کب اپنے بندوں سے انجان رہتا تھا۔

خدیجہ نے اپنے رب کا بے حد شکر ادا کیا اور پھر موسیٰ کا......!

اور اسے کہنے لگی......"واقعی تم ایک فرشتہ صفت انسان ہو۔ میں جتنا شکریہ ادا کروں اتنا کم ہے۔"

نہیں ایسا نہیں کہیں باجی اور شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے آج اگر گیتی زندہ ہوتی تو وہ بھی آپ کو ان حالات میں نہ دیکھ پاتی۔ اپنے منہ کا آخری نوالہ بھی وہ زلیخا کے نام کرتی۔ سمجھ لیں آپ کی اس محبت کا دوستی کا قرض اتار رہا ہوں۔ جو آپ نے کبھی گیتی سے کی تھی۔ شاید وہ اپنے بھائی کو ایسے ہی معاف کر دے۔"

بچے بھوک کے ستائے ہوئے تھے تو ماں سے مسلسل کچھ بنانے کا کہنے لگے اور شاید موسیٰ ان کی خوشی سے دنیا جہاں کی خوشیاں خرید چکا تھا۔

+++

ایگری منٹ کے بعد مسلمانوں کو منصفانہ حقوق دینے کی بات منظور ہوئی تو مسلمانوں کے مالی حالات بہتر ہونے لگے سب کے لئے سب نارمل ہونے لگا مسلمانوں کے دل امن کے ایام میں بھی بے چینی میں بسر ہونے والے زندگی کے تلخ دنوں میں سے تھے۔ انہیں جہاں امید کی نئی کرن نظر آنے لگتی وہی سب امیدیں دم توڑ جاتیں۔

مگر اس بار کچھ تھا جو بہت خاص تھا جس سے مسلمانوں کو واقعی محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ وقت جلد آئے گا جب سب غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر دوڑیں گے اپنے وطن کی سرحد عبور کرنے کو... وہ لمحہ ان سب کی سر توڑ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ 1940 کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی...... جو جو کامیابی کے زینہ تھی...... وہ سب خوشی کے نعرے لگانے میں سرگرم تھے۔

لیکن وہیں موسیٰ ابن حیدر جیسے نوجوان ان کو ابھی بھی وعدوں سے مکرتے غالب حکمرانوں سے مکاریوں کی اٹھتی بو دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اسے راتوں کو بھی سونے نہیں دے رہی تھی...... وہ سب جانتا تھا کہ ابھی وہ بہت سی جانوں کا لہو وہ پاک دھرتی مانگ رہی تھی...... وہ سب ویسا ہونے کو نہیں تھا جیسا وہ سب دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پانا اتنا آسان نہیں تھا جتنا دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی بہت سوں کو اپنوں کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ دینا باقی تھا۔ جیسے جیسے قرارداد کے دن قریب آتے جا رہے تھے اس کی بے چینی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

+++

"میری آنکھیں نم ہیں اور اور دل سکون کا متلاشی ہے۔ جب سے بھائی کھویا ہے تب سے بے چینی اندر گھل گئی ہے۔ اس کی جان کا بدلہ رات بھر مجھے سونے نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ میں میں ایک روز ضرور اس کا بدلہ لے لوں گا اور شکست دوں گا ان کو۔ مجھے معلوم ہے میری ان آنکھوں نے میرے بھائی کو آخری سانس کے لئے جدوجہد کرتے دیکھا تھا وہی آنکھیں ایک روز اس کے قاتل کو مجھ سے زندگی کی بھیک مانگتے بھی دیکھیں گی۔

مجھے لگتا ہے کہ وہ دن قریب ہے جب میرا دل سکون پا لے گا اور آسمان سے میرے لیے سواری آئے گی......اور......اور میں بخوشی اس دنیا کو الوداع کہہ دوں گا۔"

احمر دنیا سے لاتعلقی ظاہر کرتے بس سامنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کھلکھلا کر ہنستے ایک ہندو کو غصیلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا......جس کا نام کپور تھا...... آنکھیں بے بسی کے باعث ضبط کے مارے سرخ پڑ رہی تھیں..

"یہ میرے ہاتھوں مرے گا"......اس نے پھر سے کہا۔

پاس کھڑے موسیٰ نے اسے تسلی دی۔

"سب ہو گا...... جیسا تم چاہتے ہو۔ ان

آنکھوں سے سب کی ہار کو دیکھو گے اور دل بھی سکون پا لے گا…… ہر کوئی تمہاری اس کامیابی کو دیکھے گا بھی لیکن ابھی اس یہ وقت صحیح نہیں ہے احمر……‘‘

کرشنا اس وقت کسی سے بات کرتے ہوئے مسلسل قہقہہ لگا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ احمر کے ہر غم کو تازہ کر رہی تھی۔ اس کے بھائی کے کھو جانے کا درد اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ وہ اس پر ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا پر ہر بار موسیٰ اسے روک لیتا۔

’’تمہیں کیا لگتا ہے مجھے غم نہیں ہے کہ میں نے سب کھو دیا..؟ کیا میرا دل چھلنی نہیں ہے؟ کیا لگتا ہے کہ موسیٰ عزتوں کی نیلامی پر چپ رہے گا؟ نہیں وہ دن جب آزادی ہمارا مقدر بنے گی۔ جب ہم سب آزاد وطن میں پہنچیں گے اور سیاہی چھٹ جائے گی۔ مسلمانوں کی آزادی کا شور پوری دنیا میں سنے گی اور چیخ چیخ کر ہماری فتح کے جشن کافروں کے کانوں تک جا پہنچے گا تب ہم اپنا بدلہ لے لیں گے۔ تب فتح ہماری ہو گی……بس ہماری۔‘‘

’’کیا ایسا ہوگا موسیٰ بھائی؟‘‘…… ایسے جیسے احمر دل کو اسکی باتوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’ایسا ہوگا احمر... مجھے یقین ہے…… میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ سب اپنوں کے بغیر بہت ادھورا ہوگا لیکن وہ دن جنت میں داخل ہونے جیسا ہوگا بھائی۔ اس مٹی کی خوشبو ہی الگ ہوگی جو ان سب کے منہ پر زوردار تھپڑ کی طرح ہوگی جو یہ کبھی بھول نہیں پائیں گے……‘‘

آخری جملہ موسیٰ نے سامنے بیٹھ کر باتیں کرتے کرشنا کو دیکھ کر کہا تھا۔

’’ہاں ان شاءاللہ ایسا ہوگا۔‘‘ احمر دانت پیستے بے حد ضبط کرتے کہہ رہا تھا

+++

سالوں گزرنے کو تھے۔ آزادی کے دن قریب تھے۔ وہ مبارک دن قریب آن پہنچا تھا سب بے حد خوش تھے…… وہ سب امیدیں رنگ لانے والی تھیں جو سب کی ایک جیسی تھیں……

کچھ لوگ آزادی کے دن کو دیکھنے سے پہلے ہی آزادی کی خواہش کو دل میں لیے دنیا فانی سے کوچ کر چکے تھے جبکہ باقی لمحہ لمحہ اس دن کے انتظار میں تھے۔ یہ سات سال جیسے سب سے زیادہ قید میں گزرے تھے۔ کیونکہ جب کسی چیز کو پا لینے کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا جاتا ہے تو ایک ایک سیکنڈ گزار پانا محال ہونے لگتا ہے اس وقت مسلمانوں کے حالات بھی اس سب سے مختلف نہ تھے……

زلیخا اور حمزہ کافی بڑے ہو چکے تھے لیکن عمر کے بڑھنے کے ساتھ ان دونوں کی اپنے خود کے وطن سے محبت بھی پروان چڑھتی گئی تھی……

’’آپی تم سب سے پہلے پاکستان میں جا کر کیا کرو گی؟‘‘

حمزہ نے کھانا کھاتے زلیخا کو دیکھ کر پرجوش ہو کر سوال کیا۔

آج کل ہر گھر میں میں صرف آزادی کے چرچے تھے۔ ہر وقت ہر کسی کی بات آزادی سے شروع ہو کر آزادی پر ہی ختم ہو جاتی۔ ہر کوئی سوچتا کہ آخر میں وہاں پہنچیں گے تو کیا کریں گے…… وہاں پہنچیں گے تو زندگی کتنی خوبصورت ہوگی…… کوئی ان خوابوں کو جینے کی کوشش میں تھا جو اس غلامی میں دیکھے تھے……

زلیخا جس نے ہر لمحہ بس پاکستان کے لیے ہی تو خواب دیکھے تھے…… جب سے خواب دیکھنے شروع کیے تو جس زبان اور دل سے آزادی کی تمنا کی۔ اپنے رب سے اس نے جب بھی مانگی اپنی ماں کی اور اپنے مسلمان بھائی بہنوں کی آزادی کی خاطر پاکستان مانگا تھا……

وہ مسکراہٹ کو چہرے پر سجائے بولی……

’’پتہ ہے جب میں اس مٹی پر قدم رکھوں گی نہ حمزہ تو قدم رکھنے سے پہلے اس مٹی کو چوم لوں گی اور اس کی خوشبو کو اپنے اندر اتار لوں گی تا کہ میں کبھی اس احساس کو بھول نہ پاؤں۔ ممکن ہوا تو میں اس مٹی کو مٹھیاں بھر بھر کر اس قبر تک پہنچاؤں گی جو اس کی خواہش لیے اس دنیا سے چلی گئی۔ میں اس زمین پر سجدہ ریز ہو جاؤں گی…… میں اپنے ہر خواب کو تکمیل دوں گی۔ وہاں کوئی نہیں ہوگا جو ہمیں روکے گا۔ کسی کے لیے ای کو کام نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ وطن جہاں سب بس ایک دوسرے کا بھلا چاہیں گے۔ کو کوئی کسی تکلیف نہیں دے گا۔ میں خود کو سب سے خوش قسمت جانوں گی کے میں اپنے وطن کی کھلی فضا میں سانس لے سکی۔‘‘

وہ کہتے ہوئے ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھی۔ ایک برسوں کی خواہش تھی جو اس کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ جو اب پورے ہونے کو تھی جو برسوں سے اس کے ساتھ پروان چڑھی تھی۔

حمزہ نے ایک نوالہ روٹی کا توڑ کر سالن میں ڈبویا اور پھر زلیخا کے منہ تک بڑھایا……

’’اور آپی جانتی ہو۔ میں کیا کروں گا؟‘‘

وہ جو اپنی ہی دنیا میں کھوئی کہے جا رہی تھی اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی

’’کیا؟‘‘

زلیخا نے کہہ کر حمزہ کا اپنی جانب بڑھایا ہوا نوالہ منہ میں ڈال لیا……

’’میں ان سب کا سہارا بنوں گا جو یہاں سب اپنے کھو کا جا رہے ہیں…… بالکل موسیٰ بھائی کی طرح میں ان کا ساتھ دوں گا تا کہ سب مل کر ان لمحوں کو جی سکیں۔ میں وہ سب کروں گا موسیٰ بھائی کرتے ہیں……‘‘

دونوں بھائی بہن کی باتوں کو سنتے ہوئے خدیجہ کی نظروں کے سامنے سے ان کے باپ کا چہرہ آ کر گزر گیا۔ وہ دونوں کہاں جانتے تھے کہ ان کا باپ بھی اسی مٹی کے حصول کی جدوجہد میں مارا گیا تھا اور اس کی قبر کہاں تھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ نم ہوتی آنکھوں کو کپڑے سے رگڑ کر رہ گئی۔

+++

آزادی مبارک، آزادی مبارک، کے نعرے ہر طرف سنائی دے رہے تھے…… ہر طرف خوشی کا سماں تھا…… الحمدللہ کے کلمات ہر زبان سے جاری تھے……. سب ہجرت کے لئے تیار تھے۔

قافلہ در قافلہ ہجرت جاری تھی سب بستیاں مسلمان کی خالی ہونے کو تھیں…… انگریز ہندو سکھ سب اپنے اپنے مقاصد میں کہیں ناکام تو کہیں کامیاب ہوئے تھے انگریز کب کا برصغیر چھوڑ کر بھاگ چکا تھا…… کیونکہ وہ جانتا تھا کچھ بھی اب ان کے فائدے کا باقی نہیں رہا تھا وہاں……

لیکن حاسد سب چھوڑ سکتا ہے لیکن کبھی حسد کرنا نہیں چھوڑ سکتا۔

اس بستی میں گھر سے نکلتے افراد پر اچانک حملہ کیا گیا تھا…… جگہ جگہ آگ لگا دی گئی تھی…… آگ تھی کے بہت زیادہ بڑھنے لگی تھی۔ کہ وہاں سے نکل پانا مسلمانوں کے لیے ناممکن ہونے لگا تھا۔

معصوم بچے کچھ وہیں دم توڑ چکے تھے…… تو کچھ لوگ آخری لمحات میں بھی آزادی حاصل نہ کر پائے۔

''بھائی حمزہ بھاگو، نکلو یہاں سے، میں نہیں
چاہتی کہ ہم سب مرجائیں۔ ہم میں سے کوئی بھی
اس وطن کو نہ دیکھ سکے۔ وہ بے پناہ دھوئیں کی
وجہ سے بمشکل بول پارہی تھی اور وہ آگ ماں
اور بیٹی کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔ زلیخا کو
نکال پانا جیسے ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی
میں آزادی کو کبھی نہیں دیکھ سکے گی اس نے کبھی
نہیں سوچا تھا...... اسا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا
کہ وہ اپنے وطن کی مٹی کو کبھی اپنے ہاتھوں سے
چھو نہیں پائے گی......

''میں...... چاہتی ہوں...... کہ......''
وہ بمشکل سانس لیتے کہہ پا رہی تھی۔
''میرا ہر...... خواب تم...... حمزہ......
پورا کرے...... آپ کریں۔''
''جائیں...... چلے......''
وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی......

''ایسے کیسے چھوڑ دوں ماں اسے بچانے کی
سرتوڑ کوششوں میں لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ
اسکو بچانے کے لیے خود آگ میں کود جاتی زلیخا
دم توڑ چکی تھی...... وہ زمین بوس ہو گئی تھی......
خشک ذروں کی خاموشی چیخ چیخ کر یہ کہہ رہی ہے
امر تیرا خون ہوا ہے، جس کو میں نے سمو لیا ہے
آس پاس سے گزرتے لوگ ماں بیٹے کو
زبردستی وہاں سے ان کی جان بچاتے ساتھ لے
جا رہے تھے......

زلیخا کا دل آزادی کی دل میں ہزاروں
تمنائیں لیے باقی چہروں کی طرح آج اس دنیا
کو الوداع کہہ چکا تھا...... لیکن ایک عجیب سی
مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ جو کہ
اپنوں کی آزادی کی تھی۔ خود کی اس دنیا سے
آزادی کی......

+++

موسیٰ پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ وہاں سے
زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو صحیح سلامت نکال
لے جائیں لیکن آگ کی شدت اور آگ لگانے
والوں کے حملے بڑھتے چلے جارہے تھے...... وہ
سب مل کر گروہ کے گروہ اس بستی میں سے
نکال رہے تھے......

''حمزہ زلیخا کدھر ہے؟''
پاس سے گزرتے ہیں حمزہ اور خدیجہ کو دیکھ
کر موسیٰ نے پوچھا جس کے چہرے پر آگ
سے اور اپنوں کے جلتے جسم سے اٹھتے دھوئیں کی
سیاہی جمی ہوئی تھی۔

حمزہ کے چہرے پر آنسو رواں تھے خدیجہ کو
سہارا دیتی مریم اپنے ساتھ لے جارہی تھی......
خدیجہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔
وہ گھر سے باہر نہیں نکل سکی تھی جب جب
آگ نے اسے چھو لیا اور وہ اسی خاک کے نام
ہوگئی۔ وہ جل گئی ان وطنوں کے حصول میں لگی
آگ میں...... وہ جل گئی...... وہ مسلسل روتے
کہہ رہا تھا!

موسیٰ کے لیے سب سن کر یقین کر پانا بہت
مشکل تھا......

''میرے اللہ رحم یا اللہ ہمیں صبر دے''
وہ ایک لمبی سانس خارج کرتے صبر مانگ رہا
تھا وہ سب کس قدر تکلیف دے تھا...... اپنوں کو
چھوڑ کر یوں جانا بے حد مشکل تھا۔ وہ جانتا تھا۔

''ہمیں نکلنا ہے یہاں سے سے ہمیں اس
رب کی نعمت کو دیکھنا ہے چلو، چلو سب جلدی کرو۔''
ہمت حوصلہ بڑھاتے وہ سب کا پھر سے
بولنے لگا......

+++

سب جہاں جان بچانے کو بھاگ رہے
تھے وہی کسی نے بڑے سیاہ پتھر سے حملہ کسی

ہندو پر کیا گیا تھا...... جو جو لوگوں کے گھروں کو
آگ لگانے اور خوف پھیلانے میں مصروف
تھا۔ احمر نے آج اپنے بھائی کی جان کا بدلہ کرشنا
سے لے لیا تھا...... وہ زمین جہاں مسلمانوں
کے خون نے اسکورنگ ڈالا تھا۔ وہ اب اصل حق
داروں کے خون سے سرخ ہوئی پڑی تھی......
آج کہیں احمر کو برسوں بعد دل کا سکون میسر آیا
تھا لیکن پلٹ کر حملہ کیا گیا تھا جو کہ ہندو اتحادی
گروپ کی جانب سے ہوا تھا لیکن وہ آج فرار
ہو چکا تھا ہر اس خلش سے جو اس کے اندر
تھی...... جو وہ چاہتا تھا وہ ہو چکا تھا...... اور وہ
مطمئن تھا...... وطن اور اپنوں کی خاطر قربان ہو
جانے کا خواب سب تکمیل کو پہنچ چکا تھا......

+++

وہ بے حد خوبصورت احساس تھا۔ سب کے
دل خوشی سے، اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو سے جھوم
رہے تھے...... اس فضا میں سانس لینا کس حد
تک پرسکون تھا وہ بس اپنوں کی قربانی دینے
والے مسلمان ہی جان سکتے تھے۔ وہ سب
مسلمان اپنوں کی قربانیوں پر فخر کر رہے
تھے...... خوشی سے دوسرے کے گلے مل رہے
تھے...... تشکر، تشکر تشکر...... وہ رب کتنا
مہربان تھا ان پر...... سب کتنے خوش قسمت
تھے...... وہ سب کتنے خاص تھے وہ جانتے
تھے...... لیکن اس وطن کو حاصل کرنے کو کس
ذی روح نے کتنے امتحان اور دکھ جھیلے وہ محض
بس وہی جانتی تھی...... اپنوں کو کھو کر نعمتیں کتنی
ادھوری لگتی ہیں وہ زندہ اس کھلی فضا میں سانس
لیتے عظیم لوگ جانتے تھے...... اس آزادی کی
قیمت وہ جانتے تھے......

موسیٰ اس دھرتی پر کھڑا تھا جہاں وہ اپنے
پورے گھر والوں کے ساتھ آنا چاہتا تھا...... ماں
باپ، گیتی لیکن وہ سب کھو گئے تھے اس سفر میں
اس سے وہ اکیلا کھڑا تھا...... لیکن وہ خوش تھا......
بے حد خوش۔

اس نے خود کو ان سب پاکستانیوں کی
خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا...... آزادی کی
صورت اپنوں کا بدلہ لے کر انہوں نے کافروں
کے منہ پر وہ ذلت کا تھپڑ دے مارا تھا......

حمزہ نے زلیخا کی ہر خواہش پوری کی تھی
اس پاک مٹی کو ہونٹوں سے لگانے کا خواب واقعی
کتنا خوبصورت احساس تھا...... وہ حقیقت کتنی
خوبصورت تھی...... وہ کیسے جانتی تھی؟ وہ کیسے
جانتی تھی کہ اس کھلی فضا میں سانس لینا دنیا کی ہر
خوشی پر غالب آنے والا تھا......

وہ ملک ہر مسلمان کا ملک تھا...... جہاں وہ
آزادانہ اپنے رسم و رواج، روایات، مذہبی
عقائد کو پورا کر سکتے تھے...... آج چودہ اگست
1947 کا دن وہ خواب تھا جو پورا ہونے پر
روحوں کو معطر کرنے اور زندگی بخشنے والا تھا۔
اس سبز ہلالی پرچم کو ہر جانب لہرایا گیا تھا۔
موسیٰ کے لبوں سے یہ الفاظ جاری تھے جو
ہر کسی کے جذبات کی عکاسی کر رہے تھے......

اے وطن ہے مجھکو تو حبیب تر
تیری ہر صبح ہے عظیم تر
سب کھو دیا تو لگا تھا یوں
دنیا میں ہوں میں غریب تر
تجھے پالیا ہے تو خوش ہے دل
ہوں جیسے سب جہاں سے امیر تر
لہو اپنوں کے تجھ پر وار دیے ہیں
جو تھے قلب و روح سے عزیز تر
کبھی نہ تجھ کو زوال آئے
میری دعا ہے رب سے شدید تر

+++

باسم سلیمان مہمانوں سے فارغ ہو کر جب اپنے کمرے کی طرف آیا تو دل ایک عجیب سی لے پر دھڑک رہا تھا۔ چال میں سرور اور آنکھوں میں خمار کی سی کیفیت چھلک رہی تھی۔ پورے وجود پر آج خوشی رقصاں تھی جیسے سورج کی روشنی سے کرنیں چھن چھن کر اپنی روشنی بکھیرتی ہیں۔ ایسے ہی بے پایاں خوشی اُس کے وجود سے پھوٹ کر اس کے چہرے پر بھی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ سلیمان رضا اور مائدہ تو بیٹے کے دمکتے چہرے کو دیکھ کر کئی بار اس کی نظر اُتار چکے تھے۔ کمرے کے پاس پہنچ کر شائزہ کی موہنی صورت اور نک چڑھا سا انداز یاد آیا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ آنکھوں کے رستے دل کی سرزمین پر تو وہ پہلی نظر میں ہی براجمان ہو چکی تھی لیکن آج تو وہ اس کے گھر اس کے کمرے کی ملکیت میں بھی حصے دار بن گئی تھی۔

اس کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ جو کر لیے تھے۔ بڑی چاہ سے اُس نے اسے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک دلآویز مسکراہٹ نے اُس کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔ سرشاری کی کیفیت میں گھرے اُس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے بے قراری سے سامنے بیڈ کی طرف دیکھا تھا۔ اُس کے بیڈ کے چاروں اطراف میں خوبصورت سیج سجی ہوئی تھی لیکن جس کے استقبال کے لیے سجاوٹ کی گئی تھی وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے کچھ حیرت سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اُسے وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ ابھی وہ اس سوچ میں تھا جب وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔

آہٹ کی آواز پر اس نے وفورِ شوق سے

مکمل ناول

اس کی جانب دیکھا تو آنکھوں میں حیرت نے ہلکورے لیے تھے۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں نہ جانے کتنی بار اس نے تصویر کی آنکھ سے اس کا دلہناپے کے روپ میں سجا سنورا، شرمایا لجایا روپ دیکھا تھا لیکن حقیقت میں تو ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ کاٹن کے سادہ سے جوڑے میں ملبوس بے تاثر چہرے کی ساتھ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ کمرے میں اس کی موجودگی کا احساس پا کر وہ پل بھر کے لئے ٹھٹکی تھی۔ شاید ہچکچائی بھی تھی لیکن پھر دھیمی چال چلتی خاموشی سے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ تو اس کی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھکی تھیں اور نہ ہی چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری لگ رہا تھا۔ بلاشبہ اس سادہ روپ میں بھی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی لیکن اس کا سجا سنورا روپ دیکھنے کی کتنی چاہ تھی اسے۔

"کیا میرا اتنا بھی حق نہیں بنتا تھا کہ میں اپنے لئے سجائے گئے اس روپ کو دیکھ بھی نہ سکوں؟" دل میں ایک شکوہ سا ابھرا تھا لیکن پھر بھی اس نے سر اٹھاتے شکووں کو نظر انداز کیا اور چہرے پر نرم مسکراہٹ سجائے اس کی سمت بڑھا تھا۔

"اسلام علیکم۔" اس نے بڑے ملائمت بھرے لہجے میں کہا۔

بجائے سلام کا جواب دینے کے وہ سر جھکائے سپاٹ لہجے میں بولی۔

"مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔" ان لفظوں نے اس کے تمام جذبات پر جیسے اوس ڈال دی تھی۔

اس نے چونک اسے دیکھا۔

وہ اکثر یہ سوچتا تھا کہ اس کے سامنے اپنی چاہت کا اظہار کرنے کے لئے کیسے لفظوں کو ترتیب دے گا جن سے اسے اس کی محبت کا یقین ہو تو اس نے اس کی مشکل ہی آسان کر دی تھی۔ حکایت دل سنانے سے پہلے ہی اسے ٹوک دیا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

اس کی جانچتی نظروں نے اس کے تاثرات کھوجنا چاہے تھے اور یہ جانچ کا عمل بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کے چہرے پر اس کے لئے سوائے بیزاری اور اور روکھے پن کے اور کوئی تاثر نہیں تھا۔ اسے شدید اہانت کا احساس ہوا تھا کہ اپنی کنپٹیاں سلگتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

"ایسی بھی کیا اکڑ اور بے نیازی۔" اسے اس کے تاثرات پر جی بھر کر غصہ آیا تھا۔ شدت سے دل چاہا تھا کہ وہ اس نازک سی گلاب کی پنکھڑی جیسی لڑکی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ وہ چاہتا تو اس کی یہ اکڑ لمحوں میں ختم کر کے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا کہ نہ صرف وہ مکمل اس کی دسترس میں تھی بلکہ وہ اس پر شرعی اور قانونی حق رکھتا تھا۔ لیکن وہ کوئی معمولی انسان نہیں تھا وہ باسم سلیمان تھا جس کے لئے سب سے مقدم عورت کی عزت کرنا تھا۔ اپنے احساسات، جذبات پر اسے مکمل کنٹرول رکھنا آتا تھا۔ وہ ان مردوں میں سے نہیں تھا جو غصے اور جوش میں ہوش کھو دیتے ہیں۔ اس نے کبھی بھی غصے کو خود پر اتنا حاوی نہیں ہونے دیا تھا کہ اپنا وجود اس کو دان کر دے۔ ابھی بھی اس نے دل میں امڈتی غصے اور جوش کی ہر لہر پر قابو پا لیا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ کو نیند آ رہی ہے تو آپ آرام کیجئے۔"

اس کے رویے کی بدصورتی سے قطع نظر اس نے اپنے اس ازلی نرماہٹ بھرے لہجے میں کہا

"یہ رکھ لیں۔" وہ سونے کے لئے تکیہ درست کر رہی تھی۔ جب اس نے اپنی شیروانی کی جیب سے ایک سرخ مخملی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"یہ آپ کے لئے تحفہ ہے، ماما نے دیا تھا۔" اس کے روکھے پھیکے رویے کی بدولت وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ دل اپنے ہی الفاظ پر مسکرا دیا تھا کہ وہ خود سے ہی نظریں چراتا خود پر ہنس دیا تھا۔ اس ڈبیا میں موجود سونے کے نیکلس کو پسند کرنے کے لئے اس نے نہ جانے کتنے جیولرز کی دکانوں کے چکر لگائے تھے کہ اسے اس کے شایان شان کچھ پسند ہی نہیں آتا تھا۔ وہ جب بھی بازار جاتا ثمن کو لے کر جاتا۔ بالآخر جب اس نے تنگ آ کر اسے دھمکی دی تھی کہ اب اگر اسے کچھ پسند نہ آیا تو وہ اس کے ساتھ نہیں جائیگی تب کہیں جا کر اس نے یہ نیکلس پسند کیا تھا۔ جو کہ اس کا خاص تھا۔

کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ آگے کیا۔

وہ جو بغور اس کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سے کچھ چونک سا گیا تھا۔

نہ صرف اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں میں واضح لرزش تھی بلکہ یہ لرزش اس کے پورے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ یعنی بظاہر خود کو بے نیاز ثابت کرتی اندر سے وہ قدرے گھبراہٹ کا شکار تھی۔

"اس گھر میں اس کا پہلا دن ہے اور میں اس کے لئے بالکل انجان، شاید اسی لئے ایسا انداز اپنائے ہوئے ہے۔"

دل نے اس کی طرفداری کرتے ہوئے جواز تلاشا تھا۔

عین اسی وقت اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈبیا کو بنا دیکھے ہی بیزاری سے بیڈ کے ساتھ والی دراز میں ڈالا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

وہ سونے کے لئے لیٹا تو ایک شکایتی نظر خود بخود اس پر پڑی تھی۔ اپنے جذبات کی بے وقعتی پر اندر تک ایک بے نام سی اداسی اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی تھی۔

✤✤✤

اس کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر نیم خوابیدہ حالت میں لیٹی رہی۔ اپنے اردگرد کا ماحول اجنبی سا لگا کچھ دیر سوچا تو یاد آیا آج اس کی شادی کا دوسرا دن تھا اور وہ اس وقت اپنے سسرال میں تھی۔ وہ کسلمندی سے اٹھ کر بیٹھی اور اردگرد نگاہ دوڑائی باسم کمرے میں نہیں تھا وہ ذہنی طور پر تھوڑی پرسکون ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر یونہی سستی سے بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باتھ روم کی جانب چل دی۔

وہ آئینے کے سامنے بیٹھی بالوں میں برش کر رہی تھی جب دروازے پر دستک دے کر نائلہ اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے ایک نرم مسکراہٹ چہرے پر سجائے، محبت بھری نظروں سے اس کے موہنے سراپے کو دیکھا۔

''اسلام علیکم!'' اس نے انہیں آتے دیکھ کر سلام کیا تھا۔

''وعلیکم سلام، کیسی ہے میری بیٹی؟'' ان کے اتنے محبت بھرے انداز پر وہ کچھ جھجکتی ہوئی اٹھی۔ ہاتھ میں پکڑا برش سامنے میز پر رکھ کر ان کے پاس آئی۔

نائلہ نے بغور اس کی طرف دیکھا نظریں جھکائے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ میں پیوست کیے انگلیوں کو مروڑتی وہ انہیں کچھ نروس سی، گھبرائی گھبرائی سی لگی۔ اس کے چہرے پر انہیں ڈھونڈنے سے بھی ایسے رنگ نہیں ملے تھے جو اسے عروسِ نو بتاتے۔

وہ کچھ الجھ سی گئیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب باسم ان کے پاس آیا تھا تو وہ بھی انہیں کچھ الجھا الجھا نظر آیا تھا اس کا سنجیدگی بھرا انداز انہیں بالکل نہیں بھایا تھا۔ ہر دم ہنستے مسکراتے بیٹے کو خاموش اور چپ چپ سا دیکھ کر انہیں بالکل اچھا نہیں لگا تھا انہوں نے اس کی چاہ اور خواہش کو اولیت دیتے ہوئے بخوشی شائزہ کو اس کی زندگی میں شامل کیا تھا وہ تو توقع کر رہی تھیں کہ کل کی نسبت کہیں زیادہ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی ہوگی لیکن اس کا انداز اس کے بالکل برعکس تھا۔

وہ بہت سمجھدار اور وضع دار خاتون تھیں انہیں مناسب نہیں لگا تھا کہ وہ بیٹے سے شادی کے پہلے دن ہی اس کے بیوی کے متعلق پوچھ گچھ شروع کر دیتیں۔ اس لئے فی الحال انہوں نے دل میں کھٹک کے باوجود نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا تھا اور اب شائزہ کو دیکھ کر پھر وہی کھٹک پیدا ہوئی تھی۔

''بیٹھو بیٹا! تم آرام سے بال بناؤ میں تمہارے لئے ثمن کے ہاتھ ناشتہ بھجواتی ہوں اور باسم کو بھی بھیجتی ہوں اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بغیر کسی گھبراہٹ کے ثمن کو بتانا یہ تمہارا اپنا گھر ہے اور ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔'' انہوں نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کے ماتھے کو چوما۔ اس نے آنکھوں میں بے یقینی سمیٹے ان کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر سوائے ممتا بھری محبت کے کوئی عکس نہیں تھا۔

''جی'' وہ دھیمے سے انداز پر سر ہلاتی جواباً اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

وہ نرمی سے اس کی سر کو تھپتھپائے باہر کی جانب چل دیں۔

تب وہ گہری سانس لیتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور ان کے بارے میں سوچنے لگی۔

''ابھی تو میں اس گھر میں نئی ہوں۔ شروع میں تو ہر کوئی پیار جتاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد ہی پتہ چلے گا ان کے رویے کے بارے میں، کیا پتہ یہ سب دکھاوا ہے۔''

اس نے کئی ثانیے بعد منفی ہو کر سوچا تھا۔ حالانکہ وہ ان سے پہلی دفعہ نہیں مل رہی تھی، اس کی منگنی سے بھی پہلے ان کے گھر ان کا بہت نہ سہی لیکن آنا جانا تھا۔ گھر کے سب افراد سے واقفیت تھی۔ سب بہت پیار سے ملتے تھے اسے ہمیشہ سب کی آنکھوں میں محبت کا سچا عکس ہی نظر آتا لیکن پھر بھی دل تھا کہ یقین کرنے کو تیار ہی نہ ہوتا تھا۔ منفی سوچوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش بھی کرتی تو وہ پھر بھی بار بار ذہن میں در آتی۔ ابھی وہی سوچ رہی تھی۔ جب ہنستی مسکراتی ثمن ناشتے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بھی فی الحال اپنی الٹی سیدھی سوچوں کو ذہن سے جھٹکتی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اسلام علیکم، بھابھی جان، کیسی ہیں آپ؟ اور جلدی سے سچ سچ بتائیں، آپ کو میری بھابھی کے عہدے پر فائز ہونا کیسا لگا۔''

اس نے آتے ہی ایک سانس میں سوالات شروع کر دیئے تھے۔ اس کے طرزِ تخاطب پر اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ابھری، وہ ایسی ہی تھی ہر دم ہنستی مسکراتی، رونق لگائے رکھتی، چونکہ وہ تقریباً اس کی ہم عمر تھی، محض چھ ماہ ہی اس سے چھوٹی تھی اس لئے مزاجوں میں فرق کے باوجود اس سے خاصی بے تکلفی بھی تھی۔ شائزہ کو وہ اپنی شوخ اور خوش اخلاق عادات کی وجہ سے پہلے ہی بہت پسند تھی اور اب تو اس کی نند بھی بن چکی تھی۔

''بھابھی جان، یعنی کہ اب تم مجھے عزت و احترام سے بلاؤ گی۔''

وہ دھیمے سے بولی۔

''بالکل جناب! اب یہ ماما کا حکم ہے، اس لیے اس کی تعمیل تو کرنی پڑے گی۔''

بولتے ہوئے ایک دم اسے یاد آیا۔

''لو بھئی ابھی تک بتایا ہی نہیں کیسا لگا میری بھابھی بن کر۔''

''بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولی۔

تب ہی اس کی نظر ثمن کے پیچھے اندر داخل ہوتے باسم پر پڑی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً ہی سیدھی ہو کر بیٹھی، پل بھر میں ہی اس کے چہرے پر سنجیدگی اور اجنبیت سی طاری ہو گئی تھی۔ ایک اور رنگ بھی ابھرا تھا لیکن وہ سر جھکا گئی تھی اس لیے وہ دیکھ نہیں پایا تھا۔

✤✤✤

ولیمے کی تقریب جاری تھی۔ وہ پاپا کے ساتھ مہمانوں کے استقبال کے لئے شادی ہال کے داخلی دروازے پر کھڑا تھا۔ اس سے ناراض ہونے کے باوجود دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر گاہے بگاہے سامنے اسٹیج پر دلہن بنی شائزہ پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اس کا معصوم حسن سج دھج سے تیار ہو کر اس کے کل کے روپ کو بھی مات دے رہا تھا۔ کل تو وہ اسے نظر بھر کر دیکھ ہی نہ پایا تھا اور آج اس نے تقریب کے اختتام پر رواج کے مطابق اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی واپس چلے جانا تھا، اس لئے یہی موقع تھا۔ وہ اردگرد سے بے نیاز پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

جب ساتھ کھڑے سلیمان رضا نے ہولے سے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''برخوردار! کچھ اپنے اردگرد کا بھی خیال کر لیجیے۔ لوگ آپ کے یوں ٹکٹکی باندھ کر اپنی دلہن کو دیکھنے پر متوجہ ہو رہے ہیں۔ آپ کی دلہن آپ کی ہی رہے گی خدانخواستہ اسے آپ سے کوئی جدا نہیں کر رہا۔'' اس نے بڑبڑا کر اپنی نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔ ان کی سمت دیکھا وہ شرارت سے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

یوں چوری پکڑے جانے پر ایک خجالت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر پھیلی تھی۔

اسی اثناء میں شائزہ کے گھر والے آگئے تو وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ایک بات جو اس نے دورانِ تقریب محسوس کی تھی۔ اس کا اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی سرد سا رویہ تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے کسی طرح کی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ مزید الجھا تھا۔

اس نے اس کے ساتھ بیٹھی اس کی بھابھی کو دیکھا اس کی اور شائزہ کی شادی میں محض ایک دن کا ہی تو فرق تھا کل اس کے بھائی فائق کے ولیمے والے دن ان کی شادی تھی لیکن کتنا فرق تھا ان دونوں کے چہروں کے لئے تاثرات میں، اس کی بھابھی کا مسکراتا چہرہ اور چہرے پر کچھ شرمائے کچھ گھبرائے سے رنگ تھے، لیکن اس کے بے تاثر چہرے پر تو ایسا کوئی عکس نہ تھا۔ وہ دلگرفتہ سا ہوا تھا۔

اسٹیج سے کچھ فاصلے پر کھڑا بظاہر اپنے سامنے موبائل پکڑے وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے وہ اس پر مصروف ہے جبکہ حقیقت میں وہ کن انکھیوں سے اس سمت ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساری توجہ اس طرف ہی تھی۔

''کیا شائزہ اس شادی سے خوش نہیں۔''

دل میں یکا یک ایک۔ خدشے نے سر اٹھایا تھا۔ تب ہی کمرن اسے تصاویر کھنچوانے کے لئے کہنے آئی تو وہ اپنے تاثرات چھپاتا خوشدلی سے اس کے ہمراہ اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔

ولیمے سے اگلے دن، جب وہ شائزہ کو لینے اس کے گھر گیا تو پرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا گیا۔ سہیل انکل سمیت سب گھر والے بے حد محبت سے ملے۔ لیکن جس سے اسے گرمجوشی کی، اظہار کی چاہ تھی اسے شاید اس کی ذات سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ اس کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں خاموش سی، لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ اب تک اگر کوئی ایک آدھ بات ان کے درمیان ہوئی بھی تو وہ بھی اس نے ہی کی تھی۔ اسے اب اس کے انداز سے کوفت ہونے لگی تھی۔ تب ہی اس کی بھابھی سونیا نے آکر کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ بے دلی سے اٹھا تھا۔

بلاشبہ کھانے پر بہت اہتمام کیا گیا تھا اور سونیا بھابھی نے بہت دل لگا کر کھانا بنا تھا لیکن جب دل ہی اداس تھا تو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن بہرحال اخلاقیات بھی نبھانی تھیں اور وہ اتنا بداخلاق قطعی نہیں تھا کہ اپنی کسی الجھن کی وجہ سے مقابل کو بھی کسی الجھن میں مبتلا کرتا۔ اس لئے اپنے طور پر وہ ہر ایک سے خوش اخلاقی کا ہی مظاہرہ کر رہا تھا۔

''اب وہی تمہارا گھر ہے، وہاں دل لگانے کی کوشش کرنا، تمہیں تو پتہ ہے تمہارے ابو تو بہت خوش ہیں اس رشتے سے، اور ان سے بڑھ کر میرا دل مطمئن ہے۔ سلیمان بھائی کی پوری فیملی دیکھی بھالی ہے اور نائلہ بھابھی بھی بہت

اچھی محبت کرنے والی ہیں۔''

کھانا کھانے کے بعد انہوں نے گھر جانے کا قصد کیا تو اسے یاد آیا کہ گاڑی کی چابی ڈرائنگ روم کی درمیانی ٹیبل پر ہی پڑی رہ گئی ہے۔ وہ چابی لے کر داخلی دروازے کی سمت بڑھا تو امینہ آنٹی اس کے پاس کھڑی اسے سمجھا رہی تھیں۔

''یاسم بہت اچھا بچہ ہے۔ وہ کسی انعام کی صورت تمہیں ملا ہے۔ جب تم پیدا ہوئی تھی نا، میں نے تمہارے لئے تب سے ہی اللہ سے دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں اور مجھے پورا یقین ہے میری دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی وہ میری بیٹی کو بہت خوش رکھے گا انشاء اللہ، اللہ تم دونوں کو خوش رکھے اور ڈھیروں خوشیاں دے۔''

وہ ممتا سے چور لہجے میں بول رہی تھیں اپنے ذکر پر اس نے لاشعوری طور پر اسے دیکھا تھا۔

اس کے چہرے پر عجیب مبہم قسم کے تاثرات ابھرے تھے اور پیشانی پر ناگواری سی سلوٹ کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ یوں لاتعلق ہو کر کھڑی تھی کہ جیسے اسے ان کی باتوں سے کوئی غرض ہی نہ ہو۔ اس کے دل پر منوں بوجھ آ پڑا تھا۔

تب ہی امینہ آنٹی کی اس پر نظر پڑی تو وہ گہری سانس بھرتا ان کی سمت بڑھ گیا۔

☆☆☆

سونیا کچن کا کام نپٹا کر کمرے میں آئی تو ثاقب کچھ فائلیں کھول کر بیٹھا دفتر کا کام کر رہا تھا۔

وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''آفس کا کام کر رہے ہیں۔'' حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اکثر کوئی کام رہ جاتا تو وہ گھر لے آتا تھا لیکن پھر بھی بات کرنے کی غرض سے بولی۔

''ہوں۔'' اس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''فائق بھائی اور آئمہ کا ہنی مون، ناردرن ایریاز جا رہے ہیں ہنی مون کے لئے۔'' اس کے لہجے میں حسرت سی تھی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

وہ پھر بولی۔

''فائق بھائی بہت خیال رکھتے ہیں آئمہ کا، ویسے جس طرح وہ لیے دیے انداز میں خاموش سے رہتے تھے لگتا نہیں تھا کہ بیوی کا اتنا خیال رکھیں گے۔ وہ تو اس کے یوں آگے پیچھے پھرتے ہیں کہ بس، میں تو حیران رہ جاتی ہوں دیکھ کر، گھر والوں کو تو کوئی لفٹ نہیں کراتے تھے لیکن بیوی کے خوب آگے پیچھے پھرتے ہیں، ویسے دونوں کی آپس میں ذہنی ہم آہنگی بھی بہت ہے۔ ظاہر ہے ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں اور پسند کی شادی ہے، پہلے سے ہی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

وہ بڑے جوش سے بولتی ان دونوں پر تبصرہ بھی کرتی جا رہی تھی۔ جب کہ وہ ہاں یا ناں کیے بنا ہنوز اپنے کام میں مصروف تھا۔

''آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔''

اس کی طرف سے مسلسل خاموشی پا کر وہ بولی۔

''کیا جواب دوں؟ یہ اتنی اہم بات تو نہیں۔ فضول میں دماغ نہ کھاؤ میرا، شادی کے بعد لوگ گھومتے پھرتے جاتے ہی ہیں یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔'' وہ جھنجھلا کر بولا۔

وہ اس کے اس انداز کی عادی تھی چنانچہ ایک پل اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری سے دل دکھا لیکن پھر دوبارہ بولی۔

"کیوں اہم بات نہیں، یہی تو یادگار دن ہوتے تھے۔ بعد میں تو گھر اور بچوں کی مصروفیت ہوتی تھی اور بس۔ اب ہم نہیں گئے تھے تو رونی سی ہو جاتی، پھر کب جا سکے بلکہ شہر سے باہر جانا تو ایک خواب کی سی بات ہے۔ ہم تو اپنے شہر میں بھی سیر و تفریح کے لیے گھر سے باہر نہیں جاتے۔"

وہ بھی آج جیسے جرح کے موڈ میں تھی، بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔

اس نے ایک جھٹکے سے فائل ایک طرف کی اور بولا۔

"تو سیدھی طرح کہو، تمہیں آئمہ سے حسد محسوس ہو رہا ہے۔ بات کو گھما پھرا کیوں رہی ہو، اور ایک بات میری کان کھول کر سن لو، آئمہ کو دیکھ کر اپنی اوقات نہ بھول جانا میں فائق نہیں ہوں جو بیوی سے دب کر رہوں اور اس کے نخرے اٹھاتا رہوں، میرے سے عورت کو زیادہ سر پر نہیں چڑھایا جاتا سمجھی۔"

اس نے بری طرح اپنے بے رحم لفظوں سے اسے چھلنی کیا تھا۔ ایک دم سے اسے رونا آنے لگا تھا۔ شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا، وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ایسا ہی کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو توجہ سے بات سنتا اور کبھی ایک دم سے اسے یوں ڈانٹ کر رکھ دیتا کہ وہ حیران رہ جاتی اور اپنا قصور ڈھونڈنے لگ جاتی، جس بناء پر اس نے اسے ڈانٹا ہوتا، اکثر اسے ڈھونڈنے سے بھی اپنا قصور نہ ملتا۔ وہ اچھی خاصی خوش اخلاق اور باتونی تھی اس کے برعکس وہ اتنا ہی خشک مزاج تھا۔

"میں اس سے حسد کیوں کروں گی، میں نے تو ویسے ایک بات......"

اس کے خونخوار نظروں سے دیکھنے پر وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئی تھی۔

"میں نے کتنی دفعہ کہا ہے مجھ سے بحث مت کیا کرو، بس میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔"

ایک کاٹ دار تنبیہی نظر اس پر ڈال کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے بمشکل خود کو بولنے سے روکا تھا ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ اب خاموش نہ رہے، ان کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے، وہ اس کے رویے کی شدتوں کو برداشت کرتی جا رہی تھی لیکن اب کچھ عرصے سے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ شدت سے دل چاہتا کہ اپنی بات کی وضاحت دے، وہ بلاوجہ الجھے تو وہ خاموش نہ رہے، شاید چپ رہ رہ کر وہ تھک گئی تھی۔ اسے اپنی برداشت کی حد ختم ہونے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ ابھی بھی خاموش تو ہو گئی تھی لیکن اس پر بس نہیں چلا تو رونے لگی تھی۔ آنسوؤں کے ذریعے اپنا اندر کا غبار نکال رہی تھی۔ لیکن جتنا بھی روتی مقابل کو اس کی پرواہ ہی کب تھی، اسے صرف رعب ڈالنا آتا تھا اور آنسو دینے آتے تھے آنسو پونچھنے کے فن سے وہ قطعی نابلد تھا۔

+++

وہ بیڈ کے کنارے پر سر جھکائے سمٹ کر بیٹھی ہوئی خاموشی سے اپنی بازو میں پہنے بریسلٹ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کی نظروں کے حصار میں ہے۔ حالانکہ وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیڈ کے دوسری طرف نیم دراز تھا لیکن پھر بھی اس کی نگاہوں کی تپش اسے اپنے ہاتھوں پر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لاکھ اس کے سامنے خود کو بے پرواہ ظاہر کرتی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ جب بھی خود کو اس کی نظروں کے حصار میں پاتی، خود میں سمٹ سی جاتی تھی۔ کمرے میں ان دو نفوس کے علاوہ ایک گمبھیر خاموشی تھی جو ان کے درمیان

سرایت کر رہی تھی۔ ان کی شادی کو تقریباً دو ہفتے ہونے والے تھے لیکن وہ ابھی تک اپنے اور اس کے درمیان اجنبیت کو کم نہیں کر پایا تھا۔ اس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی لیکن وہ کوئی سرا تھمائی تو تب نا! عجیب مزاج تھا اس کا کبھی اسے لگتا کہ اس کے ذہن و دل میں جیسے کشمکش کی سی کیفیت رہتی ہے۔ اس نے مرد ہونے کے باوجود اس کے سرد رویے کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ اس کی سرد مہری کے باوجود اس کا رویہ اس سے بے حد اچھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ بظاہر گھریلو ٹائپ عام سی نظر آنے والی وہ نازک چھوٹی سی لڑکی اس جیسے زیرک بندے کے لیے پہیلی بنی ہوئی تھی کہ وہ اس کی ذات میں الجھتا جا رہا تھا۔ وہ جب بھی اس سے عام روزمرہ کی باتیں کر رہا ہوتا یا اپنی چاہت کا اظہار کرتا، دونوں صورتوں میں اس کی ایک ہی کیفیت رہتی، اس نے کبھی اپنے احساسات، اپنی کوئی بات اس سے کی ہی نہیں تھی۔ وہ اس کے لیے کتنی خاص تھی اہم ہے وہ اسے بتاتا تو بدلے میں اس کی بھی چاہ ہوتی کہ وہ اس کے متعلق کیا احساسات رکھتی ہے، کیا سوچ رکھتی ہے کچھ تو بتائے لیکن وہ ناامید ہی رہتا۔ کبھی اس کا رویہ انتہائی سرد ہوتا اور کبھی وہ حد سے زیادہ گھبراہٹ کا شکار ہوتی، اس نے ابھی تک اس سے خود کوئی بات نہیں کی تھی وہ بات کرتا تو مختص جواب دے دیتی، عجیب طرز عمل تھا اس کا، یا تو اس کی آنکھوں میں سرد و سپاٹ رنگ نظر آتا یا خوف و ہراس کے سائے منڈلا رہے ہوتے، اسے کیا خوف تھا؟ اس کے احساسات کیوں منجمد تھے؟ وہ چاہ کر بھی یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ اگر اس کی طرف پیش قدمی کرتا تو اس نے کبھی روکا بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے قریب ہوتا تو بھی تو اس کا چہرہ ہر طرح کے احساسات سے عاری ہوتا اور کبھی اس کی آنکھوں میں اتنی وحشت ہوتی کہ وہ خجالت کے احساس میں گھر جاتا، کبھی وہ اس کے حصار میں مقید سہمی ہوئی ہرنی کی مانند، نہ سمجھی کی کیفیت میں اسے دیکھتی تو وہ اسے ایک ایسے بچے کی مانند لگتی جو دنیا کے میلے میں کھو گیا ہو اور اب نہ سمجھی سے اپنے سامنے نئی دنیاؤں کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو۔ تب اس کا دل چاہتا کہ وہ اسے سمیٹ لے اسے اپنی محبت کا اعتماد دے۔ اور وہ اپنے تئیں کوشش بھی کرتا تھا لیکن لمحوں میں ہی اس کے سارے احساسات برف کی سل کی مانند ہو جاتے اور وہ خود کو ایک ان دیکھے خول میں بند کر لیتی، وہ اس کا یہی خول ہی تو توڑ نہیں پا رہا تھا۔ اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اس کی شرم یا گھبراہٹ نہیں بلکہ کچھ اور تھا اور... کیا؟ اس سے آگے اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔

"اگر جو مجھے پتہ ہوتا کہ مجھے شائزہ سہیل نامی عجیب الجھی ہوئی لڑکی سے محبت ہو جائے گی اور مستقبل میں وہی میری زندگی کی ساتھی بھی بنے گی تو بزنس کے فارمولے رٹنے کی بجائے نفسیات ہی پڑھ لیتا شاید کہ اسے سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔"

یہ خیال ذہن میں آیا تو اسے اپنی ہی سوچ پر ہنسی آ گئی۔

وہ اپنے زمانہ طالب علمی میں ایک ذہین طالب علم رہا تھا۔ شاندار تعلیمی کیریئر کی بدولت ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اپنی عمر سے بھی زیادہ سمجھدار اور بہت پختہ سوچ رکھنے والوں میں سے تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ وہ اس چھوٹی سی لڑکی کی عجیب و غریب شخصیت کی گتھیاں نہیں سلجھا پا رہا تھا۔

"تم اتنا کم کیوں بولتی ہو؟ میں کوئی بات کروں تو مختصر لفظوں میں جواب دیتی ہو اور بس، ایسا کیوں؟ میرے خیال میں میاں بیوی میں سب سے پہلے دوستی اور ہم آہنگی کا رشتہ استوار ہونا چاہیے۔ اور میں ہمارے درمیان بھی ایسا ہی رشتہ استوار کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اگر کوئی پریشانی یا کسی قسم کی ہچکچاہٹ ہے تو تم مجھ سے شیئر کرسکتی ہو۔" اس نے بہت نرمی سے اس کا سرد ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر حوصلہ دلانے والے انداز میں ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ کے آثار نظر آئے تھے۔ وہ بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"نہیں، مجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح نظریں جھکائے آہستگی سے اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

وہ ہمیشہ اس سے ایسے ہی بات کرتی تھی۔ اس نے ابھی تک اسے بھی اپنی طرف دیکھتے ہوئے نہیں پایا تھا۔ وہ اسے یوں شرمائی گھبرائی بھی بہت اچھی لگتی تھی لیکن کبھی جب اس کی آنکھوں میں اسے خوف کی سی کیفیت نظر آتی۔ یہ چیز اسے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی اور یہی احساس وہ اس کے اندر سے ختم کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر اسے گہری نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ کچھ شوخی سے بولا تھا۔

"تم میری طرف دیکھ کر بھی بات کرسکتی ہو، میرا یقین مانو، شوہر کی طرف دیکھنا گناہ کے زمرے میں نہیں آتا۔"

اس نے گڑبڑا کر ایک دم سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نظروں کا تصادم ہوا تو وہ مزید گھبرا گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ بکھرے تھے۔ وہ دلچسپی سے ان رنگوں کو دیکھنے لگا، اسے خود کو اتنا توجہ سے دیکھتا پا کر وہ مزید نروس ہوگئی تھی، تب ہی وہ اس کی ہچکچاہٹ کم کرنے کی غرض سے موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تمہارا بی۔ایس سی کا رزلٹ کب آرہا ہے؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا! اب آگے کیا ارادہ ہے۔" وہ اسے خود سے باتیں کرنے پر آمادہ کررہا تھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ از حد معصومیت سے بولی تھی، وہ دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

"ویسے اگر تمہارا آگے پڑھنے کا ارادہ ہو تو رزلٹ کے بعد ماسٹرز میں داخلہ لے لینا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، ثمن تو یونیورسٹی جاتی ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جانا شروع کردینا، ٹھیک ہے نا۔"

"اب میں سو جاؤں۔" وہ ایک دم خاموش ہوکر دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ اس کی پڑھائی کے متعلق سنجیدگی سے غور کررہا تھا اور جواب میں اس نے اپنا ہمیشہ کا گھسا پٹا جملہ دہرا دیا تھا۔

اس نے اس کی طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پر اس لمحے چھائی بیزاری کی کیفیت چیخ چیخ کر اپنا آپ دکھا رہی تھی۔ وہ اسے جتنا خود سے قریب کرنا چاہ رہا تھا وہ اتنا ہی گریز برتتی۔ اسے یوں لگتا کہ جیسے اس کی ذات کی، اس کی باتوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ بات کسی بھی مرد کی انا کو ٹھیس پہنچاتی ہے تو اسے کیوں کر نہ پہنچتی۔

اس نے ہولے سے اس کا تھاما ہوا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور مزید کچھ بولے بغیر خاموش ہوگیا تھا۔

"کیا میں اس قابل نہیں کہ میری بیوی مجھ سے کچھ بات بھی نہ کرنا پسند کرے۔" اس نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا تھا۔ وہ بہت حسین وجمیل اور مردانہ وجاہت کا شاہکار نہیں تھا تو اس کی شخصیت ایسی بھی نہ تھی کہ نظر انداز کی جاتی۔ وہ اچھی خاصی پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ہمیشہ مرکز نگاہ رہا تھا۔ گھر میں اس کی بات کو اہمیت دی جاتی۔ ثمن سے بڑا تھا اور اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ماما بابا کی بھرپور توجہ حاصل رہی تھی، تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے بھی اپنی ذہانت کی وجہ سے نمایاں رہتا اور اب دفتر میں بھی چند عرصہ کی نوکری میں ہی وہ اچھا خاصا مقام بنا گیا تھا۔ ایسے میں بیوی کی طرف سے ایسی بے توجہی سے بہت کھل رہی تھی۔ لیکن وہ ابھی تک تحمل کا مظاہرہ کررہا تھا۔

"اس کے ایسے رویے کے پیچھے کیا وجہ ہوسکتی ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی دل میں وہی خیال ابھر اٹھا جسے وہ بار بار جھٹلاتا تھا۔

* * *

"میاں بیوی کی سوچ اور زندگی کے بارے میں زاویہ نظر میں فرق ہونا کوئی پریشانی یا الجھن کی بات نہیں ہے، اس رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے زیادہ ضروری دونوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کا ہونا اہم ہے۔ ہر انسان کی سوچ کا زاویہ مختلف ہوتا ہے۔ کبھی کسی کو اپنی سوچ تک محدود نہیں کرتے، خاص طور پر بیوی کو کبھی اس بات پر مجبور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تمہاری سوچ، تمہارے نظریے سے سوچے، کیوں؟ وہ بھلا ایسا کیوں کرے؟ وہ بھی ایک جیتا جاگتا وجود ہے۔ اس کے بھی احساسات ہوتے ہیں۔ اچھا مرد وہ ہے جو بیوی کو پریشرائز کرنے کی بجائے اس سے محبت کرے، اس کی عزت کرے، اس کی حوصلہ افزائی کرے، اسے اپنے ساتھ کا اعتماد بخشے اور بس، جس طرح ہر کام ہونے میں وقت لگتا ہے اسی طرح دوسرے گھر کے ماحول کو سمجھنا، شوہر کی فطرت کو سمجھنا ان چیزوں میں بھی تو وقت لگتا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر بالکل انجان ماحول میں آئی ہوتی ہے۔ اس لیے بعض دفعہ گھبراہٹ کا شکار ہو جاتی ہے، اس لیے میرے خیال میں تو شوہر کو اسے اس چیز کا مارجن دینا چاہیے۔ فوری نتائج کی توقع نہیں باندھنی چاہیے پھر اسے کچھ کہنے کی یا سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے وہ خود بخود ہی تمہارے رنگ میں ڈھل جائے گی۔"

"کیا خیال ہے؟ تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟" انہوں نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے بہت توجہ سے ان کی بات سنی تھی۔ بابا کی باتیں اس کے لیے ہمیشہ اندھیرے میں روشنی کی مانند ہوتی تھیں۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ جب بھی کسی پریشانی میں الجھا وہ ہمیشہ اسے امید کا جگنو تھما دیتے۔ آج بھی وہ جگنو نامحسوس انداز میں بہت طریقے سے انہوں نے اسے تھما دیا تھا۔

"سو فیصد متفق، بہت اچھی بات کہی آپ نے۔" چائے کا کپ لبوں پر لگاتے ہوئے اس نے بھرپور انداز میں ان کی تائید کی۔

"یعنی! آج کوئی بحث نہیں۔" اس کے چہرے پر بکھرے سکون آمیز تاثرات کو دیکھتے ہوئے وہ بولے۔

"جی! بالکل۔"

"تو اور کیا، نئی جگہ، نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے کے لیے وقت تو لگتا ہے، صرف شوہر ہی

تھیں، سسرال والوں کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہئے۔" پاس بیٹھی نائلہ نے بھی ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

وہ ماما، بابا دونوں سے بہت قریب تھا۔ بابا سے تو باپ سے زیادہ دوستی کا رشتہ تھا۔ یہ اس کا معمول تھا کہ وہ شام کا کچھ وقت ان کے پاس ضرور گزارتا تھا۔ اکثر وہ کسی نہ کسی موضوع پر آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ جہاں ضرورت ہوتی بحث بھی کرتے اور موثر دلائل سے ایک دوسرے کو اپنا نقطہ نظر سمجھاتے، شادی کے بعد بھی اس کے معمول میں فرق نہیں آیا تھا۔ شام کی چائے لازمی طور پر وہ ان کے ساتھ ہی پیتا تھا۔

جب سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ ان دونوں کو کچھ مضطرب سا لگ رہا تھا۔ حالانکہ شائزہ سے اس کی پسند کی شادی تھی۔ اس کے اضطراب کی وجہ تو انہیں معلوم نہیں تھی اور اگر وہ ان کو خود نہیں بتا رہا تھا تو انہیں بھی اس کی ذاتی زندگی میں مداخلت کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لئے انہوں نے اپنے انداز سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اس موضوع پر بات کی تھی۔

نائلہ کا خیال تھا کہ اس کی اور شائزہ کی عادات میں، مزاج میں کافی فرق ہے، اسی لئے وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ الجھاؤ کا شکار ہیں۔ تب ہی انہوں نے بڑے سبھاؤ سے اسے اپنے پاس سمجھانے کی سعی کی تھی اور اس کے تائیدی انداز سے انہیں لگ رہا تھا کہ انہیں اس میں کامیابی بھی ہوئی تھی۔

+++

"مال روڈ کی رونقوں کی اپنی ہی بات ہے۔ میں تو جب جب یہاں آیا ہوں ایسے ہی رونق سی رہتی ہے۔ پچھلے سال ہم سب یہاں آئے تھے تب میرے دل نے شدت سے خواہش کی تھی کہ اگلے سال میں جب یہاں آؤں تو تمہارے ساتھ آؤں اور دیکھو میری خواہش کیسے پوری ہوئی۔" وہ ایک جذب کے عالم میں بولا تھا۔ ماہ ستمبر کی ابتداء تھی۔ آجکل کے مری کے خوشگوار موسم کی طرح اس کا ساتھ پا کر اس کا موڈ بھی بہت خوشگوار تھا۔ اس کی وجہ شائزہ کے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی بھی تھی جو اس نے محسوس کی تھی۔ وہ اب پہلے کی نسبت بہت زیادہ نہیں لیکن پھر بھی اس سے کچھ بات کر لیتی تھی۔ اس کے لئے اتنا بھی کافی تھا ان کی شادی کا تیسرا ہفتہ چل رہا تھا۔ اب کہیں جا کر اسے چھٹی ملی تھی تو اس طرف آنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

اس وقت وہ مال روڈ پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ ہی مسلسل بول رہا تھا جب کہ وہ بس جواباً ہوں ہاں کر دیتی تھی اور بس۔

"تم بھی کچھ بولا کرو نا! میں ہی بولتا رہتا ہوں۔" وہ اس کی بات سن رہی تھی اب اس کے اچانک کہنے پر یکدم نروس سی ہو گئی۔

"مجھے سمجھ ہی نہیں آتی کہ میں کیا بات کروں، میں بول نہیں سکتی، مجھے بولنا نہیں آتا۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں سر جھکائے ہوں اعتراف کیا جیسے اسے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔

اس کی عجیب سی منطق اور انداز پر وہ بے ساختہ کھل کر ہنس دیا تھا۔ اس نے چونک کر اسے ہنستے ہوئے دیکھا۔

"کیا مطلب؟ بولنا نہیں آتا تو ابھی کیا کر رہی ہو؟" وہ شرارت سے معصومیت بھرے لہجے میں بولا۔

اسے اس کا ہنسنا اور یوں کہنا سراسر اپنا مذاق

اڑاتا ہوا محسوس ہوا تھا ایسا اسے اکثر محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس پر ہنستا ہے، اس کی باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔

یک لخت ہی اس کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی اتر آئی تھی جسے چھپانے کی غرض سے اس نے فوراً رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔

وہ اپنے نام کی طرح ہنستا، مسکراتا خاصا خوش مزاج تھا۔ شروع میں وہ اس کے گریز بھرے رویے کی وجہ سے مایوس سا ہو گیا تھا لیکن بابا سے اس دن کی باتوں کے بعد وہ اسے اعتماد دینے کی خاطر اس سے زیادہ سے زیادہ باتیں کرتا، اسے بولنے پر اکساتا تا کہ اس کی جھجک دور کر سکے۔ اس لئے اس سے ہنسی مذاق بھی کر لیتا لیکن اس کے تو یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس کی باتوں کو یوں منفی رخ بھی دے سکتی ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ کم گو، اپنی ذات کے دائرے میں مقید، حد سے زیادہ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے اپنی عمر کی لڑکیوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس کے بارے میں یہ بات شادی سے پہلے ماما اور ثمن دونوں نے بتایا تھا اور شادی کے بعد اتنے دنوں میں اسے خود بھی اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے اب وہ اس کا ہمیان بنانے اور اپنے اور اس کے درمیان تکلف کی دیوار ہٹانے کے لئے مزید کوشاں تھا۔ لیکن وہ جتنا اس کے قریب ہوتا اتنی ہی اس کی کھوج بڑھتی جاتی۔

"صبح ہم نتھیا گلی چلیں گے۔ وہاں کی گرم شالیں ثمن اور ماما کو بہت پسند ہیں۔ ان کے لئے بھی لیں گے اور تم بھی اپنے لئے لے لینا۔" رات سونے سے پہلے وہ اسے اپنے کل کے پروگرام کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"وہاں جانا ضروری ہے۔" اس نے بے اختیار اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"تو کیا بس مری سے واپس چلے جائیں گے" اب اتنے دن تو ادھر رہ لئے، میرا تو آج ہی ارادہ تھا جانے کا لیکن پہلے ہی اتنا سفر کر کے آئے تھے تب تمہیں تھکاوٹ ہو جانے کے پیش نظر میں نے کل جانے کا سوچا تھا۔" اسے تفصیلاً بتا کر پھر وہ دوبارہ پروگرام ترتیب دینے لگا تھا۔

"اچھا تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم پہلے۔"

"مجھے یہاں بھی نہیں رہنا اور نہ کہیں جانا ہے مجھے واپس جانا ہے۔"

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے تھے۔

اس قدر بیزار کن لہجے پر وہ لب بھینچے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"کیوں۔" اس نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ یکسر ہی گھومنے پھرنے کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

"بس ویسے ہی مجھے ان سب چیزوں کا شوق ہی نہیں ہے، اور میرا دل بھی نہیں لگ رہا یہاں۔" وہ وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں پھر بھی دل نہیں لگ رہا۔" اس نے ایک بار پھر اس کی سابقہ بات فراموش کرتے ہوئے دل میں خوش گمانی کے پھول کھلنے دیے تھے۔

"آپ کی باتوں سے ہی تو دکھ ہوتا ہے مجھے۔"

اس کی نظروں نے تحیر اور بے یقین سے اس کے خوبصورت تیکھے نقش کے حامل چہرے پر منتشر رنگوں کو بکھرتے دیکھا تھا۔

"میری باتوں سے؟ میں نے تم سے کیا کہا

ہے؟" وہ از حد حیران ہوا تھا۔
"میں جانتی ہوں، آپ مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتے، آپ بات بات پر میرا مذاق اڑاتے ہیں، میں کسی بات پر نا سمجھی ظاہر کروں تو مجھے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ آپ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میں اتنی بھی بیوقوف نہیں کہ آپ کا انداز نہ سمجھ سکوں۔" وہ بولتے بولتے رخ پھیر گئی تھی۔
اور وہ تو حیرانی، بے یقینی اور صدمے کی سی کیفیت میں اس کی پشت کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ اتنی عجیب و غریب منطق اور اس درجہ کی بدگمانی بھری سوچ، اس نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔ اب کے وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ اپنے بارے میں ایسی فضول سوچ پر اسے قطعاً کوئی وضاحت نہیں دینی تھی۔ وہ اس کا خیال رکھنے کے پیش نظر اکثر شوخ قسم کے فقرے بول جاتا تھا، وہ اسے خود سے بے تکلف کرنا چاہ رہا تھا اور اس نے اس کے خلوص کو کیا سمجھا تھا؟ دل میں موجود اس کے لئے تمام جذبات جیسے تھک ہار کر اپنی بے وقعتی پر نوحہ کناں ہوئے تھے۔ وجود کے اندر باہر ایک سرد سی کیفیت چھا گئی تھی۔
"بابا! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ منفی سوچ رکھنے والی بیوی کو کیسے ہینڈل کرتا ہے؟" وہ دل ہی دل میں بابا سے مخاطب ہوا۔
"تم تیاری کر لو ہم صبح پانچ بجے یہاں سے لاہور کے لئے نکلیں گے، میں ذرا گاڑی میں پٹرول اور دیگر ضرورت کی چیزیں چیک کرا آؤں تاکہ سفر میں کوئی پریشانی نہ ہو اور معذرت کہ تمہیں میرے ساتھ آنا پڑا، آئندہ کبھی تمہیں دوبارہ یہ زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔" باوجود ضبط کے اس کے لہجے میں تلخی اور خشونت در آئی تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر کی جانب چل دیا تھا۔ جبکہ وہ اب تذبذب کے عالم میں بیٹھی کچھ خفت میں گھرنے لگی تھی۔

+++

"دنیا بھر کی نکمی اور جاہل عورت اللہ نے میرے حصے میں رکھی تھی کیا؟ نہ کسی بات کی تمیز، حد درجہ لاپرواہ۔" بلند آواز میں چیختے ہوئے عاقب کی آواز کمرے سے باہر صحن تک آئی تھی۔ باپ کی آواز کی دھاڑ سے فرش پر بیٹھی کھلونوں سے کھیلتی تین سالہ ننھی روا نے سہم کر ہاتھ میں پکڑے باکس کو نیچے پھینکا تھا۔
"تو لے آؤ کوئی اپنے معیار کی، اپنے قابل لڑکی، جو تمہیں سکھ دے سکے، میں تو بہت نکمی جاہل ہوں نا" وہ روتے ہوئے بولی۔
"بس اب رونا شروع تم عورتوں کو جب اپنی خامیاں چھپانے کو کچھ اور نظر نہیں آتا تو آنسوؤں کا سہارا لے لیتی ہو، اونہہ، وہ بھی کوئی عورت ہے جو وقت پر کھانا ہی نہ دے سکے، پاگلوں کی طرح صبح سے شام تک کام کرتا ہوں، بینک کی نوکری کرنا کتنا مشکل کام ہے یہ تم جیسی فارغ گھروں میں بیٹھی عورتوں کو کیا پتہ گھر آؤ تو پھر کھانے کے انتظار میں بیٹھو، زندگی نہ ہوئی نری مصیبت ہوگئی۔" اس نے کب کا کھانا لا کر اس کے سامنے رکھا تھا لیکن اس کی بڑبڑاہٹ کم نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس کو آئے بمشکل دس منٹ گزرے تھے اور اس پر بھی اسے اعتراض تھا کہ کھانے میں دیر ہوگئی۔
"اب خدا کے لئے مجھے کھانا کھانے دو، یہ رونے کا شغل کچن میں جا کر جاری رکھو اور میرے لئے چائے بھی بنا کر لاؤ، اور اب بولنا نہیں، فضول بول بول کر سر میں درد کر دیا ہے، تمہیں اچھی طرح پتہ ہے مجھے زبان چلاتی عورتیں بہت بری لگتی ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اب میرے آگے سے بولنے لگی ہو۔"

چوارئ فعل بنانے، ... تم ... سے ... تھا
بڑا ... کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
اب وہ کھانے ... میں تھوڑی سی دیر ہوئی تھی اور اس نکمی، پھوہڑ اور نہ جانے کن کن القابات سے اسے نواز دیا تھا، اور اوپر سے اس کی اسکا دل دکھانے والی باتیں، اس کا پارہ مزید چڑھ گیا تھا۔
"ہاں، بولوں گی، اب میں اسی طرح بولوں گی۔ غلط کو غلط کہوں گی، ایسے ہی بکواس کروں گی نہیں ذرتی میں تم سے، سارا سارا دن کولہو کے بیل کی طرح میں گھر کے کام کروں، بچی کو سنبھالوں اور بدلے میں مجھے کیا ملتا ہے سوائے تمہاری پھٹکار کے، کبھی جو تم نے میری کسی خوبی کو سراہا ہو، ہمیشہ کیڑے ہی نکالتے آتے ہیں اور بس۔" اب کے سونیا کی آس سے بھی بلند آواز ابھری تھی۔
"بکواس بند کر، جاہل عورت، تم میں کوئی خوبی ہو تو شمار کروں نا، جھوٹی مرضی تو میں نہیں کر سکتا تمہاری چلتی زبان دیکھ کر کوئی یقین کر سکتا ہے کہ یہ کسی نچلی طرح زبان چلاتی عورت ہی اے پاس ہے۔" اب وہ پہلے سے بھی بلند آواز میں بولا تھا۔
"اور تمہیں چیختے چلاتے دیکھ کر کون یقین کرے کہ یہ بندہ پڑھا لکھا ہے اور بینک میں اچھے خاصے عہدے پر ہے۔" وہ بھی اسی کے انداز میں دوبدو بولی تھی۔
اب کے عاقب نے غصے سے بے قابو ہوتے پاس پڑا پانی سے بھرا شیشے کا گلاس پوری شدت سے زمین پر پھینکا تھا گلاس گرتے ہی کرچی کرچی ہو گیا تھا اور اس ٹوٹنے کی آواز سے روا مزید بری طرح ڈر گئی تھی۔ آنکھوں میں سے آنسو جھل جھل گرنے لگے تھے ڈر کے مارے

[illegible]
دوسری جانب [illegible]
بھائی [illegible]
بھی پیچھے [illegible]
باتیں [illegible]
کی کمزوری [illegible]
پر بھی، کیونکہ ایک بیٹی کی اور ایک بہو [illegible]
بیٹے اور بڑے بیٹے دونوں کی [illegible]
پر ہوتے تھے لیکن ان دونوں کے [illegible] وجود
ایک دوسرے کے لئے بہت اہم اور طاقت تھے۔ اس لئے سونیا اور عاقب کی لڑائی میں وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ڈھال بن گئی تھیں۔
یہ نئی صورتحال امینہ کے لئے بہت پریشان کن تھی۔ عاقب کی طبیعت شروع سے ہی ایسی غصیلی تھی۔ وہ ماں ہونے کے باوجود اس کے غصے سے ڈرتی اسے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ حالانکہ سکندر غصے کے بہت تیز تھے لیکن اس کے غصے کے آگے تو وہ بھی خاموش ہو جاتے تھے۔ پہلے سونیا اس کے سامنے چپ کر جاتی تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ بھی آگے سے جواب دینا شروع ہوگئی تھی۔
پہلے وہ ان کی عزت کرتی تھی لیکن اب وہ اسے عاقب کے سامنے خاموش رہنے کی تلقین کرتیں تو وہ غصے سے بھڑک پڑتی اور ان سے بھی بدتمیزی کر جاتی تھی۔ اس لیے انہوں نے تو خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی۔
ان کی تو تو، میں میں ابھی بھی جاری تھی۔
"یہ آپ کی بھابھی کتنی بدتمیز ہیں۔ میں تو ان کے لڑائی جھگڑے دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہتی ہوں، ٹیپیکل جاہل عورتوں کی طرح لڑتی، جھگڑتی ہیں اور شوہر کی کوئی عزت ہی نہیں، جیسے

تم،ہم کہہ کر مخاطب کرتی ہیں اللہ معاف کرے، ایسے عورتیں بھی ہوتی ہیں۔" اپنے کمرے میں بیٹھی آئمہ نے نزاکت سے آنکھوں میں حیرانی سموئے فائق سے کہا۔

"ان کے جھگڑے تو یونہی چلتے رہیں گے، یہ کوئی نئی بات نہیں، ابھی تو تم اس گھر میں نئی نئی ہو آگے آگے دیکھنا تمہیں اس گھر میں اور بہت نمونے ملیں گے، چھوڑو ہم نے کیا لینا، تمہیں خود کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے اپنے گھر والوں کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی ہو۔

"میں تو ایسے ماحول میں نہیں رہ سکتی، مجھے عادت نہیں ہے یوں چیخ چیخ کر بولنے کی اور ایسی بدتمیزیوں کی۔" اس نے فائق کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے ناز بھرے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں یہاں رکھنا بھی نہیں چاہتا، ہمارے دفتر کے قریب جو رہائشی کالونی ہے۔ وہاں کرائے اتنے زیادہ نہیں ہیں، امید ہے مناسب پیسوں میں گھر مل جائے گا۔ ہم جلد ہی وہاں شفٹ ہو جائیں گے میں خود یہاں نہیں رہنا چاہتا، چھوڑو ان کو، کوئی اچھی بات کرو ہم نے ان کے لڑائی جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔"

فائق کی بات نے اس کو اندر تک خوش کر دیا تھا۔ وہ تو شروع سے سوچتی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ اسے علیحدہ گھر لینے پر آمادہ کرے گی۔ ایسے تو کچھ کرنے کی زحمت ہی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔ گیند تو اس کی کورٹ میں خود ہی آ گئی تھی کے مصداق اس کے شوہر کو خود ہی اپنے گھر سے، گھر والوں سے کوئی سروکار نہیں تھا تو اسے کیا غرض ہوتی تھی۔ وہ بھی سرخوشی موضوع بدلتی شام میں کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام ترتیب دینے لگی۔

☆☆☆

"ہر وقت دفتر کے کاموں میں مصروف رہتے ہو، شام ہو جاتی ہے آتے آتے، چلو آگے پیچھے تو مصروف ہوتے ہو لیکن چھٹی والے دن تو شائزہ کو کہیں باہر لے جایا کرو، بچی بیچاری سارا دن گھر میں بور ہوتی رہتی ہے، مری سے بھی جلدی واپس آ گئے تھے۔ حالانکہ چھٹی لے کر گئے تھے پھر بھی انہوں نے بلا لیا میرا تو غصہ ہی نہیں ختم ہوتا، کیا تمہارے بغیر ان کے کام نہیں ہو سکتے تھے۔" وہ سب دوپہر کا کھانا کھا کر قہوہ پی رہے تھے۔ جب نائلہ اس کی کھنچائی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دفتر والوں کو بھی برا بھلا کہنے لگیں۔

اس نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے شکایتی نظروں سے اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھی شائزہ کو دیکھا تھا۔

اس نے سٹپٹا کر نظریں نیچی کر لی تھیں۔

ہنی مون سے جلدی واپسی پر سب نے ہی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ کیونکہ اس کی ابھی کافی چھٹیاں پڑی تھیں۔ تب اس نے یہ بہانہ بنا لیا تھا کہ اس کے باس نے اس کی چھٹیاں منسوخ کر کے اسے جلدی واپس بلا لیا ہے۔

"چلو، جو ہوتا ہے بہتری کے لئے ہوتا ہے، پھر کبھی دوبارہ پروگرام بنا لینا، لیکن تمہاری ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ چھٹی والے دن ہماری بیٹی کو ضرور کہیں نہ کہیں لے جایا کرو کل اتوار ہے۔ آج شام میں کہیں، گھوم پھر بھی آؤ اور واپسی پر شائزہ کو اس کے گھر بھی ضرور لے جانا، سہیل بھی کہہ رہا تھا تم لوگوں نے تو میری بیٹی پر قبضہ ہی کر لیا ہے۔ وہ بہت کم آتی ہے ہماری طرف۔"

سلیمان صاحب نے بھی ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

"میں نے تو ان سے کہا بھئی، اب وہ ہماری بیٹی بن گئی ہے، آپ نے ملنا ہے تو خود آ جایا کریں، کیوں ٹھیک کہا نا؟" انہوں نے مسکرا کر پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو باقی سب کی نظریں بھی اس کی سمت اٹھیں۔ ایک دم سے وہ سب کی نگاہوں کا مرکز بنی تو اس نے بے حد گھبرا کر فوراً نظریں نیچی کیں، اسے اپنی ہتھیلیاں نم سی محسوس ہونے لگیں، مارے گھبراہٹ کے وہ کبھی دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرتی کبھی دائیں ہاتھ میں پکڑا انگوٹھے کا کپ لبوں سے لگاتی اور کبھی بائیں ہاتھ سے بغیر آگے آئے بالوں کو غیر ارادی طور پر کانوں کے پیچھے اڑسنے لگتی۔ باقی سب تو اب باتوں میں مصروف ہو گئے تھے لیکن یاسم کی توجہ مکمل طور پر اس کی حرکات و سکنات پر تھی۔

☆☆☆

گھر سے باہر نکلے تو موڈ خود بخود ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ خلاف معمول آج شائزہ بھی کافی بدلی بدلی لگ رہی تھی ورنہ تو وہ اس سے بات تک نہ کرتی تھی لیکن آج زیادہ نہیں لیکن بول رہی تھی۔ اس کا اتنا بولنا ہی اسے خوشی سے دوچار کر رہا تھا۔ رات کا کھانا انہوں نے باہر ہی کھایا تھا۔

"تم نے اپنے گھر بتا دیا تھا کہ آج ہم آئیں گے۔" پی۔ سی ہوٹل کی پارکنگ سے گاڑی نکالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔"

اس نے چونک کر دیکھا تھا۔

"کیوں، جانا نہیں ہے کیا؟"

"آپ کی مرضی ہے۔" اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا، یہ لڑکی قدم قدم پر اس کو حیران کرتی تھی، اس نے تو سن رکھا تھا کہ لڑکیاں میکے جانے کے نام پر ہی خوش ہو جاتی ہیں اور اگر ایک ہی شہر میں میکہ اور سسرال ہو تو وہ بھاگ بھاگ کر میکے کا رخ کرتی ہیں لیکن اس کا معاملہ قدرے الٹ تھا۔ اس نے بھی خود سے جانے کی فرمائش نہیں کی تھی ان کی شادی کو دو ماہ ہونے والے تھے لیکن ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود وہ ابھی تک وہاں برائے نام ہی گئی تھی حالانکہ ان کے گھروں میں زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا۔ آج بابا نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ ادھر سے ہو کر آنا ہے۔ اس لئے اس نے مزید اس کی رائے لینے کی بجائے اس کے گھر کے راستے کی طرف گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

شائزہ کے گھر میں بہت اچھے طریقے سے ان کا استقبال کیا گیا تھا۔ ان کو اچانک دیکھ کر سب نے ہی بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"واہ بھئی! آج تو میری بیٹی آئی ہے، بتا کر آتے کھانے پر اچھا سا اہتمام کرتے۔" اس سے گلے ملتے سہیل انکل نے کہا تو اس کا دل چاہا کہ انہیں بتائے کہ آپ کی آدم بیزار صاحبزادی نے آپ کو بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

کچھ کہنے کی خواہش دل میں دباتے بظاہر وہ بولا۔

"نہیں کھانا تو ہم ابھی کھا کر ہی آئے ہیں بس اچانک آپ کی طرف آنے کا پروگرام بن گیا۔" وہ مسکراتے ہوئے وضاحت کرنے لگا۔

ہوٹل میں کھانا کھانے کا سن کر ان کے پاس کھڑی سونیا نے حسرت بھری نظر شائزہ پر ڈالی تھی۔

"اچھا کیا آ گئے، چلو کھانا تو ادھار رہا لیکن اب جانے کی جلدی مت کرو اور آرام سے کچھ دیر بیٹھو، چائے پی کر جانا۔" انہوں نے پیار بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا وہ ان کی آمد سے کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہی

تھی۔ جبکہ وہ کسی طرح کا بھی تاثر دیے بغیر یوں لاتعلق سی بیٹھی تھی گویا اس کا ان کی گفتگو سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

اس نے محسوس کیا تھا وہ اپنے گھر والوں سے کچھ زیادہ ہی رکھائی کا مظاہرہ کرتی ہے، اس کے انداز و اطوار دن بدن اس کے لئے جیسے معمہ بنتے جا رہے تھے۔

''اس کا صرف مجھ سے ہی نہیں سب سے ہی یوں رکھا پھیکا رویہ ہے۔'' اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

''سونیا بیٹا اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔'' سہیل انکل کی آواز پر وہ شائزہ سے نظریں ہٹائے چہرے پر مسکراہٹ سجائے ثاقب اور سہیل انکل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''باسم بھائی شائزہ کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ حالانکہ شائزہ کیسے خاموش سی اکھڑی اکھڑی سی، چپ چپ سی رہتی ہے لیکن باسم بھائی کتنے خوش اخلاق ہیں۔ ایک میرا شوہر ہے پہلے دن سے ہی رعب ڈالا، کبھی جو نرمی سے بات کی ہو، ہر وقت لڑنے کو تیار۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرے۔

''ثاقب بھائی نے بھی کیسے آئمہ کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا ہے، کام کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتے، دو ماہ ہونے والے ہیں ان کی شادی کو، ابھی تک اپنے کپڑے خود استری کرتے تھے۔ میں نے شروع سے ہی ثاقب کی کتنی عزت کی، چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا لیکن بدلے میں ہمیشہ ڈانٹ ڈپٹ ہی ملی، محبت بھرے دو بول بھی کبھی سننے کو نہیں ملے، پتہ نہیں اس کے لہجے میں، اس کے دل میں اتنی تلخی کیوں ہے؟ وہ جب سے موازنے کے چکر میں پڑی تھی کچھ زیادہ ہی دل گرفتہ رہنے لگی تھی۔

''تمہاری چائے نہیں بنی ابھی تک، انہوں نے واپس گھر بھی جانا ہے۔ کچن کے دروازے کے پاس کھڑے ثاقب کی کھردری آواز ابھری تھی۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی، جلدی سے اس نے آنسو صاف کیے۔

''بس لا رہی ہوں۔'' بغیر اس کی طرف رخ کیے وہ بولی۔ اس کا جواب سن کر وہ واپس پلٹ گیا، وہ ٹھنڈی سانس بھر کر چائے کپوں میں ڈالنے لگی۔

گھر واپسی پر خاموشی سے گاڑی چلاتے ہوئے وہ اس کے رویے پر غور کرتا اس کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلے تھے تو راستے میں وہ کچھ نہ کچھ بات کر رہی تھی لیکن اپنے گھر سے واپسی پر تو وہ بالکل خاموش سی ہو گئی تھی۔

صبح چھٹی تھی اور اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج جلدی نہ سوئے بلکہ اس سے باتیں کرے لیکن وہ تو وہاں سے آتے ہی سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔

آج کئی دنوں سے دل میں سر اٹھاتے خدشے نے شدت سے زور پکڑا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ شائزہ کے گھر والوں نے زبردستی اس کی شادی، مجھ سے کی ہے۔ کیا پتہ اس کی کہیں اور مرضی ہو، اس لئے اس کا رویہ ان کے ساتھ بھی اکھڑا اکھڑا سا ہے، تو کیا میں اس کی زندگی میں زبردستی شامل کیا گیا ہوں؟'' طرح طرح کی سوچیں ذہن و دل کی آماجگاہ بنی ہوئی تھیں اگر ایسا تھا تو بہت غلط ہوا تھا۔ وہ تو اپنی زمانہ طالبعلمی میں اس کی طرف خود دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا کہ کیا پتہ دوسرا اس سے دوستی نہ کرنا چاہتا ہو اور اس کے ہاتھ بڑھانے پر مروت سے اس سے دوستی کے لئے، تو وہ کیوں زبردستی کسی سے دوستی کرے، اور یہاں اس کی زندگی میں کہیں ایسا تو نہیں ہو گیا کہ اس کی شریک حیات اور اس میں مجبوری اور زبردستی کا رشتہ استوار ہے۔ اس تکلیف دہ سوچ نے اس کے اندر تک سناٹا بھر دیا تھا۔ مرد محبت کرتا ہے تو بدلے میں محبت چاہتا بھی ہے۔ وہ اس سے اگر یہ چاہتا تھا تو کچھ غلط تو نہ تھا وہ اس کی بیوی تھی۔ وہ اس کا حق رکھتا تھا۔ ہر مرد چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اس کی پیش قدمی کا مثبت جواب دے۔ بہترین عورت وہ ہوتی ہے جو اپنے وجود کی حفاظت کرے، اپنے احساسات، جذبات پر بند باندھنا جانتی ہو لیکن غیر محرموں کے لئے، اس کے لئے نہیں جسے خدا نے بطور اس کا محرم چنا ہو، وہ اگر اس سے بھی ایسا سرد رویہ اختیار کرے گی تو وہ بار بار پیش قدمی نہیں کرے گا، اگر وہ نیکی اور بدی کے راستے میں تفریق نہیں کرتا تو پھر وہ چور راستے تلاش کر لے گا، وہ عورت کے پلو سے بندھا نہیں رہے گا بلکہ نئی دنیائیں دریافت کرے گا کہ وہ دریافت کا پرندہ ہے۔ اور اگر وہ فطری طور پر ایسے کاموں سے دور بھاگتا ہے تب بھی وہ نہ محسوس انداز میں دور [illegible] جائے گا۔ بیوی کے بار بار گریز سے اس کے دل میں بد گمانیوں کے بیج نمو پانا شروع کر دیں گے۔ شوہر جتنا بھی اچھا ہو اسے نظر انداز کرو تو اس کے دل کی سرزمین میں شک کی نوکیلی خار دار جھاڑیاں اگنے میں بس چند لمحے ہی درکار ہوتے ہیں۔ اگر عورت کو اپنے تحفظ کے لئے شوہر کی مضبوط بانہوں کا سہارا درکار ہوتا ہے تو مرد کو بھی تو بیوی کی محبت بھری پناہیں درکار ہوتی ہیں۔

اس نے ایک نظر اس کے سوئے ہوئے وجود پر ڈالی، نہ جانتے ہوئے بھی آج اس کے دل میں شک کا ناگ اپنا پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

+++

''اف ماما! اب کھانا دے بھی دیں قسم سے ایک نہیں، دو نہیں اکٹھے پانچ سات چوہے پیٹ میں ادھر سے ادھر گردش کر رہے ہیں پکی۔'' رات کے کھانے کے وقت ثمن کا واویلا جاری تھا۔ آج کھانے میں تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے ثمن کی آہ و زاریاں جاری و ساری تھیں۔ اس سے بھوک بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ نائلہ کچن میں تھیں۔ لاؤنج کے دائیں طرف کچن تھا اور لاؤنج میں ہی کچن کی عین سامنے تھوڑی سی جگہ کو ڈائننگ ٹیبل رکھ کر ڈائننگ روم کے طور پر مختص کیا گیا تھا۔ ثمن کھانے کے لئے برتن رکھنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بول رہی تھی۔ بابا اور باسم لاؤنج میں بیٹھے آپس میں سیاست سے ملحقہ کسی موضوع پر بات چیت کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی باتوں سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جبکہ وہ ان کے سامنے والے صوفے پر حیران سی، کچھ سوچتی ہوئی الجھی الجھی بیٹھی تھی۔

''بابا! ماما مجھے بریانی کا دم نہیں کھولنے دے رہیں، کہتی ہیں ابھی پانچ منٹ اور انتظار کرو۔'' رونی صورت بنا کر بولتی ثمن نے اب باپ کے پاس آ کر شکایت کی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر قدرے دلچسپی سے اس کو دیکھا۔

''بالکل ٹھیک کر رہی ہیں، بھوکی ندیدی دو منٹ صبر نہیں ہوتا۔'' باسم نے اس کی پونی ٹیل کو ہلکا سا کھینچتے ہوئے کہا تو سلیمان صاحب کھل کر مسکرا دیے۔

جواباً وہ بلند آواز میں احتجاجاً چیخی تھی۔

''اف بھائی بھی ماما کے ساتھ مجھ غریب پر ظلم کرنے میں شریک ہو گئے ہیں، بابا پلیز آپ تو میرا ساتھ دیں۔'' اس نے ان سے التجا کی تو

انہوں نے ہنستے ہوئے لاڈ سے اسے اپنے ساتھ لگایا اور بولے۔

”بھئی میں تو اپنی بیٹی کے ساتھ ہوں، اب کس نے میری بیٹی کو تنگ نہیں کرنا۔“ اس نے خوش ہو کر بھائی کو انگوٹھا دکھا کر فرضی کالر جھاڑے تھے۔

اس نے ہنستے ہوئے اس کی ناک زور سے دبائی تھی۔ اس نے پھر احتجاج کیا تھا تب ہی کچن سے لاؤنج کی طرف آتی ہنستی مسکراتی نائلہ نے کھانے کے لئے انہیں بلایا تھا۔

کتنا بھرپور منظر تھا۔ وہ ان سب کو حیرت سے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حسرت یاس کی کیفیت اور بے پناہ استعجاب کے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ تب ہی کھانے کے لئے اسے اٹھنے کا اشارہ کرتے باسم نے اس کے چہرے پر پھیلے رنگوں کو دیکھا تھا۔

اسے بے اختیار وہ بچپن میں پڑھی ایک کہانی ”ایلس ان دا ونڈر لینڈ“ کی ایلس لگی تھی جو ایک اجنبی انجانی دنیا میں آ کر حیران ہوتی رہتی ہے وہ بھی تو جب سے اس کے دل کی دنیا آباد کرنے آئی تھی آباد تو کیا کرتی ابھی تک اس کیفیت کا شکار تھی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس کا گھر اس کے لئے ونڈر لینڈ کیوں تھا؟

✤✤✤

اس کی شادی کو دو ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن جانے کیا بات تھی کہ وہ کچھ بھی پکانے سے گھبراتی تھی اس کی گھبراہٹ دیکھتے ہوئے نائلہ اسے زیادہ کہتی بھی نہیں تھیں کہ آہستہ آہستہ وہ خود ہی سیٹ ہو جائے گی۔ ان کا محبت بھرا رویہ ہی تھا کہ وہ خود بخود کچن کے کاموں کی طرف متوجہ ہونے لگی تھی۔ ثمن یونیورسٹی چلی جاتی باسم اور بابا اپنے اپنے دفتر چلے جاتے۔ وہ بیٹھی بیٹھی اکتا جاتی تو نائلہ کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کروا دیتی۔ وہ اتنی محبت سے بات کرتیں، تھوڑا سا کام کرنے پر اتنی حوصلہ افزائی کرتیں کہ اس کی جھجک خود بخود ہی کم ہونی شروع ہو گئی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں جو ان کے بارے میں دل میں منفی خیالات ابھرتے تھے وہ ان کے اچھے رویے کی بدولت خود ہی ختم ہوتے گئے تھے۔

بابا اور باسم کے آنے کا وقت تھا۔ دونوں آگے پیچھے ہی آتے تھے۔ نائلہ روٹیاں بنا رہی تھیں اور وہ سالن گرم کر رہی تھی۔ تب ہی اطلاعی گھنٹی بجی۔ وہ دروازہ کھولنے باہر کی جانب چل دی، دروازہ کھولا تو بابا کے ساتھ ابو بھی تھے۔

انہوں نے والہانہ انداز میں بڑھ کر اسے پیار کیا تو وہ بھی دل میں جتنی بھی ناراضگی رکھتی ہو ان کو یوں سامنے دیکھ کر خود کو خوشی کا اظہار کرنے سے روک نہ پائی تھی۔ باپ کو سامنے دیکھ کر بے ساختہ خوشی آنکھوں سے چھلکی تھی۔

”کیسی ہے میری بیٹی۔“ وہ اسے ساتھ لپٹائے اندر کی جانب بڑھے۔

”جی! بالکل ٹھیک۔“ وہ دھیمی سی آواز میں بولی۔

”جلدی سے کھانا لگا دو بیٹا! بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔“ بابا کے کہنے پر وہ سر ہلاتی کچن کی جانب بڑھی۔

”اچھا! تو میری بیٹی سے کام کروایا جا رہا ہے۔“ اسے اپنی پشت پر ابو کی آواز سنائی دی جو ازراہ مذاق کہہ رہے تھے۔

”جی جناب! اور تمہاری بیٹی کہاں اب شائزہ میری بیٹی ہے میں تو یونہی کام کرواؤں گا۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو جواباً ابو کی بھی ہنسی کی آواز ابھری تھی۔ کچن کی جانب جاتے

اس کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی چھلکی تھی۔ جسے اس نے فوراً ہتھیلیوں کی پشت سے صاف کر لیا تاکہ کہیں نائلہ کی نظر نہ پڑ جائے۔

✤✤✤

رات دس بجے کا وقت تھا جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ باسم دفتر کی کچھ فائلز پر کام کر رہا تھا جبکہ وہ غائب الذہنی کی کیفیت میں اپنے سامنے رسالہ کھولے بیٹھی تھی۔ اس نے دستک کی آواز میں اسی کیفیت میں گھری نہ جانے کس عالم میں دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ تب ہی باسم نے بھی اس کی سمت دیکھا تھا۔ اس کے سامنے فائلیں بکھری پڑی تھیں۔ اس نے اسے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا لیکن وہ عجیب ہونق پنے سے اسے دیکھتی ٹس بنی بیٹھی رہی۔ اسے اب اس کی ایسے انداز سے چڑ ہونے لگی تھی۔ ایک تیز نظر اس پر ڈال کر اس نے جھٹکے سے سامنے کھلی فائل بند کی اور غصے سے پاؤں پٹختا دروازے کی سمت بڑھا۔ وہ کتاب سے نظریں ہٹائے نہ سمجھی سے اس کے غصے اور جھنجھلاہٹ کو دیکھے گئی۔

”اوہ۔“ ایک دم سے اس کے غصے کی وجہ سمجھ میں آئی تھی کہ اس نے اسے دروازہ کھولنے کا کہا تھا۔ وہ خجالت کے احساس میں گھرنے لگی۔

”ایک تو پتہ نہیں مجھے دیر سے کیوں سمجھ آئی ہے؟“ وہ اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگی۔ باسم نے دروازہ کھولا تو دوسری طرف ثمن تھی۔

”سوری بھائی! آپ کو اس وقت تنگ کیا، آپ سے ضروری کام تھا۔“ ثمن وضاحت دینے والے انداز میں بولی۔

”ارے، رے سوری کی کیا بات ہے۔ میری گڑیا، ایک چھوڑ جتنے مرضی کام کہو۔“ وہ پیار سے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولا۔

اس نے چونک کر اس سمت دیکھا۔ اس کے لہجے میں بہن کے لئے پیار ہی پیار چھلک رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ جس قدر جھنجھلا کر اٹھا تھا شائزہ کو لگ رہا تھا کہ وہ آنے والے پر برس پڑے گا لیکن یہاں تو اس کی سوچ کے برعکس معاملہ تھا۔

”بھائی! مجھے اپنی دوست سے ضروری نوٹس لینے ہیں، صبح ٹیسٹ ہے، آج میں یونیورسٹی میں لینا بھول گئی تھی۔ آپ مجھے لے جائیں گے قریب ہی گھر ہے اس کا۔“

”بس اتنی سی بات تھی جس کے لئے پریشان ہو رہی تھی، تم چلو میں آتا ہوں۔“ وہ اسی محبت اور نرماہٹ بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

”بہت شکریہ بھائی!“ ثمن خوشی سے کھنکتی آواز میں کہتی پلٹ گئی۔ باسم نے اندر آ کر سلیپر پہن کر گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر کی سمت چل دیا۔ جبکہ وہ غائب دماغ سے سن سی کیفیت میں گھری بیٹھی رہی۔

”کیا بھائی ایسے بھی ہوتے ہیں؟“

ذہن و دل میں جھگڑے چل رہے تھے۔ کئی تلخ یادیں، باتیں آج بار بار اپنی جھلک دکھلا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔

✤✤✤

امینہ بہت دیر تک اپنے سامنے اپنے ہی وجود کے ٹکڑے کو پیاسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں اس کے لئے جتنا پیار موجزن تھا۔ اس کی آنکھوں میں ان کے لئے اتنی ہی لاتعلقی اور بے حسی تھی۔ وہ یہ سب کر سکتا تھا کہ وہ ان کی اولاد تھا۔ جبکہ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ ماں تھیں۔

اس نے بہت نام اور معمول کے سے انداز
میں انہیں اپنے جانے کا عندیہ دیا تھا۔ کسی نے
اس گھر میں ان کی یہی حیثیت تھی۔
کوئی بھی کام کرنا ہو، یا کوئی اہم فیصلہ ہوا نہیں
مطلع کیا جاتا تھا۔ کبھی ان کی رائے نہیں لی
صرف
جاتی تھی۔ چنانچہ فائق نے بھی اس بات کے
پیش نظر انہیں اپنے جانے کی اطلاع دی تھی ان
سے پوچھا تک نہیں تھا۔ لیکن ماں کو چونکہ اپنی
اولاد پر ایک مان سا ہوتا ہے۔ بس وہ مان ٹوٹا
تھا۔ اس لئے دل دکھا تھا لیکن انہوں نے ظاہر
نہیں کیا تھا کہ انہیں تو خوشی میں بھی اپنے
جذبات کا اظہار کرنا نہیں آیا تھا کجا کہ وہ اپنی
اداسی ظاہر کرتیں۔ وہ اس کی خوشی خراب نہیں کرنا
چاہتی تھیں اس لئے اسے ڈھیروں دعائیں دی
تھیں۔ امینہ کو بتانا تو بہت دور کی بات اس نے
سہیل صاحب کو بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔
اس کا انہیں بہت رنج ہوا تھا۔
امینہ پہلی دفعہ انہیں یوں دلگرفتہ دیکھا تھا۔
انہوں نے ہمیشہ اپنی من مانی کی تھی شاید اس
لئے زعم ٹوٹا تھا تو دکھ زیادہ ہوا تھا۔
''اگر ہمارا روز دفتر آنے جانے کا مسئلہ نہ
ہوتا تو میں تو کبھی اس گھر سے جانے کے بارے
میں سوچتی بھی نہیں، میں نے تو فائق سے کہا تھا
کہ کوئی بات نہیں گھر دور ہے تو کیا ہوا لیکن وہ
کہتے ہیں کہ وہ تھک جاتے ہیں۔ آپ سب سے
اس گھر سے اتنی محبت، اتنی انسیت ہو گئی ہے۔
جانے کو دل ہی نہیں کر رہا۔'' جانے سے پہلے
آئمہ نے بڑی محبت سے امینہ کے گلے لگتے
ہوئے کہا تھا کہ کہیں اس پر کسی طرح کا الزام نہ
آئے۔ دو چار آنسو بھی زبردستی آنکھوں میں بھر
لائی۔
سدا کی معصوم امینہ تو اس کی اس بات پر ہی
نثار ہو گئیں اور جھٹ سے اسے گلے لگا کر
ڈیروں دعائیں دے ڈالی تھیں، ان کے لئے
شاید اتنا ہی غنیمت تھا کہ ان کے اپنے بیٹے کو تو یہ
بھی توفیق نہ ہوئی تھی کہ جانے سے پہلے ان سے
صحیح طرح مل ہی لے۔
سونیا نے ناک سکیڑ کر ناگواری سے اسے
دیکھا۔
''توبہ! کتنی ڈرامے باز ہے، امی جیسی سادہ
عورت کو بیوقوف بنا سکتی ہے۔ مجھے نہیں، اونہہ،
اتنی محبت تھی گھر سے، تین ماہ ہونے کو آئے
شادی کو، محترمہ صفائی کے نام پر ایک تنکا تک تو
گھر کا اٹھا نہ سکیں، اور کرنے لگی گھر سے پیار کی
بلند و بانگ جھوٹے دعوے۔'' اس نے دل ہی
دل میں اس کے خوب لتے لیے۔ گو کہ وہ جتنا
عرصہ بھی رہی ان کا اچھا وقت ہی گزرا تھا۔ سونیا
کو اس سے کوئی پرخاش تھی نہ ہی کوئی حسد، لیکن
فائق کا اسے اتنی زیادہ اہمیت دینا اور اس کا سب
گھر والوں کے سامنے ضرورت سے زیادہ خود کو
معصوم ظاہر کرنا اسے لاشعوری طور پر اس سے چڑ
میں مبتلا کر دیتا۔
''بیوی خوبصورت ہو تو شوہر اس کی ہر بات
مانتا ہے اور قدر بھی کرتا ہے۔'' یہ بات وہ اکثر
شادی سے پہلے سنا کرتی تھی لیکن شادی کے بعد
اس کے ساتھ تو ایسا کچھ نہ ہوا تھا حالانکہ وہ اچھی
خاصی خوبصورت تھی تب اسے یہ بات اکثر غلط
لگا کرتی لیکن اب تو وہ اس بات کو بالکل غلط تصور
کرتی تھی۔
''اگر یہ سچ ہوتا تو آئمہ جیسی واجبی شکل کی
لڑکی یوں شوہر کے دل پر راج نہ کر رہی ہوتی۔''
وہ کتنے پل رشک بھری نظروں سے اسے دیکھتی
رہی تھی۔
فائق اور آئمہ کے جانے کے بعد کئی دن
امینہ چھپ چھپ کر روتی رہیں۔ حالانکہ آئمہ
زیادہ سے زیادہ ان کی طرف آنے کی یقین دہانی
کروا کر گئی تھی لیکن وہ جانتی تھیں کہ ایک ہی گھر
میں رہ کر ان کے بیٹے کو وہ نظر نہیں آتی تھیں تو کیا
دور جا کر وہ انہیں یاد بھی رکھ پائے گا؟

✦✦✦

اس کی طبیعت آج صبح سے ہی بوجھل تھی۔
ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا شاید موسم کی تبدیلی
کا اثر تھا۔ اس لئے دفتر سے بھی جلدی نکل آیا
تھا۔ گھر آتے ہی اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا
کہ وہ بستر پر گرے اور لمبی تان کر سو جائے۔
''اسلام علیکم۔'' کمرے میں داخل ہوتے
ہی اسے وہ سامنے بیٹھی نظر آئی تو سلام کیا۔
''وعلیکم السلام۔'' اس نے ایک سرسری سی
نظر اس پر ڈال کر سلام کا جواب دیا اور نظریں
دوبارہ ہاتھ میں پکڑی کتاب پر مرکوز کر لیں۔
وہ ایک خاموش نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔
دھیرے دھیرے اسے سے وابستہ اس کی
توقعات ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر وہ اس کے
رویے میں تبدیلی لانے کا خواہاں ہوتا، اسے
اعتبار دینے کی کوشش کرتا تو وہ اسے بھی منفی انداز
میں دیکھتی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا وہ ایک پتھر کی
مانند ہے۔ جس سے وہ سر ٹکراتا رہتا تو اس پر پھر
بھی اثر نہیں ہوتا وہ خود ہی زخمی ہوتا، وہ سارے
سپنے، ساری خوش گمان سوچیں جو تین ماہ پہلے تک
اس کی پلکوں کی دہلیز پر گھر بنائے براجمان رہتی
تھیں، ایک ایک کر کے اپنے جذبوں کی بے
وقعتی پر چپ چاپ سر جھکائے رخصت ہوتی جا
رہی تھیں۔
وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا تو وہ ہنوز
اسی انداز میں بیٹھی تھی۔ اسے شدت سے آج
اس پر غصہ آیا تھا۔ اس نے نہ ہی اس نے کھانے
کا پوچھا تھا اور تو اور یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ آج
وہ جلدی کیوں آیا ہے؟ ان تین ماہ میں اس نے
کبھی شائزہ کو اپنے لئے فکرمند نہیں دیکھا تھا۔
جیسے اسے اس کی ذات سے کوئی سروکار کوئی غرض
نہ ہو، اس عرصہ میں اس نے یہ بات محسوس کی تھی
کہ اب وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کے گھر
والوں سے قدرے بے تکلف ہو گئی تھی ماسوائے
اس کے۔ فی الحال اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا
کیونکہ وہ گھر میں اپنی وجہ سے کوئی پریشانی پیدا
نہیں کرنا چاہتا تھا، بہت دفعہ دل چاہتا کہ ماما، بابا
سے اس کے معاملے پر بات کرے لیکن ہمیشہ
ان کی پریشانی کے ڈر سے خاموش ہو جاتا۔
''چائے مل جائے گی؟'' وہ اس کے کسی کام
میں دلچسپی نہیں لیتی تھی تو وہ بھی اس سے کوئی کام
نہیں کہتا تھا لیکن آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو
مارے باندھے اسے کہہ ہی دیا۔
''جج...... جی، م...... میں چائے بناؤں۔''
اس کی آنکھوں میں وہی معمول کے مطابق
گھبراہٹ در آئی تھی۔ جسے اس نے انتہائی تیکھی
نظروں سے دیکھا تھا۔
''کیوں؟ پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کو تو نہیں
کہا، ایک کپ چائے بنانے کا کہا ہے۔'' ایک
طبیعت اتنی خراب تھی اوپر سے اس کا وہی روتا
دھوتا انداز، وہ اب اس کے اس انداز سے بہت
اکتانے لگا تھا۔ اس کے تیز لہجے پر وہ گھبرا کر اٹھی
تھی۔ ایک دم سے کتاب ہاتھ سے گری،
آنکھوں سے ڈر چھلکنے لگا۔
اس نے نہ تو اسے ڈانٹا تھا اور نہ ہی اس پر
غصہ کیا تھا۔ صرف اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ
تھی جس سے وہ اتنا ڈر گئی تھی۔
وہ چند ثانیے لب بھینچے تاسف سے اسے
دیکھتا رہا تھا اور پھر خود ہی چائے بنانے کا سوچتا

ایک جھٹکے سے اٹھا تھا۔

اس کے یوں غصے سے اٹھنے پر نہ جانے اس نے کیا معنی اخذ کیے تھے کہ وہ مزید سہم کر پیچھے ہٹی تھی۔ ڈر کے مارے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

اسے شدید غصہ آ گیا تھا۔

اس کے پاس سے گزرتے ہوئے بمشکل خود پر ضبط کرتے اس نے ایک تند نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اس کا ڈر دور کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس وقت جب اسے اپنی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی ایسے میں اس کی یہ خود ساختہ مظلومیت زہر لگ رہی تھی وہ غصے سے دروازہ کھولتا کچن کی سمت چل رہا تھا۔

کچن میں آ کر برنر چلایا، ساس پین نکال کر اپنے لیے چائے رکھی اور خود بے دلی سے کچن میں رکھا۔ اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔ دل میں اندر تک اداسی اتر گئی تھی۔ سر میں پہلے ہی درد تھا اب مزید ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو مسلنے لگا۔ گھڑی میں وقت دیکھا اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے۔ ماما اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ ثمن ابھی تک یونیورسٹی سے نہیں آئی تھی۔

اسے زندگی کے سفر میں ڈری سہمی خوفزدہ سی شریک حیات کی کبھی خواہش نہیں رہی تھی۔ اسے دوسرے پر بلاوجہ رعب جھاڑنا سخت برا لگا کرتا تھا۔ وہ تو دفتر میں اپنے ماتحتوں کی بڑی سے بڑی غلطیاں محض اپنی اس عادت کی وجہ سے نظر انداز کر دیتا تھا اور یہاں یہ حال تھا کہ اس کی اپنی بیوی بلاوجہ اس سے خوف کا شکار رہتی تھی۔ ایک آئیڈیل اور پرسکون زندگی اس کی ترجیحات میں شامل تھیں پھر یہ کیا ہوا تھا؟ زندگی اس کی

ترجیحات میں شامل تھی پھر یہ کیا ہوا تھا؟ کہاں چوک ہو گئی تھی؟ اس نے ہمیشہ صاف ستھری زندگی کی گزاری تھی۔ مخلوط تعلیمی اداروں میں بھی پڑھا تھا۔ لیکن کبھی صنف مخالف سے تعلقات استوار نہیں کیے تھے۔ بے حد اچھے سلجھے ہوئے پروقار سے سہیل انکل سے بابا کی کولیگ ہونے کے ساتھ ساتھ کافی اچھی جان پہچان بھی تھی۔ وہ اکثر ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کا تعلق ملتان سے تھا۔ لاہور وہ نوکری کی وجہ سے تھے اور اکیلے ہی رہتے تھے۔ ان کا خاندان سارا ملتان میں ہی مقیم تھا۔ چھ، سات سال پہلے اس نے بابا سے سنا تھا کہ ان کی فیملی لاہور آ گئی ہے۔ تب بابا اور ماما ایک، دو دفعہ ان کے گھر بھی گئے تھے۔ امینہ آنٹی کہیں آتی جاتی نہیں تھیں اس لئے ماما بھی ان کی طرف کم ہی جاتی تھیں۔ پہلی دفعہ اس نے شائزہ کو تب دیکھا تھا جب وہ ماما کو ان کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ اطلاعی بیل دینے پر شائزہ نے دروازہ کھولا تھا اور ماما کے پیچھے کھڑے اس نے یونہی سرسری سا سامنے دیکھا تھا اور جیسے پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ اتنا مکمل حسن، معصومیت اور حسن کا امتزاج اتنا دلکش لگ رہا تھا کہ وہ اپنی نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ اپنی طرف اس کے یوں دیکھنے پر اس کی لانبی پلکوں میں گھری کانچ سی خوبصورت آنکھوں میں ناگواری کی لہر ابھری تھی اور اس پر اس کا تنک چڑھا سا انداز بے حد دلربا لگ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے جیسے دل ہار گیا تھا۔ حالانکہ وہ کوئی دل پھینک قسم کا لڑکا نہیں تھا۔ لیکن بس وہ اسے پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔ اس کے بعد ایک دفعہ اس نے اسے اپنے گھر اپنی امی کے ساتھ دیکھا تھا۔ تب بھی اس کا روکھا سا انداز اسے اچھا لگا تھا تب اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے لئے

بالکل اجنبی ہے اور لڑکیوں کو انجان لڑکوں کے ساتھ ایسے ہی پیش آنا چاہیے لیکن تب اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سے رشتہ استوار کر کے بھی اسے انجان ہی سمجھے گی۔

وہ جب جب بھی سہیل انکل سے ملا انہیں بے حد خوش اخلاق پایا تھا۔ وہ بہت خود اعتماد، بے حد وجیہہ، شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ سہیل انکل کو دیکھتے ہوئے وہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ بھی ان کی طرح ہو گی اور یہی غلطی کر بیٹھا تھا۔ وہ شکل و صورت میں تو ہو بہو ان کا عکس تھی ویسے ان سے بہت مختلف تھی۔ اس نے شباہت باپ کی پائی تھی تو باقی عادات میں وہ ماں پر تھی۔ سہیل انکل جتنے خود اعتماد تھے امینہ آنٹی اتنی ہی دبو شخصیت کی مالک تھیں اور اس نے یہ خصوصیات ماں سے جیسے مستعار لی تھیں۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے خوش قسمتی سے بڑی اچھی نوکری مل گئی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ماما نے اس کی شادی کا ذکر چھیڑا اور اس سے اس کی پسند پوچھی تو جھٹ سے ذہن کی پردہ اسکرین پر اس کا عکس ہی ابھرا تھا۔ اور اس نے اس کا نام لے دیا تھا۔ تب وہ بی۔ ایس۔ سی کر رہی تھی۔ ماما کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھیں، اسے انہوں نے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی۔

”شائزہ ویسے تو بہت اچھی لڑکی ہے لیکن تمہارے اور اس کے مزاج میں بہت فرق ہے اور عمر میں بھی کافی کم ہے، وہ ثمن کی ہم عمر ہے یعنی تم سے چھ سال چھوٹی۔“ تب اس نے ان کا خدشہ چٹکیوں میں یہ کہہ کر اڑا دیا تھا۔

”آپ فکر ہی نہ کریں میری معیت میں آتے ہی وہ سیدھی ہو جائے گی، آپ کے بیٹے کی کمپنی میں کوئی بور ہو سکتا ہے بھلا، اور اتنی بھی چھوٹی نہیں ہے، ویسے اچھا ہے کہ کم عمر بیوی ذرا دب کر رہتی ہے۔“ اپنی بات کے آخر میں وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔

وہ اتنا خوش تھا کہ پھر ماما نے اس کی خواہش دیکھتے ہوئے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔ بابا کو پوری امید تھی کہ سہیل انکل انہیں انکار کر ہی نہیں سکتے اور یہی ہوا تھا رشتہ مانگتے ہی ان کی طرف سے فوراً اقرار کی سند مل گئی تھی۔ لیکن یہ طے پایا تھا کہ شادی اس کے پیپرز کے بعد ہو گی۔

وہ ان دنوں کتنا خوش رہا کرتا تھا۔ اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھا اور اللہ کا شکر ادا کرتا تو تھکتا تھا کہ کیسے آسانی سے اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ ایک دو دفعہ منگنی کے بعد اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے لیکن ثمن نے بتایا کہ وہ بات نہیں کرنا چاہتی تو اسے اعتراض بھی نہیں ہوا تھا اس نے اسے بھی اس کی فطری شرم و حیا پر معمول کیا تھا۔ ایک سال کا عرصہ پر لگا کر اڑ گیا تھا اور وہ اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی لیکن تب وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ خواہش پوری ہونے کی صورت، میں کتنی بڑی آزمائش اس کی منتظر تھی۔ ماما کی ہچکچاہٹ اب سمجھ میں آ رہی تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ وہ حسن پرست تھا لیکن اتنا بھی نہ تھا کہ اسے بس حسین بیوی ہی چاہیے تھی۔ وہ ہمیشہ سے اپنی زندگی کی ساتھی میں خوبصورتی سے زیادہ اور خوبیاں دیکھنے کا بھی خواہاں تھا۔ جس میں سرفہرست بیوی کا پراعتماد ہونا تھا لیکن یہ خوبی اس میں سرے سے تھی ہی نہیں۔ یہ رائے تو وہ اس کے بارے میں کھل کر دے سکتا تھا کہ وہ کنفیوز پرسنالٹی کی مالک ہے۔ اسے شاید خود بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ لیکن اب جب کہ وہ اس کی زندگی میں شامل ہو چکی تھی تو وہ اس کی کسی خامی کو اجاگر کر کے اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اسے اعتماد دینا

چاہتا تھا لیکن وہ خود کوئی کوشش ہی نہیں کرتی تھی اور ایسی صورتحال میں گھر کر منفی سوچیں اس کے دل کا در کھٹکھٹانے لگ جاتیں۔

''ارے بھائی یہ چائے آپ نے رکھی ہے؟ پک پک کر اس کا تو حشر برا ہو گیا ہے۔'' وہ سوچوں کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا جب اسے ثمن کی آواز آئی اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ہاتھ میں پکڑی فائل کچن کی شلف پر رکھ کر وہ چولہا بند کر کے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔ وہ شاید ابھی یونیورسٹی سے آئی تھی اس نے بے اختیار گہری سانس خارج کی تھی وجود میں تھکن پہلے سے بھی بڑھی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی۔'' چائے کا کپ اسے پکڑاتے ہوئے اس نے تشویش سے دیکھا اس کے چہرے پر تھکن کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں بھی لالی سی اتری ہوئی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہے، بس ذرا ٹمپریچر محسوس ہو رہا تھا اس لئے دفتر سے بھی جلدی آ گیا تھا اب چائے بنانے آیا تھا ساتھ دوائی لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا، پریشانی کی کوئی بات نہیں'' بہن کے چہرے پر پریشانی کے اثرات دیکھے تو اس نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''ماما سے کہہ دیتے اور بھابھی کدھر ہیں؟ ان سے کہہ دیتے، خود کیوں بنا رہے تھے پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اسے کچھ زیادہ ہی فکر ہو رہی تھی اسی لئے مزید استفسار کیا۔

شائزہ کے ذکر پر ایک ہوک سی دل میں اٹھی تھی۔ وہ سب ایسے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اس کے ذرا سے بخار سے ثمن کتنی پریشان ہو گئی تھی جبکہ اسے اس کی ذات سے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ اسی لئے وہ گھر میں کسی کو شائزہ کے رویے کے بارے میں بتا نہیں سکا تھا کہ وہ سب بہت پریشان ہو جاتے اور وہ انہیں اپنی وجہ سے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس سے شادی کا فیصلہ اس کا اپنا تھا تو اب بھگتنا بھی اسے ہی چاہیے تھا۔

''وہ سو رہی ہے اس لیے میں نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔'' اس نے جھوٹی وضاحت دی، اپنا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔ ''تم پریشان نہیں ہو میں ابھی دوا لے کر آرام کروں گا تو انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم خود تھکی ہوئی آئی ہو آرام کرو، اور ماما کو نہیں بتانا وہ پریشان ہو جائیں گی'' وہ چائے کا کپ اٹھائے تسلی بھرے انداز میں اس کے گال پر پیار سے تھپکی دیتا ہوا باہر کی جانب بڑھا جب ثمن نے پھر اسے روکا۔

''اچھا! آپ نے کچھ کھایا ہے؟''

''نہیں کوئی خاص بھوک نہیں ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن خالی پیٹ دوائی مت لیجیے گا۔ اور تو کچھ نہیں کھایا جائے گا یہ بسکٹ لے لیجیے گا۔'' اس نے جلدی سے کچن کیبنٹ سے بسکٹ کا پیکٹ نکال کر اسے تھمایا۔ اس کی محبت پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی، لیکن یہ مسکراہٹ پھیکی تھی۔ جسے ثمن نے بہت غور سے دیکھا تھا۔ باسم کے جانے کے بعد بھی وہ کسی سوچ میں الجھی کافی دیر وہیں کھڑی رہی تھی۔

وہ جب کمرے میں آیا تو وہ ایسے ہی کھڑی تھی۔ اس نے آج اس مٹی کے مادھو ٹائپ لڑکی پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالنا گوارا کی تھی۔ جب سے شادی ہوئی تھی تب سے ایسا ہی ہو رہا تھا کہ وہ زندگی کے سفر کو خوشگوار بنانے کے لئے اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ جاتا کچھ قدم چلنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھتا تو وہ وہیں بیٹھی ہوتی تب وہ واپس پلٹ کر آتا اور پھر سفر شروع کرتا اس آنکھ مچولی کے کھیل میں اب وہ تھکنے لگا تھا۔

وہ چائے پی کر اور دوا لے کر لیٹ گیا تھا۔ وہ پریشانی سے ہونٹ کاٹتی تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف کے نہیں خجالت بھرے تاثرات تھے۔ وہ جو ہمیشہ اس کے عجیب و غریب رویے پر آس بھری نظروں سے اسے تکا کرتا تھا اور مایوس ہو جاتا تھا۔ آج دیکھتا تو شاید مختلف تاثرات دیکھ کر چونک جاتا لیکن آج اس نے دیکھا ہی نہ تھا۔

✣✣✣

اس نے کوئی چوتھی مرتبہ دروازے پر نصب گھنٹی بجائی تھی لیکن ابھی تک ہنوز انتظار کی کیفیت میں تھا۔

اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔

''پتہ نہیں، کہاں دفع ہو گئے ہیں سب، زمانے بھر کی لاپرواہ عورت ہی میرے حصے میں لکھی جانی تھی۔ اچھا بھلا پتہ ہے یہ میرے آنے کا وقت ہے لیکن نہ جی یہاں پرواہ ہی کسے ہے، بیٹھی ہو گی ٹی وی کے آگے، ایک یہ نئی مصیبت ہے نت نئے چینل اور ہر چینل پر عورت مظلوم دکھائی جاتی ہے اور سونیا جیسی پھوہڑ عورتیں مظلوم شکلیں بنا کر ٹی وی کے آگے یوں بیٹھ جاتی ہیں کہ جیسے یہ سب ان کے ساتھ ہی پیش آ رہا ہو۔'' انتظار کی کوفت میں گھرا وہ دروازے کے باہر کھڑا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹاتا، دروازہ کھل گیا تھا۔

''کہاں دفعہ ہو گئی تھی؟ پتہ نہیں ہے یہ میرے آنے کا وقت ہے، ہزار دفعہ بکواس کی ہے کہ میرے آنے سے پہلے دروازہ کھول دیا کرو لیکن اس موٹی عقل کی عورت کی کچھ پلے پڑے تو بات تو تب ہے نا!'' وہ گھر میں داخل ہوتے ہی بولنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن وہ خاموش رہی تھی۔

''اب بول کیوں نہیں رہی؟ کہاں دفع ہو گئی تھی، اتنی دیر سے کیوں دروازہ کھولا۔ پاگل سمجھا ہے مجھے جو میں ہی بولتا رہوں اور تم آگے سے ایک لفظ بھی نہ پھوٹو۔''

سونیا نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اگر وہ بولتی تو اس نے کہنا تھا کہ جواب کیوں دیا؟'' اب نہیں بول رہی تھی تو بھی اسے اعتراض تھا۔

''کیوں آتے ہی اس کے پیچھے پڑ گئی ہو، آگے ہی اس کی طبیعت خراب ہے۔'' امینہ نے جواب دیا تو وہ ایک خاموش نظر اس پر ڈال کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔

''اونہہ! اس کی طبیعت خراب ہے تو میں کون سا کس ریاست کا شہزادہ ہوں جو اپنی شاہی سواری پر بیٹھ کر اپنے باغات کی سیر کر کے آیا ہوں۔ سارا سارا دن دفتروں میں سر کھپاؤ، جب گھر آؤ تو دروازہ ہی نہیں کھلتا اور اللہ اللہ کر کے دروازہ کھلے تو آگے سے مہارانی صاحبہ کا سوجا ہوا منہ دیکھو، گھر میں رہنے والی عورتوں کو کیا پتہ، باہر کے بکھیڑوں کا، بیٹھی رہتی ہیں گھر میں، عیش کرتی رہتی ہیں اور بس۔ گھر کے کام کرنے ہوتے ہیں اور اس پر بھی روتی رہتی ہیں۔'' وہ مسلسل بول رہا تھا جب سونیا کچن سے باہر آئی، کمر پر ہاتھ رکھے غصے بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟ تمہیں کیا لگتا ہے میں یہاں فارغ بیٹھی رہتی ہوں، جب تک میں تمہارے ساتھ لڑ نہ لوں، چیخوں نہ تب تک

تمہیں سکون نہیں ملتا، کیوں؟ آخر چاہتے کیا ہو۔تم؟" وہ اس سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخی تھی۔

"بیٹا! تم چپ کر جاؤ، شوہر ہے تمہارا، عزت سے بات کرو۔" ان دونوں کے جھگڑے کے درمیان امینہ کی آواز ابھری تھی۔

"کیوں؟ کیوں چپ کروں؟ ہمیشہ میں ہی کیوں چپ کروں، اور یہ کیا عزت کے قابل ہے جس کی میں عزت کروں، میں چاہوں بھی تو اس کی عزت نہیں کرسکتی کیوں کہ میں نے بہت عزت کر کے دیکھ لی، کوئی فائدہ نہیں، بعض لوگوں میں عزت کروانے کی خصوصیات ہوتی ہی نہیں۔" وہ پھر چیخی تھی۔ ردا ڈر کے مارے رونے لگی تھی اور معمول کی طرح دادی کی گود میں چھپ گئی تھی۔

وہ طیش کے عالم میں پلٹا تھا۔

"تمہاری بکواس تب بند ہوگی جب دو، چار لگاؤں گا، مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں۔" وہ بلند آواز میں دھاڑا تھا۔

"یہ شوق بھی پورا کرلو، زبان چلاتے ہو اب ہاتھ بھی چلالو۔" وہ دیدہ دلیری سے بولی تھی۔ اس نے سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

وہ ہمیشہ اس کے سامنے ڈر کر چپ کر جاتی تھی، لیکن اب جیسے اس نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔

"خدا کے واسطے، بچی کی خاطر ہی چپ کر جاؤ، ردا کو گود میں چھپائے امینہ پھر منمنائی تھیں لیکن ان کی آواز ان دونوں کی آوازوں میں دب گئی تھی کہ نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے بھلا؟

اندر کمرے میں بیٹھے سہیل ان کی چیخ و پکار سے بیزار ہو کر باہر آئے تھے۔

ثاقب نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا اور پھر اس سے بحث کرنا شروع ہوگیا تھا۔ انہوں نے تاسف بھری نظر اس پر ڈالی تھی۔ دن بدن اس کی نظروں میں ان کی عزت بھی جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی اب وہ ان کی موجودگی کا بھی لحاظ نہیں رکھتا تھا۔

"کیا مصیبت ہے اس گھر میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر وقت ان دونوں کی لڑائی ہی نہیں ختم ہوتی۔ پتہ نہیں کیا گناہ سرزد ہوا جو ایسی اولاد ملی، یہ کوئی انوکھی نوکری کر کے آتا ہے، باقی دنیا تو کوئی کام ہی نہیں کرتی جیسے، لوگوں کے اتنے فرمانبردار بیٹے ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے ساری دنیا سے نرالا۔" ان کی نظروں کے سامنے باسم کی شبیہہ لہرائی تھی۔ کتنا سلجھا ہوا اور فرمانبردار تھا۔ انہوں نے اسے کبھی باپ کے سامنے اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ غصے سے منہ ہی منہ میں بولتے گھر سے باہر چلے گئے تھے کہ صرف امینہ ہی سن سکی تھیں۔ اونچی آواز میں اسے اس لئے نہیں ٹوکا تھا کہ اس کی جوشیلی طبیعت سے واقف تھے۔ غصے میں وہ بڑوں، چھوٹوں کی تخصیص بھلا دیتا تھا۔

وہ تو یہ بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ لاچاری سے ردا کو گود میں لیے بیٹھی رہیں۔ اور اب اس کی توپوں کا رخ اپنے پسندیدہ موضوع کی طرف مڑ گیا تھا یعنی سونیا کے گھر والوں کو برا بھلا کہنا، اس کے بھائیوں کی برائیاں، اس کی ماں کی غلط تربیت جو انہوں نے سونیا کی کی تھی۔ وغیرہ وغیرہ اور اس ذکر پر سونیا بلبلا اٹھی۔ وہ جدید دور کا پڑھا لکھا پلس جاہل مرد تھا۔ باتوں کے نشتر سے بیوی کو زچ کرنا بخوبی جانتا تھا۔ چیخ چیخ کر اب وہ رونے لگی تھی لیکن اسے کیا پرواہ تھی۔

✦✦✦

"شائزہ بیٹا! باسم کو بھی کھانے کے لئے بلا لاؤ۔" رات کے کھانے کے لیے برتن میز پر رکھ کر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگی ہی تھی جب نائلہ کچن سے سالن کا ڈونگا لیے آئیں تو اسے مخاطب کیا۔

"جی اچھا! بلاتی ہوں۔" وہ بیٹھنے کی بجائے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

"اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا بیٹا! آج شاید وہ گھر بھی جلدی آ گیا تھا اور شام میں بھی نہیں ملا، ورنہ وہ تو جتنا بھی مصروف ہو، چاہے تھوڑی دیر کے لئے ہی آئے مجھ سے گپ شپ ضرور لگاتا ہے۔" بابا کے لہجے میں اس کے لئے محبت کی جھلک اور فکر مندی تھی اور یہی جھلک نائلہ کے چہرے پر بھی تھی۔

ایک تو ویسے ہی بابا اسے جب بھی مخاطب کرتے وہ بہت گھبرا جاتی تھی اور اوپر سے باسم کی بابت سوال، وہ حقیقی معنوں میں سٹپٹا گئی تھی۔ اس نے تو اس سے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ آج جلدی کیوں آیا ہے؟

"بھائی کو بخار ہو رہا تھا اس لئے وہ دن میں دوا لے کر سو گئے تھے، اب انشاء اللہ پہلے سے طبیعت بہتر ہی ہوگی۔"

جواباً ثمن بولی تھی اور ساتھ ساتھ اسے کچھ جتاتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"مم میں...... میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔" وہ کچھ اٹک اٹک کر بولتی جلدی سے کمرے کی سمت بڑھ گئی تھی۔

ان سب نے اس کے انداز کو محسوس کیا تھا لیکن کسی نے بھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کی اس عادت سے تو اب گھر کے سب افراد واقف ہو چکے تھے لیکن دوسروں کی عزت نفس کا خیال رکھنا ان کے گھر کا پہلا اصول تھا اس لئے کوئی بھی اس کی اس خامی کو اس کے سامنے گردانتا نہیں تھا۔

وہ کمرے میں آئی تو وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ وہ شش و پنج میں گھری کچھ دیر یونہی کھڑی رہی، سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے اسے جگائے۔ اس سے پہلے اسے جگانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کہ وہ ہمیشہ ہشاش بشاش زندہ دل قہقہے لگاتا پورے گھر میں رونق لگائے رکھتا اور کبھی بے وقت نہیں سوتا تھا۔ آج اسے یوں لیٹے دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اسے بخار تھا اور اسے پتہ تک نہیں تھا۔ احساس ندامت جو دن سے ہی کچوکے لگا رہا تھا اب مزید سوار ہو گیا تھا۔

"سنیں، اٹھ جائیں۔" اس نے ہولے سے پکارا تھا، اس نے آج تک اس کا نام لے کر نہیں پکارا تھا۔ ابھی بھی نہیں پکارا گیا تھا۔

اس کے دوبار اٹھانے پر بھی اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو وہ بے حد پریشان ہو گئی۔ اسی پریشانی میں گھبرا کر اس نے قریب جا کر زور سے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ وہ کسلمندی سے ایک دم گھبرا کر اٹھا۔ نیم غنودگی کی حالت میں اٹھا تھا اس لئے سر بھاری سا لگنے لگا۔ کچھ دیر وہ نا سمجھی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے؟"

"جی۔" جواباً وہ ہولے سے بولی تھی۔

"تو اس بری طرح کیوں جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں نے سمجھا پتہ نہیں کیا ہو گیا۔" اب کے وہ کافی روڈ لہجے میں بولا تھا۔

جانے کیوں اس کے ایسے لہجے پر آنکھیں چھلکنے کو بیتاب ہونے لگیں۔ شاید اس کے ایسے لہجے کی عادت نہیں تھی۔ آج دن سے ہی وہ ایسے غصے سے بات کر رہا تھا۔

"اب ایسے کیوں کھڑی ہو کچھ کہنا ہے کیا۔" اسے یوں خاموشی سے گم سم کھڑا دیکھ کر وہ جھلا سا گیا تو مزید اکتا کر بولا۔ مزید اس سے کچھ

کہ وہ اٹھا تھا دوپہر کو دوائی لے کر سویا تھا تو اب طبیعت پہلے سے بہتر لگ رہی تھی۔ وہ سلیپر پہن کر باتھ روم کی طرف جانے لگا تھا۔ جب اسے اپنے پیچھے اس کی آواز سنائی دی۔

"وہ..... مم..... مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ ماما آپ کو کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔" اس نے تیزی سے اپنی بات پوری کی تھی۔

"ماما سے جا کر کہو کہ جب سے میں آپ کے بیٹے پر مسلط ہوئی ہوں تب سے اس کی تو بھوک ہی مٹ گئی ہے۔ میری عجیب و غریب حرکات برداشت کر کر کے ہی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔" وہ بغیر پلٹے چبا چبا کر لفظ بولتا آگے کی جانب بڑھ گیا۔ جب کہ وہ ساکت سی کھڑی اس کے سخت الفاظ پر غور کرتی آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

ابھی تک اس کا نرم لہجہ ہی سنا تھا۔ اس کا روکھا انداز برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"بس آپ کی محبت ختم ہوگئی، تو کیا باسم! میں آپ کے دل سے اتنی جلدی اتر گئی۔" اس نے اس کے ایک پل کے برے رویے سے نتیجہ اخذ کر لیا تھا پر یہ نہیں سوچا تھا کہ جب وہ اس کے ساتھ اتنا خراب رویہ رکھے ہوئی ہے تو وہ کب تک برداشت کرے وہ اس سے محبت کرتا تھا لیکن تھا تو ایک عام انسان، فرشتہ تو نہ تھا۔ اس نے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کیا اور باہر کی جانب چل دی۔

لاؤنج کے دروازے کے پاس کھڑی وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ باسم کے آنے کے بارے میں کیا بتائے تب ہی اسے اپنے پیچھے آہٹ کا احساس ہوا پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اسی طرح آ رہا تھا اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور بنا کچھ کہے آگے کی جانب بڑھ گیا، وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔

+++

ثمن چائے لے کر آئی تو نائلہ اخبار پڑھ رہی تھیں۔ وہ انہیں چائے کا مگ پکڑا کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"شائزہ کو بھی ادھر ہی بلا لو۔" انہوں نے اخبار لپیٹ کر اپنے دائیں طرف رکھا۔

"میں بلانے گئی تھی وہ سو رہی ہے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے، اچھی بات ہے آرام کر لے۔ باسم بھی تو آج گھر نہیں ہے تمہارے بابا کے ساتھ گیا ہے ان کے دوست شفیق صاحب کے گھر اور اب رات گئے ہی ان کی واپسی ہوگی، دوستوں سے مل کر تمہارے بابا گھر واپس آنا تو شاید بھول جاتے ہیں۔ انہوں نے چائے پیتے ہوئے مسکرا کر کہا تو ثمن کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی باسم کے چہرے کے تاثرات یاد آ گئے تھے وہ جب بھی بابا کے ساتھ ان کے کسی دوست سے مل کر واپس آتا تو اس کے چہرے پر بیچارگی بھرے اتنے تاثرات ہوتے کہ ان دونوں کے ساتھ ساتھ بابا بھی جی بھر کر لطف اندوز ہوتے۔

بھائی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی نائلہ نے بغور اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟" ثمن نے اپنے خیالوں سے چونک کر انہیں دیکھا۔

"ماما! آپ کو نہیں لگتا کہ بھائی کے چہرے پر شائزہ بھابھی کے نام پر جو روشنیاں پھوٹا کرتی تھیں اب ان کی دمک ماند پڑ گئی ہے۔ کتنی چاہ سے انہوں نے اسے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ کتنے خوش تھے وہ لیکن اب اس خوشی کی رمق ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ میں بھابھی کو غلط

نہیں کہہ رہی، نہ ہی اسے موردِ الزام ٹھہرا رہی ہوں لیکن باسم بھائی خوش نہیں یہ میں جانتی ہوں۔ ہم سب ایک دوسرے کے جتنے قریب ہیں، ہم سے ایک دوسرے کی پریشانی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ اس صورتحال سے واقف نہ ہوں، کیا آپ نے محسوس کیا ہے کہ میرا ہنستا مسکراتا بھائی کھو گیا ہے؟" بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

نائلہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ تو اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی ذرا سی پریشانی پر گھبرا جاتے تھے اور یہ تو واقعی پریشانی کی بات تھی۔

"تم پریشان نہ ہو وہ دونوں خوش ہیں۔ دراصل پہلے تم اور باسم زیادہ وقت اکٹھے گزارتے تھے اس لیے آپس میں باتیں بھی زیادہ ہوتی تھیں اب اس کی شادی ہو گئی ہے تو وہ اپنی بیوی کو بھی وقت دیتا ہے اس لیے تمہیں محسوس ہوا کہ وہ پہلے سے سنجیدہ ہو گیا ہے۔" وہ ہر بات کو مثبت پہلو کے تناظر سے دیکھتی تھیں اس لیے اس کے دل میں شائزہ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہ ابھرے، اپنے تئیں انہوں نے اسے مطمئن کرنا چاہا تھا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہی آپ میری بات کو ٹال رہی ہیں۔" وہ بھی ان کی بیٹی تھی فوراً بھانپ گئی۔

"ابھی ان کی شادی کی بالکل ابتداء ہے آہستہ آہستہ سب معمولات پر آ جائے گا۔ تم پریشان مت ہو اور دیکھو شائزہ اٹھ گئی یا نہیں۔" انہیں موضوع سے ہٹتے دیکھ کر پھر مزید وہ بھی کچھ نہیں بولی تھی اور خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد انہوں نے گہری سانس ہوا کے سپرد کی اور اس پہلو پر سوچنے لگیں۔ ثمن کو تو انہوں نے بہلا کر ٹال دیا تھا لیکن یہ سچ تھا جو ثمن نے محسوس کیا وہ تو انہوں نے باسم کی شادی کے اگلے دن ہی محسوس کر لیا تھا۔ لیکن تب انہیں تسلی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی انجان ہیں۔ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف نہیں، وقت کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی، ان کی شادی کو چھ ماہ ہونے والے تھے۔ ان سب سے تو وہ کافی مکمل مل گئی تھی لیکن ان دونوں کی آپس کی بے تکلفی انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ پہلے انہیں تسلی تھی کہ باسم سمجھدار ہے وہ خود ہی اس کے ساتھ آسانی سے ایڈجسٹ کر لے گا لیکن اب انہیں کئی اندیشے کھٹک رہے تھے۔ باسم نے ابھی تک ان سے خود کچھ نہیں کہا تھا ایک دو دفعہ انہوں نے پوچھنے کی کوشش بھی کی تو وہ بات بدل گیا تھا لیکن وہ ماں تھیں اس کا خاموش سا انداز انہیں اس کے اندر کی کہانی سے بخوبی آگاہ کر دیتا تھا۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان دونوں کا آپس میں کیا مسئلہ ہے۔ اب تو سلیمان صاحب نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ انہوں نے بھی ان سے ذکر کیا تھا۔

"اللہ میرے بچوں کے حق میں بہتر کرے، اور ان کی آپس کی الجھنیں سلجھ جائیں۔" انہوں نے صدقِ دل سے دعا کی تھی۔

+++

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سامنے دیکھا۔

کتنی محنت سے کھانا بنایا تھا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ جتنا گھبرا رہی تھی اتنا ہی کام خراب ہوا تھا۔ قصور اپنا بھی تھا کہ کھانے کے

دوران کچھ اور کیوں سوچا؟
وہ اب خود کو سرزنش کر رہی تھی۔ نائلہ کے قریبی رشتہ داروں میں کسی کی وفات ہو گئی تھی۔ اس لیے صبح صبح ہی انہیں اچانک جانا پڑ گیا تھا اور ثمن بھی یونیورسٹی جانے کی بجائے ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ بابا اور باسم کے دفتر جانے کے بعد نائلہ کو فون آیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب نائلہ پریشان ہو جائیں گی کہ اکیلی کیسے جائیں گی لیکن تب وہ حیران رہ گئی تھی کہ وہ اور ثمن دونوں آرام سے چلی گئی تھیں۔ اسے ثمن پر رشک آتا تھا وہ اس کی ہی ہم عمر تھی لیکن اس میں اور ثمن میں کتنا فرق تھا۔ وہ کتنی خود اعتماد تھی۔ اسے لوگوں کے سامنے بات کرنے کی کتنی تمیز تھی۔ ایک وہ تھی چار بندوں کو دیکھ لیتی تو حد سے زیادہ گھبرا جاتی۔ اس نے دیکھا تھا کہ کبھی جو نائلہ گھر نہ ہوتیں اور کوئی مہمان آ جاتا تو وہ بغیر کسی بھی پریشانی کے آرام سے اچھی مہمان نوازی کر لیتی جبکہ اگر ایسی کسی صورتحال کا سامنا اسے شادی سے پہلے امی کے بغیر کرنا پڑ جاتا تو اس کے تو مارے گھبراہٹ کے ہاتھ پاؤں پھولنا شروع ہو جاتے اور عجیب حرکتیں کرتی کبھی تو اس کے چہرے سے اتنی پریشانی نمایاں ہو رہی ہوتی کہ آنے والا بھی شرمندہ ہو جاتا کہ اس نے آ کر شاید کوئی غلطی کر لی ہے اور اگر جو کوئی ایسا مہمان آ جاتا جو کہ بہت قریبی جاننے والا ہوتا تو اسے پھر گھبراہٹ تو نہ ہوتی لیکن کوئی بات نہ کرنی آتی تو بلاوجہ ہی بغیر کسی بات کے ہنستی جاتی، ہنستی جاتی اور اس وقت وہ کتنی بونگی سی لگ رہی ہوتی تھی۔ اعتماد کی اس درجہ کمی نے اس کی خوبصورت شخصیت کو ابھرنے ہی نہ دیا تھا۔ ثمن اچھی پرکشش لڑکی تھی جبکہ وہ اس کے سامنے بہت خوبصورت تھی پر پھر بھی اس کی پراعتماد اور باوقار شخصیت کے سامنے وہ ماند پڑ جاتی تھی۔

ثمن اگر یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں بی۔ ایس کر رہی تھی تو وہ کون سا پڑھی لکھی نہیں تھی اس نے بھی ریگولر بی۔ ایس۔ سی کی تھی لیکن کتنا فرق تھا ان دونوں میں اس کے کتنے اچھے نمبر آئے تھے، اسے آگے پڑھنے کا کتنا شوق تھا اور کون سا کسی نے منع کیا تھا۔ باسم نے تو خود کہا تھا کہ وہ آگے داخلہ لے لیکن وہ اپنی کم ہمتی کے سبب آگے پڑھنے کی خواہش کا کیا بتاتی وہ اسے اپنے رزلٹ کا ہی نہیں بتا سکی تھی۔ ثمن کے ذریعے اسے جب پتہ چلا تھا تو وہ کتنا خفا ہوا تھا کہ اس نے خود کیوں نہیں بتایا۔ آج گھر میں اکیلی تھی تو سوچوں میں ڈوبی اپنی ذات کی خامیاں خود ہی شمار کر رہی تھی۔ باسم کے غصے اور جھنجھلاہٹ سے بھی وہ مزید ڈر گئی تھی۔

"مجھے اپنے اندر تھوڑی سی ہمت پیدا کرنی چاہیے ورنہ باسم مجھ سے دور ہوتے جائیں گے۔" آج وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی اور ان ہی سوچوں میں اسے پتہ نہیں چلا تھا۔ چکن کڑاہی کے لئے پیاز تلتے ہوئے اس سے تھوڑے زیادہ ہی براؤن ہو گئے تھے کہ سالن میں ہلکی ہلکی کڑواہٹ کا ذائقہ آ رہا تھا اسے رونا آنے لگا تھا۔ ایک تو آج پہلی دفعہ اکیلی کھانا بنا رہی تھی ورنہ وہ نائلہ کے ساتھ تو لگی رہتی تھی لیکن کبھی یوں اکیلے کھانا نہیں بنایا تھا۔ اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ بابا اور باسم دونوں گھر آ چکے تھے اور کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ روٹیاں بناتے ہوئے مسلسل اسی پریشانی میں مبتلا تھی یہی وجہ تھی کہ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے توے پر روٹی ڈالی ہوئی ہے۔

"شائزہ! روٹی جل رہی ہے۔ کدھر گم ہو؟"
باسم پانی پینے کے لئے کچن میں آیا تھا اسے کسی

سوچ میں گم دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھا اور روٹی کو توے سے اتارا جو کافی حد تک جل چکی تھی۔

وہ مزید بوکھلا گئی، گھبراہٹ میں دائیں ہاتھ میں پکڑا کفگیر اس کے بائیں ہاتھ کی پشت پر لگ گیا۔ تپش سے ہاتھ جلا تو آنکھیں جو پہلے ہی چھلکنے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔ اب نمکین پانی گالوں پر بہہ نکلا۔ وہ اس کے عجیب وغریب ردعمل پر پریشان ہو گیا تھا اس کی آنکھ میں آنسو اس کی ساری ناراضگی اور خفگی اپنے ساتھ ہی بہا لے گئے تھے۔

"یا اللہ! اس لڑکی کے آنسو کب ختم ہوں گے؟" وہ بے اختیار آگے بڑھا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے کیا؟" اس نے نرمی سے اس کے گالوں سے آنسو صاف کیے اور اس کا بایاں ہاتھ تھام کر اس کے پیچھے والی کیبنٹ کا دروازہ کھول کر بام نکال کر اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر لگائی۔

"جاؤ تم آرام کرو میں کھانا خود ہی لے لیتا ہوں۔"

"اگر روٹی نہیں بنی تو کوئی بات نہیں اٹس او کے، میں بازار سے لے آتا ہوں۔"

"نہیں روٹی تو بن گئی ہے، یہ آخری ہی تھی۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اچھا ٹھیک ہے تم بیٹھو میں چیزیں رکھتا ہوں۔ اس نے بغور اسے دیکھا تھا، وہ اس کی ہچکچاہٹ سمجھ رہا تھا وہ جو چند دن پہلے چائے بنانے سے اتنی پریشان تھی، آج کھانا بناتے ہوئے اس کا کیا حال ہوا ہوگا۔ بنا پوچھے ہی اسے پکا یقین تھا کہ یہ آنسو اسی لیے بہائے گئے ہیں۔

"بھئی! میری بیٹی نے تو کھانا بنانے میں کمال کر دیا۔ بہت لذیذ کھانا بنا ہے۔" بابا نے دل کھول کر تعریف کی تھی۔

وہ جو دل میں جانے کیا کیا وضاحتیں سوچ کر بیٹھی تھی کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی کھانے کی بابت پوچھے گا تو وہ یہ کہہ دے گی، وہ کہہ دے گی، مگر اس کی تو سوچ کے بالکل برعکس ہوا تھا۔ ان دونوں نے تو یوں رغبت سے کھانا کھایا تھا جیسے روز کھاتے تھے۔

"یہ تمہارا انعام۔" کھانے کے اختتام پر انہوں نے اسے بطور انعام پیسے دیئے تو وہ کئی ثانیے بے یقینی کی حدوں کو چھوتے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

"اور اب تم آرام کرو تمہارا پہلے ہی ہاتھ جلا ہوا ہے آج ہمیں باسم چائے پلائے گا۔"

اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا کہ گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹک گیا تھا۔

"عدم تحفظ، خود اعتمادی کی شدید کمی، لیکن کیوں؟

سہیل ساجد جیسے بھرپور خود اعتماد شخص کی بیٹی میں اتنا بڑا خلا، کیوں؟

جو باتیں باسم سوچا کرتا تھا آج سلیمان رضا بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

(باقی اگلے ماہ)

غارت گر

سندس جبیں

سولہویں قسط کا خلاصہ

گزشتہ قسط احاطہ کرتی ہے کہ موجودہ زمانے میں پیش آنے والے واقعات کا، جب صفا اویس کو خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کر دیتی ہے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا پلان بناتی ہے، سردار ہاشم محسوس کرتا ہے کہ گل لالہ کو اس کے گھر کا پہناوا، کھانا اور رہن سہن کچھ بھی پسند نہیں آ رہا ہوتا جس کی وجہ سے وہ اسے ایبٹ آباد لے جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں واپس آئیں تو سحر ثناء ایک بیٹے کو جنم دینے کے بعد مر جاتی ہے، تبریز کیلئے یہ غم بہت بڑا ہے۔ دو تین دن کمرہ بند رہتا ہے خوب سوگ مناتا ہے۔ جب باپ کے سمجھانے پر وہ اپنا سوگ ختم کرتا ہے تو ایک بار پھر سردار ہاشم کیلئے نئی سازش کا جال بننے کو تیار ہے۔

سترہویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے

''اور پھر؟''

اُس نے بے ساختہ اپنے ہونٹوں کو رگڑا۔ جیسے ان پر سے تجمل کے ہاتھ کا ناجائز لمس مٹا رہی ہو۔ اُسے احساس تھا کہ وہ انتہائی غلط کر رہی تھی جبھی ایک بار کے بعد اُس نے دوبارہ کبھی بھی تجمل سے ملنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ اب تو کئی دن بیت چکے تھے۔

یقیناً وہ تندرست ہو گیا ہوگا۔

اُس نے اس بار سوچا وہ خود غرضی سے کام لے گی اور دوبارہ کبھی بھی اُسے اپنا چہرہ نہ دکھائے گی اور بھلا کیوں دکھائے وہ اُسے اپنا چہرہ؟

وہ اپنے پیار کو مزید کیوں اذیت دے؟

وہ کیوں نہ اُس کی زندگی آسان کرے؟

وہ اپنے فیصلے پہ مضبوطی سے جم گئی۔

جبھی تجمل کی اتنی بے تحاشا کالز اور پیغامات کے باوجود بھی اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اُسے یقین تھا کہ وہ ٹھیک ہو چکا ہوگا۔

بس! اک ذرا ضمیر کی خلش سرد پڑے تو وہ دوبارہ سردار ہاشم کا سامنا کرنے کے قابل ہو سکے گی۔

سوچوں کے اندھے غار میں غوطے کھاتے وہ چونکی تب جب اُس کے پاس سویا ننھا بچہ (جس کا تاحال کوئی نام منتخب نہیں کیا گیا تھا) رو پڑا۔

اُس نے فوراً اُسے اُٹھا کر ساتھ لگا لیا......

+++

ہمیں پہچان رہتی ہے
ہمیشہ دوست دشمن کی
نشانی یاد رکھتے ہیں
نشانہ یاد رکھتے ہیں

اور یہ سردار تبریز کے دفتر کا منظر تھا۔

وہ طاقت کی کرسی پہ براجمان تھا۔

وہ ٹھیک تھا اور ایک بار پھر ''کھیل'' میں واپس آ چکا تھا۔ اُس کے سامنے والی کرسی پر سردار محمود بیٹھے تھے۔

''تم کیا کہہ رہے ہو تبریز؟'' انہوں نے بے چینی سے بیٹے کو دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں بابا! میں چاہتا ہوں لالی ہاشم سے خلع لے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''مگر کیوں؟'' وہ جھلا کر بولے۔

''انتقام''۔ اُس کی آنکھیں لہو رنگ تھیں اور لہجہ خون آشام۔

+++

وقت ہے سہ پہر کا
دن ہے 13 جنوری

مقام ہے تبریز کا کمرہ
جہاں وہ دونوں (گلِ لالہ اور سردار تبریز) ایک بار پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''آپ نے بلایا تھا لالہ۔'' گُل نے سوالیہ نظروں سے تبریز کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے پڑے ہوئے تھے اور ان میں ایک جامد ویرانی نظر آتی تھی۔

جبکہ چھوٹے بچے کی ذمہ داری مسلسل کئی دنوں سے اُٹھانے کے باعث گل بھی کچھ تھکی تھکی سی تھی۔

''ہاں۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں تم سے، آؤ بیٹھو''۔ اُس نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

گُل نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔ ''ضروری باتیں؟'' خوامخواہ ہی اُس کا دل دھڑکا۔

دونوں نشستوں پر آمنے سامنے براجمان ہو گئے۔

تبریز نے گہرا سانس لے کر اُسے دیکھا۔

''میں جانتا ہوں لالی تم اس شادی سے خوش نہیں ہو''۔ تبریز نے بہت ٹھہر ٹھہر کر بات کا آغاز کیا۔

لالی ٹھٹھک گئی۔

''کیا مطلب؟'' اُس نے چونک کر تبریز کو دیکھا۔

''یہ شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہوئی تھی''۔ وہ جیسے اُسے یاد کروا رہا تھا۔

''اب اس بات کا کیا مطلب؟'' اُس نے اُلجھ کر پوچھا۔

تبریز نے معنی خیز انداز میں اُسے دیکھا۔

''میں جانتا ہوں، اُس دن تم تجمل سے ملنے گئی تھیں''۔ اُس نے یک بارگی دھماکہ کیا۔

لالی کو جھٹکا سا لگا۔

''ک.. کیا مطلب؟ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وہ اٹک گئی، گھبرا گئی۔

''یہ بات چھوڑو کہ میں کیسے جانتا ہوں۔'' اُس نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے لالی کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں سب جانتا ہوں لالی۔ تم اُس سے رابطے میں ہو، تم اُس سے ملنے گئیں، تم ابھی تک اُسے دل سے نہیں نکال سکیں ناں؟'' وہ یقین سے کہہ رہا تھا۔ لالی نے گم صم ہو کر اُسے دیکھا۔

''نہیں۔ وہ تو میری دوست......'' اُس نے وضاحت دینے کی ناکام کوشش کی، اگرچہ اس کے بودے پن سے وہ خود بھی بخوبی آگاہ تھی۔

''چھوڑو فضول کی وضاحتیں...... جب میں نے کہا کہ میں جانتا ہوں تو میں واقعی جانتا ہوں''۔ اُس نے لالی کو چپ کروا دیا۔

''تم آج بھی تجمل سے ملنا چاہتی ہو، تم اس شادی کیلئے قطعی طور پر تیار نہیں تھی۔ آخری وقت تک تیار نہیں تھیں؟ ہے ناں؟'' اُس نے یقین دہانی چاہی۔

آخر کار گُل نے خود میں حوصلہ پیدا کیا کہ وہ تبریز کی بات کا جواب دے سکے۔

''آپ کس طرح کی بات کر رہے ہیں؟ اُس کی آواز ذرا بلند تھی۔ جیسے وہ اُسے چپ کروانا چاہتی ہو۔

''کیوں؟ اس میں جھوٹ کیا ہے؟'' وہ تیزی سے بولا۔
''اب اس کا کیا فائدہ؟'' وہ بے چینی سے بولی۔
''فائدہ نقصان تو بہت بعد میں آئے گا لالی''۔ اُس نے گُلِ لالہ کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''پہلے میری بات سنو''۔ اس نے ہاتھ سے دباؤ ڈالتے کہا۔
''دیکھو لالی! اب بازی ہمارے ہاتھ میں ہے، یاد ہے ان لوگوں نے کیسے اپنی شرائط پہ بابا کو مجبور کیا تھا تمہارا رشتہ دینے پہ؟ یاد ہے سحر کہتی تھی کہ اُن کا ہاں وٹہ سٹہ ہوتا ہے یاد ہے جب......'' وہ جذبات سے سُرخ چہرے کے ساتھ بول رہا تھا۔ جب گُل نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑوا کر اُسے ٹوکا۔
''نہیں...... مجھے کچھ بھی یاد نہیں اور آپ یہ سب مجھے کیوں یاد کروا رہے ہیں۔ آپ نے مجھے تب کونسا کچھ بتایا تھا۔ جواب بتا رہے ہیں۔ آپ کی تو ہر خواہش پوری ہوگئی ناں؟'' وہ ضبط سے بول رہی تھی۔
''خواہش؟ کونسی خواہش؟ کہاں پوری ہوئی میری خواہش، لالی! پاگل پن مت کرو۔ دھیان سے میری بات سُنو، تمہیں صرف وہی کرنا ہوگا جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں......'' اس بار تبریز کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔
گُل نے چونک کر اُسے دیکھا۔
''ہم تمہیں واپس سردار ہاشم کے پاس نہیں بھیجیں گے'' اُس نے دھما کہ کیا۔
گُل نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

✤✤✤

ننھا سبطین اس کے بازوؤں میں آنے کیلئے ہمک رہا تھا مگر وہ کسی اور دھیان میں تھی۔
''اُسے کیا کرنا چاہیے؟''
وہ مسلسل سوچ رہی تھی اور مسلسل ناکام محسوس کر رہی تھی کیونکہ اُس کو کوئی رستہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔
''کیا ہے تمہارا حسب نسب؟''
''کون ہو تم؟''
اس کے کانوں میں اپنے نکاح والے دن اپنے اور تبریز کے درمیان ہونے والی گفتگو گونج رہی تھی۔
اِس کا وہ زہر بھرا انداز، وہ لاتعلقی...... جیسے وہ گُلِ لالہ کو جانتا ہی نہ ہو، وہ لب و لہجہ جس میں نفرت اور تحقیر تھی۔ جسے بھلانے میں گُل کو کئی مہینے لگ گئے تھے۔
آج اُسے وہ سب دوبارہ یاد آیا تو اُسے سمجھ نہیں آئی کہ تقدیر کی اس ستم ظریفی پہ ہنسے یا روئے، یہ وہی تبریز تھا جس نے سحر کو پانے کیلئے گُلِ لالہ کو بھینٹ چڑھا دیا تھا، مگر افسوس وہ خود بھی خوشیاں پانے سے قاصر رہا تھا۔ ایسا ہی تو کرتی ہے۔ قدرت انسان کی ساری چالیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور قدرت اپنا آپ دکھا جاتی ہے...... کچھ یوں کہ انسان سوچتا رہ جاتا ہے۔

مگر تبریز کی آفر بڑی پُرکشش تھی، وہ اُسے ایک بار پھر وہ خواب دکھا رہا تھا، جو مدت ہوئے گُلِ لالہ کی آنکھوں نے دیکھنے چھوڑ دیئے تھے۔
''کیا واقعی ایسا ممکن تھا؟ کہ ایک بار پھر وہ آنکھیں بند کرے اور کھولے تو سب کچھ بدل چکا ہو
کیا واقعی ایسا ممکن تھا کہ ایک بار پھر وہ بجیل کو پانے کے خواب دیکھے؟'' اُس نے بے یقینی سے سوچا۔
ایک اُمید کی کونپل تھی تو دِل میں پھوٹنے لگی تھی۔ اُس نے ''لاحول ولا'' پڑھتے سر جھٹکا، مگر دل تھا کہ
''آہ! بجیل''۔ اُس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں''۔

✤✤✤

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے''۔ اُس کا سانس بے ترتیب تھا۔
وہ جو شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا، اُس کا ہاتھ رُکا، وہ اُس کی آواز سُن کر چونک گیا۔
''کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟'' اس کے ماتھے پہ شکن آگئی۔
''نہیں...... میں ٹھیک نہیں ہوں''۔ اُس کی آواز پہ آنسو غالب آگئے۔
''ہوا کیا ہے؟ رو کر مجھے پریشان مت کرو گُلِ لالہ''۔ اُس نے دھیمی آواز میں جھڑکا، گُل کی سسکیاں مدھم پڑ گئیں۔
''تبریز لالہ کا کہنا ہے کہ وہ مجھے واپس نہیں بھیجیں گے''۔ اُس نے کہا۔
سردار ہاشم الامین کو چند لمحے لگے، یہ سمجھنے میں کہ اُس کا کیا مطلب تھا...... پھر اُس نے بے یقینی سے ہاتھوں میں پکڑے موبائل کو دیکھا، جیسے وہ گُل کا چہرہ ہو۔
''وجہ؟'' یک لفظی استفسار ہوا۔
''وجہ آپ بخوبی جانتے ہیں''۔ اب وہ مکمل طور پر خود پہ قابو پا چکی تھی جبھی لہجہ ہموار تھا۔
''کیا مطلب ہے اس بات کا کہ میں جانتا ہوں۔ کیا جانتا ہوں میں؟'' اُس نے بے یقینی سے کہا۔
''تبریز لالہ کہتے ہیں کہ آپ کے خاندان کی رسم ہے وٹہ سٹہ کرنے کی، جب سحر ہی نہیں رہی تو میرا اُس گھر میں واپس جانے کا کیا سوال؟'' اُس نے واضح لفظوں میں کہا۔
ایک پہاڑ تھا جو سردار ہاشم پہ ٹوٹا۔
''تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟'' اُس نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔
''میرے جاننے نہ جاننے کو چھوڑیں، مجھے یہ بتائیں کیا واقعی ایسا ہی ہوگا؟'' گُل نے پوچھا۔
''کیا ہوگا؟'' اُس نے اُلٹا سوال کیا۔
''یہی کہ چونکہ اب سحر شاہ زندہ نہیں رہی اس لئے اب رواج کے مطابق مجھے بھی واپس اپنے گھر آنا ہوگا''۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے لفظوں میں پوچھا۔
''فضول بکواس ہے یہ۔ ہمارے یہاں ایسا کوئی رواج نہیں ہے''۔ وہ دانت بھینچ کر بولا۔
''پھر وٹے سٹے کا رواج کیوں؟ کیا ضروری ہے سردار صاحب کہ اگر آپ کسی کو اپنی بیٹی دیں گے

تو گارنٹی کے طور پر ان کی بیٹی بھی اپنے گھر لائیں گے؟ کیا تب ہی آپ کی تسلی ہوتی ہے؟ تو پھر موت کی گارنٹی کس سے لیں گے؟ موت تو یونہی آن پہنچی ہے۔ لپکتی ہوئی...... موت کی گارنٹی تو کوئی نہیں لیتا؟؟'' وہ درد بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''گل لالہ! یہ رواج، یہ رسوم میرے بنائے ہوئے نہیں ہیں''۔ اُس کا لہجہ آہستہ تھا۔

''لیکن آپ پالن تو کر رہے ہیں''۔ وہ دوبدو بولی۔

''میں انہیں بدلنے کی کوشش بھی تو کر رہا ہوں''۔ وہ شکست خوردہ سا لگا۔

''وہ کیسے؟'' گل نے پوچھا۔

''ساری تفصیلات اِدھر ہی پوچھ لوگی؟ کہ کچھ روبرو کیلئے بھی چھوڑو گی؟'' اُس نے سنبھل کر بات بدل دی۔

''روبرو کی نوبت آئے گی تب ناں؟'' اُس نے جیسے جتایا۔

''تم کیا چاہتی ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''کس حوالے سے؟ میں سمجھی نہیں''۔

''تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟'' اُس نے سوال ذرا واضح کیا۔

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے سوال نظر انداز کیا۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے''۔ وہ بے چین ہوا۔

''کیا سارے سوالوں کے جواب فون پہ ہی لے لیں گے؟'' اُس نے بدلہ پورا کیا۔

''کب ملنا ہے؟'' ہاشم نے پوچھا۔

''وقت اور جگہ طے کرنا آپ کا کام''۔ اُس نے فون رکھ دیا۔

سردار ہاشم نے فون کو دیکھا۔

''یہ لڑکی واقعی مختلف ہے''۔ اُس نے سوچا۔

❖❖❖

یہ منظر لغاری ہاؤس کا تھا۔ جہاں ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی تین افراد ناشتے کی میز پہ تھے۔

سربراہی کرسی پہ فیروز براجمان تھا، وہ اُس وقت سرمئی رنگ کی شلوار قمیص میں تھا، اُس کی شخصیت میں واضح فرق آ چکا تھا۔ وہ کہیں سے بھی وہ فیروز نہیں لگ رہا تھا جو دبئی سے بدرنگ نیلی جینز اور گھسے ہوئے جوتوں میں لوٹ کر آیا تھا اور جس کے چہرے پر افلاس رقم تھا۔

اب وہ بہترین برانڈڈ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اور جوتے اتنے چمکتے ہوئے کہ اُن میں چہرہ دیکھا جا سکے، وہ دبئی پلٹ فیروز کی پرچھائیں سے بھی مختلف تھا۔ آسودہ حالی نے اُس کے چہرے کے نقوش بدل کر رکھ دیئے تھے۔

وہ اب مکمل طور پر ایک بدلا ہوا انسان تھا۔

دائیں طرف فریا تھیں۔ اپنے بے پناہ خوبصورت چہرے اور ٹانگ کی معذوری کے ساتھ اب وہ بھی تھکی تھکی سی لگنے لگیں تھیں۔

شاید وقت نے انہیں بھی تھکا دیا تھا اور بائیں طرف وہ تھی...... صفا...... وقت نے اُسے بھی تو بدل دیا تھا۔ وہ بھی کہاں پہلے جیسی رہی تھی۔ اُسے دیکھنے والا اویس اگر اب دیکھتا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ جس صفا کو وہ بیاہ کر لایا تھا وہ کہاں گئی؟

اُس کے چہرے پہ اِن گزرے چند مہینوں نے بے تحاشا تبدیلیاں کر دی تھیں۔ ناشتے کی میز پہ اپنی زیبو ناشتہ پروستی نظر آ رہی تھی۔ کچھ عرصے سے صفا اُس ڈیوٹی سے آزاد ہو چکی تھی، اب وہ بھی بن ٹھن کر صرف ناشتہ کرتی تھی بناتی نہیں تھی، جبکہ زیبو آج بھی ویسی ہی تھی۔

اپنی بڑی بڑی آنکھوں سمیت، بنا زبان کے وہ آج بھی ویسی ہی تھی، ناشتے کی میز پہ روز کی طرح معمول کی خاموشی تھی۔ وہ تینوں ہر روز بنا بات کئے اسی طرح ناشتہ کرتے، پھر فریا اپنے کمرے میں چلی جاتیں، فیروز آفس کیلئے نکل جاتا اور رہ گئی صفا...... تو پہلے کی طرح اب وہ کہاں مصروف تھی۔ اب اُس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔

جب سے اویس کا قصہ تمام ہوا تھا، صفا خود کو بے حد آزاد اور فارغ تصور کرتی تھی۔

یہ تھا موجودہ حالات کا تعارف۔ اب ہم آج کے دن پہ آتے ہیں۔

معمول کے مطابق ناشتہ کرنے کے بعد فیروز جب جانے لگا تو اُسے احساس ہوا کہ اُس کی جیب میں موبائل نہیں تھا، وہ موبائل کمرے میں بھول آیا تھا۔ وہ موبائل لینے کیلئے واپس پلٹا تو صفا کو اپنے سامنے پایا...... کافی دن ہوئے، دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوتی تھی، وہ اب اُسے سامنے دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے''۔ صفا نے کہا۔

اس کا لہجہ سادہ اور ہموار تھا جس نے فیروز کو حیران کیا۔

''اُس نے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل پہ پڑا اپنا موبائل اُٹھایا۔ اور پھر اُسے دیکھا۔

''بولو''۔ اُس نے کہا۔

''مجھے کچھ پیسے چاہئیں''۔ اُس نے صاف لفظوں میں مدعا بیان کیا۔ وہ ذرا سا چونکا مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا، بٹوا نکالا اور چند بڑے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے، صفا نے نوٹ دیکھے، پھر اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ کم ہیں۔ مجھے زیادہ روپے چاہئیں''۔ اُس نے کہا۔

فیروز کے چہرے پر اُلجھن لہرائی، مگر اُس نے لفظوں میں اظہار نہیں کیا، سر ہلا کر روپے واپس بٹوے میں ڈالے، چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی منتخب کی اور لاکر کھولنے لگا، دراز میں سے روپوں کی ایک موٹی گڈی نکال کر اُس کی طرف بڑھائی، صفا نے فوراً پکڑ لی۔

''شاپنگ کرنی ہے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''صفا نے نوٹوں سے دھیان ہٹا کر اُسے دیکھا۔

''نہیں......'' اُس نے کہا۔

وہ حیران ہوا۔ ''پھر!'' انداز سوالیہ تھا۔

''صفا خاموش رہی۔ فیروز نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بٹھا دیا اور اُس کے ساتھ خود بیٹھ گیا۔

''بہت عرصے سے ہم دونوں ایک ابنارمل، زندگی جی رہے ہیں، آج میں تم سے کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو! میری بات سنو''۔ اُس نے کہنا شروع کیا۔

صفا خاموشی سے اُسے دیکھے گئی، اُس کی بات دل کو لگتی تھی۔ وہ دونوں ابنارمل زندگی گزار رہے تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ زبردستی کی تھی۔ مگر میری بھی کہانی ہے، سنو گی؟'' اُس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

صفا نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا جس کے چہرے پہ مظلومیت نقش تھی، ایک صفا نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا جس کے چہرے پہ مظلومیت نقش تھی، ایک لمحے کو اس کا دل کیا کہ وہ انکار کر دے مگر پھر اُس نے دل کو روک لیا۔ اُسے کونسا فیروز کے ساتھ رہنا ہے۔ اسے اپنا فیصلہ پتا تھا جبھی اُس نے سوچا بھلا فیروز کی بات سننے میں کیا جاتا ہے۔

✦✦✦
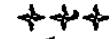
تم ظرف میں بھی کم ظرف تھے
تم ذات میں بھی بدذات نکلے

اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور سامنے بیٹھے لعل کو دیکھا۔

''اب کیا کرنا چاہیے لعل؟'' اُس کا لہجہ سوچتا ہوا سا تھا۔

''سردار صاحب! جرگے کی کارروائی کے بارے میں مجھ سے بہتر آپ جانتے ہیں''۔ اُس نے سر ہلایا۔

''آپ چھوٹی بی بی سے ملنے جائیں گے؟'' اُس نے روٹین سیٹ کرنی ہوتی تھی۔ اُسے لمحہ لمحہ حساب رکھنا پڑتا تھا کہ سردار صاحب کہاں جائیں گے، کس کو کتنا وقت دیں گے۔

''ہاں۔ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم گاڑی تیار کرواؤ، میں ایک فون کال کرلوں''۔ اُس نے موبائل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لعل سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

سردار ہاشم نے فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا اور کان سے لگا لیا۔

''آپ سے ایک بات کرنی تھی اماں'' اس کا لہجہ آہستہ تھا۔

''ہاں بولو''۔ انہوں نے مصروف سے انداز میں کہا۔ یہ ان کے وظائف پڑھنے کا وقت تھا اور اس وقت ہاشم کا فون عمومی طور پر آتا تو نہیں تھا۔

''وہ گل لالہ کو واپس مانگ رہے ہیں''۔ اُس کا لہجہ پست سا تھا۔

اماں نے بڑے سکون سے اس کی بات سنی۔

''وہ کوئی چیز ہے؟ جو واپس مانگ رہے ہیں؟ وہ کوئی جائیداد یا گاڑی نہیں کہ بھئی آج دی کل واپس لے لی..... وہ بیوی ہے تمہاری''۔ ان کا لہجہ سخت تھا۔

ہاشم کو جواب نہیں سوجھا۔

''کہتے کیا ہیں؟ کیا جرگہ بٹھائیں گے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''شائد''۔ ہاشم نے کہا۔

''لڑکی کیا کہتی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' اُسے واضح کیا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس بار سوال قدرے مشکل تھا۔

''کم از کم میں اُسے واپس نہیں بھیجنا چاہتا''۔ اُس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اچھی بات یہ ہے تم اپنے ذہن میں واضح کر چکے ہو کہ لڑکی رکھنی ہے یا واپس بھیجنی ہے۔'' اماں نے کہا۔

''ظاہری بات ہے اماں میں کیسے بھیج سکتا ہوں واپس۔'' اُس نے کہا۔

''لیکن ہاشم، ایک بات یاد رکھنا، جرگہ لڑکی کے بیان پہ جائیگا، تمہاری مرضی اہمیت نہیں رکھتی۔'' انہوں نے واضح کیا۔

''میں جانتا ہوں''۔ اُس نے گہرا سانس لیا۔

''لڑکی تمہارے حق میں بیان دے گی؟'' اماں نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا ہوں مگر ایک بات واضح ہے۔ میں اُس پہ کوئی زبردستی نہیں کروں گا''۔ اُس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

جواباً اماں چند لمحے کیلئے [illegible] گئیں۔

''بالکل اپنے باپ جیسے [illegible] بھی زبردستی کے قائل نہیں تھے۔ اب سوچتی ہوں کر ہی دیتے''۔ انہوں نے سنا کی سے ہنس کر کہا۔

بات تلخ تھی مگر سچ تھی۔

''پھر بات کروں گا''۔ [illegible] نے فون بند کر دیا۔

یہ بات ایسی تھی جو [illegible] اسے گم صم رکھتی تھی..... اُس کو کھانا پینا بھلا دیتی تھی، اُس سے فیصلہ کرنے کی طاقت چھین لیتی تھی۔

اُس کی زندگی کے سب سے تکلیف دہ یاد!

✦✦✦
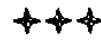
دشمنوں سے کیا شکوہ
کیا گلہ رقیبوں سے
یہ سانپ آستینوں
ہم نے خود ہی پالے ہیں

منظر ہے سردار تبریز کے دفتر کا، جہاں وہ معمول کے مطابق اپنے خاص آدمی جبار کے ساتھ موجود ہے۔

''کیا مسئلہ ہے جبار؟'' اُس نے بے زاری سے پوچھا۔

''نادر بہت تنگ کر رہا ہے''۔ جبار نے پریشانی سے کہا۔

''کیا مطلب؟ کیا چاہتا ہے وہ؟'' اُس نے چونک کر کہا۔

اُس کے میز پہ مختلف کاغذات بکھرے تھے۔ جس پہ وہ لیب رزلٹس بھی پڑے تھے جن کے مطابق گندم کی فصلیں سردار ہاشم کی زمینوں پہ کبھی نہیں اُگ سکتی تھیں۔

اصل فصل تو وہ تھی!

جو سردار تبریز نے اُگائی تھی سردار ہاشم کی راہ میں۔ نور بابا کا قتل کروایا، اُس کی دوسری شادی کروائی اور اُس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول دیا۔

عالیہ سے اُس کے تعلقات پہلے ہی خراب تھے اس شادی کے بعد گویا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے، اُس کی زمینوں میں زہر ملایا جو کئی سالوں سے بنجر تھیں، اُس کی زمینیں کبھی فصل نہیں دے سکتیں تھیں، سحر شاہ کو دانستہ رُسوا کرنے کی کوشش، اور سب سے بڑھ کر گل لالہ، جو اُس کی کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ مستزاد اُس کی راہ میں جو دیگر روڑے اٹکائے گئے، اُس کے گھوڑے کو مروانا، اُس پہ قاتلانہ حملے غرض...... یوں اُس کی زندگی کو اپنی انگلیوں پہ نچا رہا تھا کہ اگر سردار ہاشم کو پتا چل جاتا تو شاید وہ حیرت سے مرجاتا...... کہ یہ دشمن تو وہ کب سے آستین میں پال رہا تھا۔

نادر گلاب جان!

وہ آدمی جس نے نور بابا کو قتل کیا تھا۔

''اُس کو انسانی ہمدردی کے دورے پڑ رہے ہیں، کہتا ہے رات کو نیند نہیں آتی، نور بابا کی روح ستاتی ہے''۔ جبار ڈرا ہوا سا لگتا تھا۔

''تو اُس کو بھی نور بابا کی روح کے پاس پہنچا دو''۔ اُس نے سفاکی سے کہا۔ یوں جیسے نادر گلاب جان انسان نہ ہو بلکہ کوئی مکڑی ہو یا پھر شائد مکھی۔

جبار نے پریشانی سے اُسے دیکھا۔

''یہ ممکن نہیں ہے سردار صاحب۔'' اُس کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

''کیا مطلب ہے؟'' اُس کے ماتھے پہ شکن آگئی۔

''یہ وہ لوگ ہے جو ہمارے لئے کام کرتے ہیں۔ اور یہ تنہا نہیں ہوتے، ان کے پیچھے ان کے قبیلے ہوتے ہیں۔ ہم ان سے دوسروں کو مرواتے ہیں۔ مگر ہم ان کو مار نہیں سکتے، ان کو خراش بھی آ جائے تو ان کے ساتھ قبر کی دیواروں تک دشمن کا پیچھا کرتے ہیں۔'' اُس نے تبریز کو حقیقت سے پوری طرح آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

تبریز نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے گھورا۔

''تمہارا مطلب ہے میں اُسے ڈر کر یونہی چھوڑ دوں تاکہ کل کو ہاشم کے پاس پہنچ جائے اور سب کچھ بتادے''۔ اُس نے غرا کر کہا۔

''ایسی جرأت نہیں ہے اس کی''۔ جبار کا لہجہ پُریقین تھا۔

''اگر اُس کا ضمیر اتنا ہی باضمیر بن رہا ہے تو مجھے اُسے بے ضمیر بنانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ ملواؤ مجھے اُس سے''۔ اُس نے سرد لہجے میں کہا۔

''جی میں بلاتا ہوں اُسے''۔ جبار نے کہا۔

پھر جاتے جاتے پلٹا۔

''ایک بات بتانی تھی آپ کو......'' اُس کے انداز میں جھجک تھی۔

تبریز نے کھٹک کر اُسے دیکھا۔

''کونسی بات؟''

''لالی بی بی، سردار ہاشم سے ملنے والی ہیں''۔ اُس کے ادب سے سر جُھکا کر کہا۔ تبریز نے اتنی تیزی سے گردن موڑ کر اُسے دیکھا کہ اُس کی گردن کی ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی۔

''اُس پہ نظر رکھنا، میں نہیں چاہتا وہ ہاشم سے ملے''۔ اُس نے تیزی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسا آپ کہیں گے، ویسا ہی ہوگا''۔ اُس نے سر ہلا کر کہا۔

تبریز نے سر ہلا کے اُسے جانے کا اشارہ کیا۔

جب وہ چلا گیا تو وہ پریشانی سے ایک نمبر ملانے لگا، اُسے اگلی فکر لگ گئی تھی۔ بھلا لالی کیوں ملنا چاہتی ہے ہاشم سے؟

❖❖❖

جرنل لکھنا......

جمیل مراد کو ہمیشہ ہی ایک فضول اور بورنگ کام لگا تھا۔

مگر اب وہ باقاعدگی سے جرنل لکھنے لگا تھا۔

اس کی عادت اُسے ڈاکٹر فریڈی نے ڈالی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جرنلنگ کرنے سے وہ بہتر طور پر اپنے احساسات کو سمجھ پائیگا۔

اور آج اُس نے خود سے ایک سوال کرنا تھا۔

اور کیا تھا یہ سوال؟

''کیا محبت کو پائے بغیر انسان خوش رہ سکتا ہے؟'' اس سوال کا جواب اُسے لکھنا تھا۔ مگر اس نے سوچا کہ وہ اس کا جواب لفظوں میں کیسے دے سکتا ہے۔ لفظ تو صرف تھیوری میں پریکٹیکل نہیں۔ جبکہ خوش رہنا تو ایک پریکٹیکل کام ہے۔ وہ تجربہ کئے بغیر کیسے خوش رہ سکتا ہے۔

اُس نے جرنل میں لکھنا شروع کیا۔

کیا چیزیں خوشی دیتی ہیں؟

''گیت سُننا؟

شاعری پڑھنا؟

کسی ادبی تقریب کی صدارت کرنا

یا پھر اسٹیج سکرٹری کے فرائض سرانجام دینا،

ماں باپ کیساتھ لنچ پہ جانا؟

سر پہ ایک مضبوط چھت کا ہونا؟

واڈروب میں من پسند کپڑوں کا ڈھیر؟

یا پھر سب سے بڑھ کر بینک اکاؤنٹ کا روپوں سے بھرا ہونا؟

کیا خوش رہنے کیلئے اتنی ساری چیزیں ناکافی ہیں؟

کیا صرف ایک انسان کا ساتھ نہ ہونا ہمیں باقی ساری نعمتیں بھلا دیتا ہے۔ یا پھر ہم ہی اتنے ناشکرے ہوتے ہیں کہ بس وہی ایک گلاب جو ہمارے باغ میں نہیں کھلتا اُسے حاصل کرنے کے دھن میں مرے جاتے ہیں جبکہ باقی سارا چمن رنگارنگ گلوں سے مہکا ہوتا ہے مگر ہمیں وہ نظر نہیں آتا۔ ہماری نظر خالی گلاس ہی کیوں دیکھتی ہے؟؟؟
اس میں کیا شبہ؟ کہ من پسند ہستی کینہ بنے سے سارے منظر پھیکے لگتے ہیں مگر کیا زندگی کو رنگین کرنے کیلئے جو نہیں ملتا اُس کا ملنا ہی ضروری ہے؟؟؟"
اُس کے قلم کی سیاہی سوکھ گئی، سیاہ جلد والا ضخیم جرنل اُس کے لفظوں پہ گم صم سا پڑا تھا۔"

٭٭٭

منظر ہے سردار محمود عالم کے حجرے کا جہاں وہ تینوں نفوس موجود تھے۔ محمود عالم اور تبریز ساتھ بیٹھے تھے جبکہ لالی اُن دونوں کے سامنے براجمان تھی۔
"لالی! تمہیں سمجھ آرہی ہے ناں بابا کیا کہہ رہے ہیں؟" تبریز نے اضطراب سے پوچھا۔
"جی ہاں لالہ، آپ بالکل فکر مت کریں۔ میں بالکل اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" گل لالہ نے اطمینان سے جواب دیا۔
"ذرا میری تسلی کیلئے اپنا بیان دوبارہ دہراؤ" تبریز نے کہا۔
گل نے سر ہلا کر بولنا شروع کیا۔
"میں گل لالہ دختر محمود عالم اس جرگہ میں اقرار کرتی ہوں کہ وٹے سٹے کی رسم کے مطابق میری شادی زبردستی سردار ہاشم سے کی گئی، اب جبکہ سحر نہیں رہی تو اس شادی کا اصولی طور پر کوئی جواز نہیں بچتا، اس لئے مجھے سردار ہاشم کے ساتھ نہیں رہنا"۔ اُس نے بڑے ہموار لہجے میں بات مکمل کر کے تصدیقی نظروں سے تبریز کو دیکھا۔
اُس نے بدمزگی سے سر نفی میں ہلایا۔
"اوہ ہو لالی..... کیا کر رہی ہو آخری سطر ٹھیک سے بولو ناں..... کہ مجھے سردار ہاشم سے طلاق چاہئے"۔ تبریز نے اُس کی دُرستی کی۔
اُس نے ہاں میں سر ہلایا، مگر بولی کچھ نہیں۔
"وہ ٹھیک نہیں کر رہی ہے تبریز اُسے پریشان مت کرو، لالی بیٹے، تم جاؤ اور ذرا دیر آرام کرلو..... تمہارا تازہ دم نظر آنا بہت ضروری ہے تاکہ جرگہ کو یقین آسکے کہ تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے"۔ سردار محمود عالم نے اُسے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔
"بابا صحیح کہہ رہے ہیں لالی، جاؤ تم آرام کرو"۔ تبریز نے اُس کا کندھا تھپکا۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر سر ہلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔
جب وہ باہر نکلی تو سردار محمود نے تبریز کو دیکھا۔
"تمہیں لگتا ہے یہ ایسا ہی کرے گی؟" انہوں نے فکرمندی سے کہا۔
"کیوں نہیں کرے گی بالکل کرے گی۔" تبریز نے یقین سے کہا۔
"تبریز! ایک بات یاد رکھنا، اگر ذرا سی بھی گڑبڑ ہوئی تو میں اس بار بہت برا پیش آؤں گا۔ میں

اس بار ہرگز کوئی رسک نہیں لینا چاہتا"۔ انہوں نے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔
"آپ بے فکر رہیں، جیسا ہم چاہتے ہیں بالکل ویسا ہی ہوگا۔" تبریز نے انہیں یقین دلایا۔
"اگر لالی نے کوئی بڑبڑ کردی تو؟" انہوں نے خدشے کا اظہار کیا۔
"لالی کیوں گڑبڑ کرے گی؟ وہ ہر صورت ہمارا ساتھ دے گی، آپ بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ کسی صورت ہاشم سے شادی کیلئے راضی نہیں تھی۔" تبریز نے کہا۔
محمود عالم نے فکرمندی سے داڑھی کھجائی۔
"میرے ذہن میں ایک سوال ہے؟" انہوں نے کہا۔
"کیا؟" اُس نے پوچھا۔
"اگر..... اگر کسی بھی وجہ سے ہاشم لالی کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا یا بالفرض جرگہ کسی وجہ سے ہاشم کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے تو..... تب ہی کیا کریں گے؟" انہوں نے کہا۔
تبریز نے زور سے ان کا ہاتھ تھام کر بھینچا۔
"آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ میں ہوں ناں۔ میرے پاس ہمیشہ پلان بی ہوتا ہے"۔ تبریز نے کہا۔
"کیا مطلب؟" انہوں نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔
"میرا مطلب ہے بابا..... کہ
اگر ہم ناکام بھی ہوتے ہیں تب بھی میں یہ بازی ہاشم کو نہیں جیتنے دوں گا"۔ اُس نے انتقام سے بھرے لہجے میں کہا۔
"کیا کرو گے تم؟" انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔
"سنا ہے سردار ہاشم کو گھوڑے اصلی اور انسان نسلی پسند ہیں..... تو میں کروں گا یہ....." وہ ڈرامائی انداز میں کہتا ذرا سا اُن کی طرف جھکا۔
"کہ میں صرف گل لالہ کی بائیولوجیکل رپورٹس اُسے بھیج دوں گا۔ جس کے مطابق وہ آپ کی بیٹی نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ مگر سردار محمود ہاشم کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
"تم اُسے بتاؤ گے کہ وہ لے پالک ہے"۔ سردار محمود کو جیسے دکھ ہوا تھا بہت سارا۔
"ہاں! میں اُسے بتا دوں گا"۔ اُس نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ سردار محمود عالم خاموشی سے اس دیکھتے رہے۔
"اور جب اُسے پتا چلے گا کہ وہ تو ہمارا خون ہی نہیں پھر کیسے اُس کا دل مانے گا کہ اُس بے نسلی لڑکی کو اپنے گھر رکھے"۔ وہ حظ لیتے ہوئے بولا۔
"مگر لالی کو اس سب کا کیا جواز دو گے؟" آج کی گفتگو میں انہوں نے پہلا عقل مندانہ سوال کیا تھا۔
"میں اُسے وجہ بتانے کا پابند کب سے ہو گیا"۔ وہ تیکھے لہجے میں بولا۔
سردار محمود نے خاموشی سے اسے دیکھا۔
"اور ویسے بھی میں جو بھی کر رہا ہوں انتقام کیلئے کر رہا ہوں اور بدلے کی آگ میں دو چار گھر جل

بھی جائیں تو کیا؟" اُس کا لہجہ خون آشام تھا۔ اور باہر کھڑی لالی کے قدموں کے نیچے سے ایک بار پھر زمین نکل گئی تھی۔

❖ ❖ ❖

"اُس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس نے کیسے سوچا تھا کہ وہ تبریز پہ یقین کر سکتی ہے۔ دھوکہ تو وہ جو وہ اُسے ایک بار پہلے ہی دے چکا تھا۔ اب بھلا کونسا دوکہ مزید کھانا تھا اُسے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس قدر بے حیثیت اور بے وقعت تھی اُن دونوں کی نظروں میں۔ کتنی بے مول اور بے مایا...... اور اپنی تیئس سالہ زندگی میں پہلی بار اُس نے سوچا کاش اُس کے ماں باپ زندہ ہوتے... کاش وہ اتنی بڑی حویلی میں پلی بڑھی نہ ہوتی وہ کسی عام سے گھر سے تعلق رکھتی جہاں کم از کم اُس کی خوشی کا خیال تو کیا جاتا۔ کوئی کچھ اور نہ سہی اُسے انسان تو سمجھا جاتا۔

اس بار تو وہ واقعی خوش فہمی میں ماری گئی تھی اُسے لگا تھا کہ تبریز واقعی اُسے بچانا چاہتا ہے۔ اپنے کیے کا مداوہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر تبریز نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ سانپ ہی تھا جو کہ عین اپنی فطرت کے صرف ڈسنا جانتا ہے۔ اگر وہ بصیرت رکھتا تو دیکھتا کہ وہ کس طرح اُسے لعل، اُس کے بیٹے ننھے سبطین پہ دن رات ایک کر رہی تھی۔ وہ پہلے دن سے ہی گل کی جھولی میں آیا تھا اور اب تو وہ معصوم شاید اُس کو ہی اپنی ماں سمجھتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ تبریز کی نظروں سے اوجھل تھا۔

شاید اُس کی آنکھوں کے آگے نفرت اور انتقام کی بندھی پٹی اس قدر مضبوط تھی کہ اُسے کچھ دکھتا ہی نہ تھا۔

ایک لمحہ لگا تھا اُسے یہ سمجھنے میں کہ اگر وہ ہاشم سے طلاق لے بھی لے تب بھی تبریز کبھی بھی اُس کی شادی بجیل سے نہیں کروائے گا بلکہ وہ صرف اُسے استعمال کر رہا تھا۔

اور بجیل کا نام استعمال کر کے دراصل اُس نے لالی کے آگے چارہ ڈالا تھا۔ جسے نگل کر بخوشی وہ جال میں پھنسنے کو تیار تھی اگر جو وہ چھپ کر اُن کی باتیں نہ سنتی تو۔ مگر اب اور نہیں۔ اب بس۔ اُس نے سختی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

اب وہ مزید نہیں روئے گی، نا اعتبار کرے گی، اب وہ وہی کرے گی جو اُسے ٹھیک لگتا ہوگا۔

اُس نے موبائل پکڑا اور سردار ہاشم کو کال ملا لی۔

❖ ❖ ❖

یہ دوسری بار ہوا تھا۔

گل کو ہاشم سے ملنے نہیں دیا جا رہا تھا۔

ہاشم نے اسے ملنے سے منع کر دیا مگر یہ بات اُس کیلئے بھی بڑی توہین کا باعث تھی جبکہ وہ اپنے سسرال کے گیٹ پہ گاڑی لئے کھڑا تھا اور چوکیدار اُس سے کہہ رہا تھا کہ وہ لالی بی بی کو نہیں باہر آنے دے گا۔ ساتھ کھڑے گن مین کو حکم دیا گیا تھا کہ خلاف ورزی کی صورت میں سیدھی گولی چلا دی جائے۔

چونکہ ہاشم خود بھی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا جبھی وہ اپنے شاہی پروٹوکول کی بجائے سادہ کپڑوں میں سیاہ شیشوں والی گاڑی میں اکیلا آیا تھا۔

گیٹ کے دوسری طرف کھڑی لالی نے پھڑ پھڑا کر گیٹ کی جھری سے نظر آتی ہاشم کی گاڑی کو دیکھا۔

اُس نے غور سے گیٹ کیپر کو دیکھا۔

"گیٹ کھولو"۔ اُس نے چلا کر کہا۔

"سردار صاحب نے آپ کے باہر جانے پر پابندی لگائی ہے"۔ اُس نے مضطرب ہو کر کہا۔

"باہر جانے پر پابندی لگائی ہے؟ مگر یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اس گیٹ کے باہر کھڑی گاڑی میں میرا شوہر ہے اور مجھے اُس سے بات کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا؟" اُس نے اعتماد سے کہا۔

چوکیدار نے تذبذب کے عالم میں گن مین کو دیکھا۔

"مگر لالی بی بی......" گن مین نے کچھ کہنا چاہا۔

"باہر موجود شخص کو جانتے ہو ناں وہ کون ہے؟" اُس نے دھاڑ کر کہا۔

"وہ چاہے تو ایک اشارہ کرے اور تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔ اس لئے مجھ سے بحث مت کرو اور گیٹ کھولو"۔ اُس نے حکم دیا۔

دونوں آدمیوں نے نظروں سے کچھ تبادلہ کیا پھر جیسے اُن کا اتفاق ہو گیا کہ کونسا لالی کہیں جا رہی ہے۔ بس مل ہی تو رہی ہے۔ جبھی اُس نے گیٹ کھول دیا۔

گیٹ کھلتے ہی وہ باہر نکلی، اُس نے گرم شال اوڑھی ہوئی تھی، اُس نے ذرا سا چہرہ ڈھانپا ہوا تھا، موسم بے حد سرد اور جما دینے والا تھا۔

جب وہ گاڑی میں دروازہ کھول کر بیٹھی تو گاڑی میں ہیٹر آن ہونے کی وجہ سے مزے دار اور پُرکون سی حدت تھی۔

گاڑی درختوں کے گھنے جھنڈ کے نیچے کھڑی تھی اور اس درختوں کے جھنڈ کو دھند نے ملفوف کر رکھا تھا۔ بادی النظر میں محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہاں کوئی تھا۔

سردار ہاشم کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پہ تھے۔ اُس نے گل لالہ کو بیٹھتے دیکھا مگر اُس کی طرف دیکھا نہیں اُسی طرح اسکرین کے پار دھند میں چھپے درختوں کو دیکھتا رہا۔

"السلام علیکم"۔ لالی نے کہا۔

"وعلیکم السلام"۔ اُس نے دیکھے بغیر کہا۔

"کیسی ہو؟" ہاشم نے پوچھا۔ لہجہ اتنا سادہ تھا کہ جیسے یونہی راہ چلتے چلتے کسی راہ گیر سے رسمی حال چال پوچھ لیا جائے۔

"ٹھیک ہوں"۔ وہ مسلسل اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُسے حیرت ہوئی کہ ہاشم نے ابھی تک اُس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔"

اُس کے "ٹھیک ہوں" کہنے پہ ہاشم نے ہلکا سا سر خم کیا۔

"کیا چاہتی ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں"۔ اُس نے یک سطری جملے میں گویا سردار ہاشم کی دنیا ہی بدل ڈالی۔

ہاشم نے ایک بار گردن موڑ کر اسے دیکھا، گردن کی گھنٹی ڈوب کر اُبھری، آنکھوں کی چمک
[illegible] تیز محسوس ہوئی سانس خارج کیا کہ گل لالہ کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ مردوں [illegible]
[illegible] جیسا تھا۔
[illegible] تو گل نے دیکھا کہ اُس کی آنکھ [illegible] کنارے لال تھے، یوں جیسے وہ

[illegible]
[illegible] بولی۔ وہ آپ کی طرف [illegible] نہیں رہا؟
[illegible] آپ سے ملنے آئی ہوں، اس کے بعد آپ کو میری ہمت پہ شک نہیں کرنا
چاہیے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔
"[illegible] نہیں رہا، تمہیں تیار کر رہا ہوں۔ چاہوں تو ابھی بھی تمہیں ساتھ لے کر جا سکتا ہوں۔ کون
[illegible] مجھے؟"
"[illegible] مردوں کے جرگے کے آگے نامردیت نہیں ہونا چاہتا۔ میں بھی سب کے بیچ میں سے
[illegible] گا۔" [illegible] نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اب مکمل طور مسکرائی۔
"ہم دیکھیں گے۔" وہ [illegible] بولی۔ ہاتھ دروازے کے ہینڈل پہ رکھا اور باہر نکل گئی۔
وہ جب [illegible] ہاشم نے پہلی بار گردن موڑ کر اسے دیکھا، اسے گل لالہ کی پشت نظر آئی
[illegible] میں خوف... وہ چند سیکنڈ بعد دھند کا حصہ بن گئی۔

+++

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوح ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہل حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارض خدا کے کعبے سے
سب بت اُٹھوائے جائیں گے
ہم اہل صفا مردود حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اُٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
منظر تھا جرگہ کا،
جہاں وہ سب موجود تھے......
سردار محمود عالم، سردار تبریز اور گل لالہ ایک قطار میں دھری کرسیوں پہ بیٹھے نظر آرہے تھے۔
دوسری طرف جرگہ کے معزز اراکین موجود تھے۔
چونکہ سردار ہاشم تا حال نہیں آیا تھا جبھی اُس کے انتظار کی وجہ سے کارروائی مؤخر کی گئی تھی۔
لالی نے نیلے آسمان کو دیکھا اور پھر اُس کی آنکھوں سے منظر تحلیل ہوتا ہوا آج صبح کے منظر میں
بدل گیا۔ جہاں وہ اپنے کمرے کے بیڈ پہ ننھے سبطین کو ساتھ لپٹائے بے تحاشا پیار کر رہی تھی۔ اُس کی
آنکھوں سے لگا تار آنسو بہہ رہے تھے وہ جانتی تھی کہ دوبارہ وہ اُس بچے کی شکل بھی نہیں دیکھ پائے
گی۔
اُس نے اپنے ہینڈ بیگ میں اپنی چند ضروری اشیاء لے لی تھیں...... باقی سب اُدھر ہی چھوڑ دیا
تھا۔
آج کے بعد اُسے بھلا کب واپسی کا اِذن ملنا تھا؟ اُس نے اذیت سے سوچا اُسے یاد آیا......
دوسرا منظر...... جب وہ جرگہ کیلئے نکل رہی تھی......
شاکرہ جبار سے محوِ گفتگو تھی، لان میں کھڑے دونوں کی پشت اُس کی طرف تھی۔
"سردار صاحب! یہ گاڑی کیوں استعمال نہیں کر رہے؟" اُس نے جبار سے پوچھا۔
"پہلے استعمال نہیں کر رہے تھے...... اب کریں گے، تمہیں پتا ہے اُس دن کیا ہوا تھا؟" جبار نے
پُر اسرار انداز میں کہتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "کس دن؟" شاکرہ تجسس سے آگے ہوئی۔
"جس دن سحر بی بی مری۔" جبار نے کہا۔
"کیا ہوا تھا؟ شاکرہ نے حیرت سے پوچھا۔
"مجھے پتا چلا تھا کہ سردار تبریز کو اُس دن لالی بی بی کی کوئی بات پتا چلی تھی"۔
جبار نے تجسس کو ہوا دی۔
"کون سی بات؟" شاکرہ نے اس بار جھلا کر پوچھا۔
"وہی یونیورسٹی کے لڑکے والی بات"۔ اُس نے یاد دلایا۔
"وہ بات تو ختم نہیں ہوگئی تھی اور اب تو لالی بی ب کی شادی بھی ہو چکی ہے"۔ اُس آنکھیں حیرت
سے پھیل گئیں۔

(باقی آئندہ)

ایشاءگل

بلی کی سی چال چلتی وہ دادا کے کمرے کی دلیز تک آٹھہری اور بڑی بڑی آنکھیں گھما کر آس پاس دیکھا۔ کمرہ خالی تھا یعنی راستہ صاف تھا۔ اب کہ اس نے بڑی بڑی آنکھوں کو زوم، کرتے ہوئے قدرے چھوٹا کیا اور مطلوبہ چیز نظر آتے ہی ایک ہی جست لگاتی اس تک جا پہنچی فوراً سے اس چیز پہ ہاتھ صاف کیا اور مزے مزے کرتی واپس پلٹنے لگی جب کسی کے کھانسنے کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ اوہ تیری یہ تو دادا ہیں اب کیا کروں۔۔۔کیا کروں۔۔۔ہاں یہاں چھپ جاتی ہوں۔ اس نے سوچنے میں زیادہ وقت برباد نہ کیا اور فوراً سے پہلے بیڈ کے نیچے گھس گئی مگر یہ کیا۔۔۔اف اتنی مٹی اور جالے۔ بامشکل اس نے اپنی کھانسی کا گلا گھونٹا۔

''ارے بھئی میری چائے نہیں آئی ابھی تک کہا بھی تھا کہ کمرے میں بھجوا دینا۔''

دادا صاحب قدرے اونچا بولے تو دروازے کے باہر سے گزرتیں حمیرا نے رک کر

ناولٹ

اندر جھانکا۔

''توبہ ہے ایک کام کہا تھا رینو کو وہ بھی کرتے ہوئے موت پڑتی ہے اس لڑکی کو اور اب نا جانے کہاں دفعان ہو گئی ہے۔''

جبکہ بیڈ کے نیچے تقریباً سانس روکے بے چاری رینو اپنی ماں کے منہ سے اپنی شان میں نئے قصیدے سن کر بڑبڑائی۔

''ہونہہ آپ کو کیا پتا اماں کہ رینو کے لئے دادا کی چائے سے بھی بڑھ کے ضروری کام ہیں اس دنیا میں۔''

اس نے ہاتھ میں دبی چیز پر اپنی گرفت مضبوط کی تھی۔

''پتا نہیں کب سنے گی یہ کسی کی بات اللہ حافظ ہے اس لڑکی کا تو خیر ابا حضور میں بھجواتی

ہوں چائے۔"

حمیرا رینو کی مزید تعریفیں کرتیں پلٹ گئیں۔ فکر کیوں کرتی ہیں اماں سن رہی ہوں سب سن رہی ہوں میں۔ وہ تپی۔ چائے آئی بڑے ابا نے پی اور اب ٹانگیں بیڈ پر سیدھی کرتے لیٹ گئے۔

"اف میں کب تک پھنسی رہوں گی یہاں اگر تھوڑی دیر بھی اور رکی تو فوت ہو جاؤں گی اور۔۔۔"

اور سے آگے اس کی زبان کو جیسے لقوا ہو گیا آنکھیں خوف کے مارے پھٹنے کو آ گئیں جسم کانپنے لگا کیونکہ بڑی بڑی مونچھوں والا لال بیگ اپنی کڑی آنکھوں سے اسے گھورتا رک رک کر اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔ پورا خاندان جانتا تھا کہ رینو میڈم کیڑے مکوڑوں سے کتنا ڈرتی ہے بلکہ دور سے دیکھتے ہی بے ہوش ہونے اور پاس سے دیکھتے ہی مرنے کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ اللہ جی مجھے بچا لیں آج کے بعد کوئی چوری والا کام نہیں کروں گی پلیز پلیز۔ وہ روتے ہوئے دعا کر رہی تھی اور تب ہی اس کے کانوں میں آواز پڑی اس نے غور کیا تو وہ دادا کے خراٹوں کی آواز تھی۔ یہ تو سو بھی گئے ہائے شکر ہے مالک۔ وہ شکر ادا کرتی بیڈ کے نیچے سے فوراً رول ہوتی نکلی مگر پھر بھی احتیاط سے سر اونچا کر کے دادا کو دیکھا تھا جو واقعی سو گئے تھے اس نے پھر یہاں دیکھا نہ وہاں اور غڑاپ سے کمرے سے غائب ہو گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی باہر آئی اور برق رفتاری سے سیڑھیاں اترنے لگی مگر آخری سیڑھی اترنے کی دیر تھی کہ کسی وجود سے ایک زوردار ٹکر کھا کر لڑکھڑاتی ہوئی دھڑام سے چمکتے ٹائلز والے فرش پر جا گری۔

"اوئی ماں مرگئی میں۔"

اپنا پیر پکڑے وہ زور سے چلائی ہاتھ میں پکڑا چشمہ جو وہ دادا کے کمرے سے چوری کر کے لائی تھی چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

"تم جیسا طوفان تو سات نسلوں کو مار کے بھی نہیں مرتا"۔

سامنے کھڑا مضبوط اور چوڑے سینے والا مرد یعنی زوہاب اعوان حسرت اور افسوس سے بولا تھا۔ رینو نے سر اٹھا کر ناسمجھی سے اسے دیکھا اور پھر بولی۔

"آپ نے مجھے طوفان کہا"۔ آواز میں صدمہ تھا جبکہ زوہاب نے اس کی کم عقلی پر افسوس کرتے ہوئے اسے دیکھا کیونکہ رینو نے اس کی پوری بات کو سمجھا ہی نہیں تھا ورنہ صدمہ اس سے بھی ڈبل ہوتا اور وہ اس کی بات کو غلط ثابت کرتے ہوئے اس صدمے سے واقعی مر جاتی۔ رینو تو ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی تھی اس سے پوچھنا بیکار ہی تھا مگر پھر بھی زوہاب نے پوچھ لیا۔

"یوں آندھی طوفان کی طرح زینے کیوں اتر رہی تھی۔۔۔؟"۔

"وہ۔۔وہ میں۔۔۔"

اس کی زبان لڑکھڑائی الفاظ اٹکے۔

"کیا وہ۔۔۔ میں سیدھی طرح بتاؤ پھر کوئی شرارت کر کے آئی ہو پھر کوئی کام خراب کیا ہے"۔

زوہاب نے کڑی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہ۔۔۔نہیں تو۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں کیا میں نے آپ چاہیں تو قسم لے لیں"۔

پیر کی درد بھلائے وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی اور فٹ سے بولی۔

"اچھا تو پھر کھاؤ قسم"۔

زوہاب بھی ڈھیٹ بنا مزے سے بولا۔ رینو نے نظریں جھکاتے ہوئے تھوک نگلا گلے میں ننھی گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ یا اللہ اس شکی مزاج، کھڑوس، اکڑو انسان کو ہمارے گھر ہی پیدا کرنا تھا۔

"کیا ہوا ہو گئی بتی گل، لگ گئی چپ، اڑ گئے طوطے ہے نا۔۔۔"۔ "آپ کی قسم زوہاب بھائی"۔

زوہاب کی بات منہ میں ہی دم توڑ گئی جب اس نے جھٹ سے اس کی قسم کھا ڈالی اور زوہاب کے گویا اپنے طوطے اڑ گئے وہ حق دق کھڑا رہ گیا۔ رینو کوئی شرارت نہ کرے ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"واپس لو اپنی قسم"۔ وہ غصے سے بولا۔

کیوں زوہاب بھائی آپ نے خود ہی تو۔۔۔ دولگاؤں گا تمہیں کیا کہا سنا نہیں واپس لو اپنی قسم"۔

وہ مزید تپا کہ کہیں اس کی جھوٹی قسم اسے اوپر ہی نہ پہنچا دے کیونکہ یقین تو اسے ایک پرسنٹ بھی نہیں تھا رینو پہ۔ "او کے او کے میں اپنی قسم واپس لیتی ہوں لیکن میں نے واقعی میں نے کوئی شرارت نہیں کی"۔ اور وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی اس نے نہ ہی کوئی شرارت کی تھی نہ ہی کوئی کام خراب اس نے تو ننھی منی سی چوری کی تھی یونہی منی سی۔

"اور یہ دوپٹہ ڈھنگ سے لیا کرو بڑی ہو گئی ہو اب تم بچی نہیں ہو جو سر جھاڑ منہ پھاڑ گھر میں گھومتی رہتی ہو"۔ زوہاب نے اس کے مفلر کی صورت میں لئے دوپٹے کو دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ رینو نے اپنے دوپٹے کی طرف دیکھا جس کے اس طرح لینے میں اسے کوئی خرابی نظر نہیں آئی تھی۔ مانا وہ

شرارتی کم عقل تھی جینز ٹی شرٹ پہنتی تھی مفلر کی صورت میں دوپٹہ لیتی تھی مگر شرارتوں پہ ڈانٹ کے علاوہ اسے کسی بڑے نے آج تک کپڑوں کے معاملے میں نہیں ٹوکا تھا کہ یہ کیوں پہنا یا ایسے کیوں لیا۔

''ہونہہ پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں خود کو گھمنڈی کہیں کے''۔

وہ تلملاتی ہوئی آگے بڑھی اور جھک کر چشمہ اٹھایا مگر شومئی قسمت کہ چشمے کی دونوں آنکھیں زخمی ہو چکی تھیں مگر تانگیں سلامت تھیں۔

''ہائے ربا یہ تو ٹوٹ گیا اگر دادا کو پتا چلا تو۔۔۔ کیسے پتا چلے گا کسی نے کون سا اسے میرے پاس دیکھا ہے''۔

ساتھ ہی وہ مطمئن ہو گئی۔ بات اصل میں یہ تھی کہ رینو میڈم کے کالج کے ٹیسٹ میں پچھتر نمبروں میں سے کسی میں تیس تو کسی میں بیس آئے تھے اور آج دادا حضور نے اس کے ٹیسٹ چیک کرنے تھے یعنی آج اس کی کلاس لگنے کا دن تھا۔ دادا کی نزدیک کی نظر چونکہ کمزور تھی بلکہ کافی کمزور تو اسی چیز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رینو نے ان کے موٹے شیشوں والے چشمے کو ننھی منی چوری کے زمرے میں لاتے ہوئے غائب کر دیا مگر یہ کام جتنا اس نے آسان سمجھا تھا اتنا تھا نہیں اس دوران اسے دو دفعہ پھنسنا پڑا ایک بار بیڈ کے نیچے تو ایک بار زوہاب کے سامنے مگر جو بھی تھا اب وہ مطمئن تھی۔ کل پرسوں تک وہ زخمی چشمہ واپس اپنی جگہ پر آ ہی جاتا تھا۔

رینو یعنی رانیہ اس گھر بھر کی اکلوتی اور افلاطون لڑکی تھی انیس سال کی تھی اور ایف اے کر رہی تھی۔ پڑھائی میں بس چوری پوری ہی تھی گزارنے لائق نمبر لے کر پاس ہو ہی جاتی تھی۔ کام کاج کوئی آتا نہیں تھا تب ہی نکمی، ہڈ حرام کے ساتھ ساتھ بیوقوف، گدھی، اور کم عقل کے القابات سے بھی مشہور تھی مختصر یہ کہ اس کا شمار آدھی پاگل، پوری نکمی اور معصومیت بھری حسین صورت والی لڑکیوں میں ہوتا تھا جبکہ دوسری طرف زوہاب، بہلو یعنی بابر دونوں بھائی رینو کے تایا زاد تھے۔ زوہاب کا شمار سمجھدار سلجھے ہوئے ہینڈسم مردوں میں ہوتا تھا جبکہ بہلو ابھی ساتویں جماعت میں تھا وہ چھوٹا مگر تیز طرار تھا۔ رینو کے کارناموں کی خبریں اکثر اسی کے ذریعے گھر والوں کے کانوں تک پہنچتی تھیں۔

+++

''اماں کب آئے گی ہماری گائے۔۔۔؟''۔

صبح سے ایک سو ایک بار پوچھے جانے والا سوال وہ اب ایک سو دو بار پوچھ چکی تھی جبکہ ''آ جائے گی زوہاب اور تمہارے ابا لینے گئے تو ہیں'' یہ جواب دے دے کر حمیرا تنگ آ چکی تھیں اور اب اس کے سوال کو ان سنا کیے جا رہی تھیں۔

''رانی آپا ویسے آپ کو کیا لگتا ہے بھائی کس رنگ کی گائے لے کر آئیں گے''۔

بہلو اسکول سے سیدھا اسی کے پاس آ بیٹھا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ تمہیں ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ مجھے آپا مت بولا کرو اور رانی تو بالکل مت کہا کرو رینو نام ہے میرا اوکے''۔ رینو نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''اوکے رانی آپا''۔ بہلو کی جلاتی مسکراہٹ اور دماغ پر رتی برابر اثر نہ ہوا۔ ''مرو تم'' وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ ''اچھا دوسری بات تو بتائیں''۔ بہلو نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔ ''دوسری بات یہ کہ گائے تو سفید رنگ کی ہی آئے گی کہہ چکی ہوں میں ابا سے''۔ وہ اترا کر بولی اور شانِ بے نیازی سے اپنے کندھوں تک آتے بال جھٹکے۔ ''کیوں آپا میں نے بھی تو بھائی سے کہا تھا کہ گائے براؤن رنگ کی ہونی چاہیے سو گائے تو براؤن رنگ کی ہی آئے گی''۔ بہلو بھی اسی کے انداز میں بولا۔ ''زیادہ دانت دکھانے اور خوش ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ گائے تو سفید ہی آئے گی''۔

''نہیں براؤن۔۔۔ نہیں سفید۔۔۔ نہیں براااؤن۔۔۔'' ''اوہو چپ کر جاؤ تم دونوں''۔ نمیرا جھنجھلا کر بولیں تو دونوں کی بولتی بند ہوئی۔

''جب دیکھو تب لڑتے ہی رہتے ہو کبھی تو زبان منہ میں رکھ لیا کرو''۔

''لو منہ میں ہی تو رکھی ہوتی ہے زبان یہ تائی اماں بھی ناں عجیب باتیں کرتی ہیں''۔

(پانچ منٹ کی خاموشی رینو کی کم عقلی کے لیے)۔

''پورا گھر سر پر اٹھائے رکھتے ہو تم دونوں''۔ وہ اونچا سا بڑبڑائیں۔

''گھر تو اماں آپا اٹھائے رکھتی ہیں سچ کہوں تو میرے تو دوست بھی ان ہی کی وجہ سے میرے گھر نہیں آتے کہتے ہیں کہ تمہاری آپا پوری ڈائن ہیں ڈائن''۔

بہلو معصومانہ لہجے میں بظاہر نمیرہ سے بولا مگر سنا رینو کو رہا تھا رینو تو کرنٹ کھا کر اچھلی۔ نمیرہ نے بھی بہلو کو گھورا۔ ''کیا کہا تم نے میں ڈائن ہوں''۔ حیرت ہی حیرت تھی۔ ''آپا میں نہیں میرے دوست کہتے ہیں''۔ وہ لاپرواہ انداز میں بتاتا بیگ اٹھائے چل پڑا مگر وہ تو جتے سے ہی اکھڑ گئی۔

''ایسی کی تیسی تمہارے دوستوں کی ایک بار نظر تو آئیں مجھے کہیں پھر ایسا حشر کروں گی کہ میرا نام بھی ڈائن۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ رینو نہیں''۔

پیچھے سے چلاتی رینو نے ہڑبڑا کر اپنا نام درست کیا اور تب ہی باہر گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ ''لگتا ہے میری گائے آ گئی''۔ وہ جوش سے کہتی صوفے سے نیچے کودتی باہر کو بھاگی۔ ''آ گئی میری گائے آ آ آ۔۔۔ آرررے یہ کیا۔۔۔ میری گائے کہاں ہے۔۔۔؟''۔

گیٹ سے اندر آتے زوہاب اور نادر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا اور پھر بولے۔

''اوہ اچھا تم قربانی کے جانور کی بات کر رہی ہو وہ تو یہ رہا''۔

''رہا مطلب۔۔۔؟''۔

رینو نے ناسمجھی سے رہا پر زور دیا۔ نادر نے اپنے ساتھ کھڑے جانور کی سمت اشارہ کیا تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ ''یا اللہ یہ۔۔۔ ابا اف۔۔۔''۔ وہ رونی صورت بناتی چلاتی ہوئی وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ زوہاب کا دل کیا قریب پڑی اینٹ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے ڈرامہ کہیں کی۔ ''کیا ہوا بیٹا بکرا پسند نہیں آیا۔۔۔؟''۔ نادر نے محبت سے پوچھا۔ رینو نے اس بات پر ان کے ساتھ کھڑے کالے رنگ کے بیں بیں کرتے بکرے کو غصے سے دیکھا اور بولی۔ ''ابا میری گائے کہاں ہے اس کو کیوں لے آئے مجھے نہیں چاہیے یہ''۔ ''بیٹا اس میں کیا کمی ہے ماشاءاللہ بہت پیارا قربانی کا جانور ہے بس رنگ کالا ہے ناں میں جانتا ہوں تمہیں سفید پسند ہے مگر سفید میں کوئی مناسب ملا ہی نہیں''۔

''ابا مجھے سفید گائے چاہیے پھر بکرا میری بلا سے آپ سفید لائیں یا کالا مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر مجھے یہ نہیں چاہیے''۔ وہ بچوں کی طرح روہانسی ہو کر بول رہی تھی۔ ''کوئی گائے وائے نہیں آئے گی اس بار ہم اسی کی قربانی کریں گے سن لیا تم نے اب یہ رونا دھونا بند کرو''۔ نادر کے کچھ بولنے سے قبل ہی زوہاب سخت لہجے میں بول اٹھا وہ مزید یہ میلو ڈرامہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ''ایک تو اس لڑکی کا بار بار رونا شروع ہو جاتا

ہے یہ نہیں چاہیے وہ نہیں چاہیے"۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ بکرے کو لئے آگے بڑھنے لگا جب بلو چلا آیا۔

"بھائی آپ میری براؤن گائے لے آئے کیا۔۔؟"۔

نادر اب اندر جا چکے تھے جبکہ رینو وہیں جبڑوں پر زور دیے کھڑی رہی اور آگ برساتی نظروں سے اس کالے بکرے اور زوہاب کو گھورنے لگی۔ "نہیں بیٹا اس بار گائے نہیں آئے گی وہ اگلی بار سہی آپ کو تو ویسے بھی بکرے بہت اچھے لگتے ہیں ناں"۔

اس سے دیکھو کیسے پیار سے آپ آپ کہہ کے بات کر رہے ہیں اور مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اف حد ہے میری گائے۔ اس کا رونا پھر سے شروع ہو گیا تھا (خاموش رونا)۔

"ہاں مگر گائے۔۔۔"۔

بلو ہولے سے بڑبڑایا رینو کی طرف دیکھا جو مرنے کے قریب تھی نہ سفید نہ براؤن آیا بھی تو بکرا وہ بھی کالا۔ "یہ بھی بہت پیارا ہے ہم اسے کہاں باندھیں گے۔۔۔؟"۔ بلو کا موڈ تو ذرا بھر میں ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ "جہاں ہمیشہ باندھتے ہیں چلو آؤ"۔ زوہاب جواب دیتا بکرا باندھنے چل پڑا جبکہ رینو یوں بیٹھی تھی جیسے اسے بھی باندھ دیا ہو۔ "کیا کیا سوچا تھا میں نے گائے کی قربانی اس کے شوربے میں ڈوبے پائے، وہ چانپیں، کچے قیمے کے کباب آہا کیا سواد آتا مگر۔۔۔ میری گائے"۔ اس نے بھاں بھاں کر کے رونا شروع کر دیا۔ "یہ سارا کیا دھرا زوہاب بھائی کا ہے ضرور مجھ سے کوئی بدلہ لینے کے لئے انہوں نے ابا کو اپنی باتوں میں لگا کر بکرے کے لئے منا لیا ہوگا ورنہ میری بات ابا نہ مانیں ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا"۔ مگر ایسا ہو چکا تھا سو دل ایک بار پھر سے بھر آیا۔ "میں بھی دیکھتی ہوں کیسے کرتے ہیں یہ لوگ اس بکرے کی قربانی"۔ رونا بند ہوا تو غصہ اور ضدی پن شروع ہو گیا۔

✧✧✧

"رینو ارے رینو کہاں ہو بھئی بیچارہ بکرا کب سے بولے جا رہا ہے جاؤ اسے پانی تو پلاؤ تمہارے ابا کھانا تو دے گئے تھے اسے"۔ ٹی وی دیکھتی رینو کے کانوں میں حمیرا کی آواز پڑی مگر پھر بھی ڈھٹائی سے ٹی وی کے سامنے جمی رہی۔ "رینو میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں"۔ اپنے سر پر کھڑی حمیرا کی آواز پر اب کہ وہ بڑبڑائی۔ "کیا ہوا اماں اتنے غصے میں کیوں گھور رہی ہیں مجھے"۔ "جاؤ جا کے پانی پلاؤ اپنے بکرے کو"۔ وہ اب کہ بیزاری سے بولیں کیونکہ وہ ایک بار میں کچھ سنتی ہی کہاں تھی۔ "کیا کہا اماں میرا بکرا؟"۔ وہ حیرت سے چلائی۔ "زیادہ بحث مت کرو جاؤ جو کہا ہے وہ کرو"۔ وہ اس کی مزید کوئی بھی اول فول سنے بغیر وہاں سے ہٹ گئیں جبکہ وہ زور سے ریموٹ شیشے کی ٹیبل پر پٹختی اٹھی اور لان کی طرف چل پڑی جس کے دائیں جانب لگے اینٹوں اور کم گھاس والے حصے میں بکرا صاحب تشریف فرما تھے۔ اس سے چار فٹ دور کھڑی وہ پہلے تو اسے رج کے گھورتی رہی اور پھر تھک ہار کر برتن میں پڑا پانی اس کے آگے کر دیا۔

"لو خود ہی پیو مجھ سے نہیں ہوتی تمہاری خدمتیں"۔ وہ ناک سے مکھی اڑاتی ایک سائیڈ پہ ہو گئی۔ "کتنا مزہ آتا ناں اگر اس کی جگہ وہ سفید گائے ہوتی اور میں اسے کھانا کھلاتی پانی پلاتی باہر گھماتی اور مہندی لگاتی"۔ وہ حسرت سے سوچتی رہی جب اسے اپنے قریب سے بلو کی آواز سنائی دی۔ "رانی آپا اس کا نام کیا ہے۔۔۔؟"۔ وہ نا جانے کب ٹپکا تھا۔ "بکرا؟"۔ وہ بیزاریت سے بولی۔ "اف میرا مطلب ہے جیسے آپ کا میرا ہم سب کا کوئی نہ کوئی نام ہے اسی طرح اس کا بھی تو کوئی نام رکھا ہوگا آپ نے بتائیں کیا ہے۔۔؟"۔

وہ سر پہ ہاتھ مارتا دوبارہ سوال گو ہوا۔

"ارے ارے میں کیوں رکھنے لگی اس کا کوئی نام یہ میرا بکرا نہیں ہے ہو ہی نہیں سکتا یہ تمہارا اور تمہارے اس لاڈلے بھائی کا بکرا ہے سو تم لوگ ہی رکھتے پھرو نام میں جا رہی ہوں"۔ وہ تن فن کرتی پیر پٹختی چل پڑی۔ "اچھا ایسا ہے تو پھر شیرو نام کیسا رہے گا"۔ بلو پرسوچ لہجے میں خود سے ہی ہمکلام تھا مگر جاتی ہوئی رینو کے کانوں میں اس کے الفاظ صاف پڑے تھے۔ لاؤنج میں آ کر وہ صوفے پر دھپ کر کے بیٹھی تھی۔ "یہ پکڑو رینو یہ مٹر نکالو کبھی کوئی کام خود سے بھی کر لیا کرو سدا نکمی اور ہڈ حرام ہی رہنا ہے کیا"۔ وہ ابھی سکون کی سانس بھی نہ لے پائی تھی کہ حمیرا نے مٹروں سے بھری ٹوکری اس کی گود میں دھری۔

"اماں مجھ سے نہیں جاتے یہ مٹر وٹر چھیلے"۔

اس نے منہ بسورتے ہوئے ٹوکری پرے کھسکانی چاہی مگر حمیرا کی تیوری دیکھ کر وہیں رک گئی۔ "کیا مصیبت ہے چھیل رہی ہوں"۔

وہ بڑبڑائی۔

"مصیبت تو تب کہنا جب سسرال میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر پاؤ گی دیکھنا پھر یہی ماں تمہیں یاد آئے گی جو ہر وقت کہتی رہتی ہے کہ تھوڑے ہاتھ پیر ہلا لیا کرو کچھ کر لیا کرو"۔ "تو کیا ہے اماں ہلاتی تو ہوں ہاتھ پیر پھر آپ لوگ ہی کہتے ہو کہ رینو ٹک کر کہیں بیٹھ بھی جایا کرو"۔ وہ سست روی سے مٹر سے دانے نکالتی بولی تو حمیرا نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "چچی اماں کہاں ہیں۔۔۔؟"۔ لاؤنج کے دروازے سے اندر آتے ہوئے زوہاب نے پوچھا۔ وہ ابھی آفس سے لوٹا تھا۔ "بیٹا آپا تو سو رہی ہیں"۔

وہ مسکرا کر گویا جواب گو ہوئیں۔

"بس۔۔۔ بس یہیں پہ تو مجھے تپ چڑھتی ہے کہ میری اماں پورے خاندان سے شیریں بن کے بات کریں گی مگر میری دفعہ ہی ان میں کسی ہلاکو خان کی روح آ جاتی ہے"۔

"یہ تم کیا منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی ہو"۔

رینو کی بڑبڑاہٹ ان کے کانوں تک پہنچی مگر لفظوں کی سمجھ نہ آئی۔

"کچھ نہیں اماں کبھی تو مجھ پہ نظر رکھنا بند کر دیا کریں"۔ وہ تنگ ہوتی رخ پھیر گئی کیونکہ عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اب اس نے بڑبڑانا تو تھا ہی سو بہتر تھا کہ رخ پھیر لے۔ حمیرا "اچھا ٹھیک ہے تیز ہاتھ چلاؤ" کہتیں کچن میں چلی گئیں۔ "کیا کر رہی ہو ڈیئر کزن" زوہاب نے فرصت سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "بڑے آئے ڈیئر کزن کے کچھ لگتے"۔ پھر وہی بڑبڑاہٹ۔ "مٹر چھیل رہی ہوں کھائیں گے کیا؟"۔ رینو نے تپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ (وہ جلے کتنا ہی کیوں نہ تپ جاتی یہ وہ مرد تھا جس کے پاس ہونے پر دل میں کہیں نہ کہیں پھول سے کھل اٹھتے تھے جس کا آس پاس ہونا من کو بھلا لگتا تھا)۔

"ضرور مگر کیا تم نے مٹر چھیلنے سے پہلے ہاتھ دھوئے تھے۔۔؟"۔

اس کو تپانے والی مسکراہٹ لئے کہا گیا۔

اف اف یہ بندہ کیا منہ میں طنز کے تیر لئے ہی پھرتا ہے۔ "نہیں کیا مطلب ہے آپ کا

کہ میں گندی ہوں صفائی سے کام نہیں کرتی"۔اس نے مٹروں پر اپنی گرفت یوں مضبوط کرتے ہوئے کہا جیسے ہاتھوں میں مٹر نہیں بلکہ زوہاب کی گردن ہو۔"میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے میں تو بس یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر ہاتھ صاف ہیں تو پھر وہ کیا لگا ہے تمہارے ہاتھ پہ۔۔۔؟"۔

زوہاب نے انگلی سے رینو کے دائیں ہاتھ کی پشت کی طرف اشارہ کیا۔اس کے اشارے کی سمت دیکھتے ہوئے جب رینو کی نظر اپنے ہاتھ کی پشت پہ پڑی تو پھر سوئی ہوئی نمیرہ جاگ اٹھیں کیونکہ رینو نے ایسی زبردست چیخ ماری تھی کہ گھر کی بنیادیں تک ہل گئیں۔گود میں پڑی ٹوکری اب فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی جس سے مٹر نکل کر ارد گرد پھیل چکے تھے۔"ہائے ربا کیا ہو گیا"۔حمیرا بے اختیار دل پر ہاتھ رکھتیں کچن سے دوڑی آئیں۔"کچھ نہیں چچی بس آپ کی بہادر بیٹی ایک چھوٹے سے کیڑے سے ڈر گئی مگر اب یہ ٹھیک ہے"۔

زوہاب نے مزے سے صوفے کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے رینو کی اڑی ہوئی رنگت کو انجوائے کرتے ہوئے بتایا جو کہ بلکل بھی ٹھیک نہیں تھی۔اس کے ہاتھ کی پشت پہ سبز رنگ کا چھوٹا سا کیڑا تھا جو کہ اب فرش پر گرا رقص کر رہا تھا۔رینو نے اسے دیکھ کر کپکپی لی اور ہاتھ دھونے سنک کی طرف بھاگی۔"پتا نہیں کیا بنے گا اس لڑکی کا"۔وہ بس افسوس سے سر ہلا کر رہ گئیں۔"آپ بے فکر رہیں چچی کچھ نہ کچھ تو بن ہی جائے گا اس لڑکی کا"۔وہ بھی رینو کی طرح بڑبڑا کر ہی رہ گیا جبکہ حمیرا گرے ہوئے مٹر اور دانے اٹھا کر ٹوکری میں رکھنے لگیں۔زوہاب نے بھی ان کی مدد کروائی تو وہ ٹوکری لئے کچن میں چلی گئیں جانتی تھیں کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے رینو مٹروں کی شکل تک نہیں دیکھے گی۔"ہاں تو ڈیئر کزن دھو آئی ہاتھ"۔کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آئی تو زوہاب اپنی مچلتی ہوئی مسکراہٹ دبا تا بولا۔

آپ ہمارے گھر میں کیوں پیدا ہو گئے زوہاب بھائی۔من ہی من میں وہ زوہاب سے بولی جبکہ دوسری طرف زوہاب کا بھی یہی سوال تھا مگر دونوں نے یہ سوال کبھی منہ پر نہیں پوچھے تھے۔"آپ بہت برے ہیں زوہاب بھائی" وہ ناراضگی سے بولی۔"برا ہوں دیکھ لو پھر بھی لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر"۔وہ فرضی کالر اچکاتے ہوئے بولا۔"اللہ رحم کرے ان لڑکیوں پر"۔وہ ہولے سے بولی تھی مگر زوہاب سن چکا تھا تب ہی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوئی۔"ویسے تمہیں میرا "تحفہ کیسا لگا۔۔۔؟"۔

بالکل آپ کے جیسا (ایک دم بکواس) مگر ایک منٹ یہ کس تحفے کی بات کر رہے ہیں۔اس نے سوچا اور پوچھ بھی لیا۔"ارے میرا مطلب ہے کہ بکرا کیسا لگا۔۔؟"۔

اُف دکھتی رگ۔"معلوم نہیں"۔وہ روٹھے پن سے رخ پھیر گئی۔"تمہیں سفید رنگ اتنا ہی پسند تھا تو پہلے بتا دیتی میں کچھ بھی کرتا مگر سفید بکرا ضرور لے آتا"۔۔کتنا اپنائیت بھرا پرواہ کردہ لہجہ تھا اس کا مگر رینو پر ذرا برابر اثر نہ ہوا کیونکہ اس لہجے کے پیچھے بھی راکھ کرنے والی مسکراہٹ چھپی ہوئی تھی۔ہونہہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ مجھے سفید بکرا نہیں گائے چاہیے تھی پھر بھی ایسا بول کر میرا دل جلا رہے ہیں نہیں اللہ جی کیوں مطلب کیوں ان کو ہمارے گھر میں پیدا کیا۔ہزار دفعہ سوچا گیا سوال پھر سے دماغ میں ابھرا۔"کیا سوچ رہی ہو رینو"۔"جو بھی سوچوں آپ کو کیا ہونہہ"۔نخوت سے کہتے ہوئے اس نے دوبارہ ٹی وی کا ریموٹ پھر سے اٹھا لیا۔"ہاں یہ تو صحیح ہے بھلا مجھے کیا"۔زوہاب بھی لاپرواہی سے شانے اچکا گیا۔

✦✦✦

عید آنے میں ابھی دو ہفتے باقی تھے مگر جیسے جیسے دن گزر رہے تھے رینو کا منہ اور بھی اترتا جا رہا تھا۔جو اس نے مانگا تھا وہ تو اسے ملا نہیں جب جب بکرے کو دیکھتی دل جل جل اٹھتا تھا۔"یوں منہ بنائے کیوں بیٹھی ہو رینو لوگ تو قربانی کے جانور کو اتنی محبت دیتے ہیں اتنا خیال رکھتے ہیں کھلاتے پلاتے اور گھماتے ہیں مگر ایک تم ہو کہ دور دور سے اسے تکتی رہتی ہو کبھی پاس جا کے اس کا حال احوال ہی پوچھ لیا کرو بیچارہ خوش ہی ہو جائے گا"۔زوہاب ایک بار پھر اس کو تپاتا لاؤنج کی جانب بڑھ گیا جبکہ وہ پیچھے خونخوار نظروں سے اسے گھورتی رہی مگر پھر نظروں کا زاویہ بدلا، غصے بھری آنکھوں میں شدید قسم والی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا اور پھر ایک دم سے وہ چلا اٹھی۔"ہائے بکرا میرا پیارا!!!! بکرا"۔۔۔"کتنا برا بھلا کہا تمہیں نہیں بلکہ اسے جو تمہیں لایا۔۔۔آئی ایم سوری۔زوہاب بھائی صحیح کہتے ہیں مجھے تمہیں کھلانا چاہیے پلانا چاہیے اور اور اور۔۔۔گھمانا بھی چاہیے۔لو کھاؤ۔۔۔ارے کھاؤ ناں"۔وہ زبردستی اسے کھلانے لگی۔"اچھا اور نہیں کھانا کیا چلو ٹھیک ہے آؤ تمہیں باہر کی سیر کروا کر لاؤں"۔انداز معانی خیز تھا۔بکرا میں میں کرنے لگا شائد سیر کا سن کر خوش ہوا تھا یا رینو کے چہرے کے عجیب خطرناک رنگوں کو دیکھ کر خوفزدہ۔رینو نے اس کی رسی کھولی اور بولی۔"چل میرے بکرے انوکھی سیر کے لئے تیار ہو جا"۔اور پھر وہ بیرونی گیٹ عبور کر گئی۔

کالونی کی کشادہ سبزے سے ڈھکی گلی میں چلتی وہ آخر تک آئی گردن گھما کے دائیں بائیں بنے بڑے بڑے بنگلے نما گھروں کو دیکھا گلی بالکل سنسان تھی۔رینو کے لبوں پہ شیطانی مسکراہٹ دوڑ آئی۔اس نے ایک دم سے رسی چھوڑی اور بولی۔"جا بکرے جا جی لے اپنی زندگی۔۔۔مگر مڑ کے میرے گھر مت آئیو اوکے۔چل چل شاباش بھاگ جا آج سے تو آزاد ہے"۔

بکرا ایساں وہاں دیکھتا اپنی پتلی ٹانگیں لئے دھیرے دھیرے آگے چلنے لگا۔رینو نے طویل سانس کھینچی اور پھر خارج کرتے ہوئے (گویا کوئی بہت ہی بڑا کارنامہ سر انجام دیا تھا) ہاتھ جھاڑے اور واپس چل پڑی۔گھر میں معمول کے مطابق نیم خاموشی تھی۔نمیرہ چاول چن رہی تھیں،زوہاب آنکھیں موندے صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جبکہ حمیرا ملازمہ سے چھت سے سوکھے کپڑے لانے کا آرڈر جاری کر رہی تھیں۔حامد (تایا ابا) فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے جبکہ دادا اپنا حقہ لئے لاؤنج میں دھواں اڑا رہے تھے،نادر گھر پر تھے نہیں جبکہ بلو بھی غائب تھا۔وہ زبردستی کی شرمندگی چہرے پر لاتی سر جھکائے لاؤنج میں داخل ہوئی۔پہلی نظر اس پہ نمیرہ کی پڑی تو بول اٹھیں۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا یوں مجرموں کی طرح سر جھکائے کیوں کھڑی ہو پھر سے کوئی الٹا کارنامہ سر انجام دے کر آئی ہو۔۔؟"۔"الٹا نہیں تائی اماں سیدھا۔اس نے من ہی من میں ان کے جملے کی تصحیح کی۔"اماں،تائی اماں،تایا ابا،دادا، زوہاب بھائی وہ۔۔۔وہ اصل میں۔۔۔"۔اس نے نظریں اٹھا کے ایک نظر دیکھا کسی کا نام لینا

بھول تو نہیں گئی مگر نہیں سب ہی پورے تھے جبکہ سب اپنے اپنے نام کی پکار پر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔"وہ بات یہ ہے کہ"۔۔۔۔۔"کیا وہ وہ لگا رکھی ہے جو بولنا ہے جلدی بولو ناں"۔حمیرا زچ ہوئیں۔"اماں وہ۔۔۔۔بکرا بھاگ گیا"۔آخر میں وہ ایک دم سے بولی تو زوہاب اور حامد ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔دادا صاحب کو تو کھانسی لگ گئی اس اچانک خبر پر جبکہ نمیرہ کے چاول چنتے ہاتھ وہیں تھمے تھے اور حمیرا تو گویا یوں تھیں کہ ہو نہ ہو رینو یہ تیرا ہی کام ہے تجھے تو میں چھوڑوں گی نہیں مگر ان کے کچھ بولنے سے قبل ہی زوہاب بول اٹھا۔"کیسے بھاگ گیا یار۔۔۔؟"۔"ٹانگوں سے زوہاب بھائی ٹانگوں سے"۔کہنے کے ساتھ ساتھ رینو نے دو انگلیوں کو بھگاتے ہوئے دکھایا تو وہ جھنجلایا۔"رینو سچ سچ بتاؤ کہاں ہے بکرا ورنہ دو تھپڑ لگاؤں گی تمہارے دونوں گالوں پر"۔

حمیرا اسے کڑی نظروں سے گھورتی پوچھنے لگیں۔

"اماں کیا ہو گیا ہے اپنی بیٹی پر شک کر رہی ہیں آپ مجھے کیا پتا کہاں گیا"۔اس نے انتہا کی معصومیت چہرے پر سجائے صفائی سے جھوٹ جھاڑا۔"ہاں کر رہی ہوں میں تم پہ شک اب جلدی سے بتا دو ورنہ تمہارے گدھے جتنے قد کا لحاظ نہیں کروں گی میں"۔اف سب کے سامنے مجھے گدھا جتنا تو مت کہو اماں۔وہ دل ہی دل میں چلا اٹھی مگر جب بولی تو یہ کہ۔۔۔"میں تو بس اسے گھمانے لے کر گئی تھی زوہاب بھائی نے ہی کہا تھا اسے گھماؤ پھراؤ یہی کیا میں نے مگر اماں وہ مجھ سے رسی چھڑوا کر بھاگ نکلا میں اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ پوری طرح سے میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور پھر۔۔۔ارے یہ زوہاب بھائی کہاں گئے"۔بولتے بولتے اس نے نظریں زوہاب کی طرف دوڑانا چاہیں تو وہ وہاں تھا ہی نہیں شائد اس کی بات شروع ہوتے ہی باہر بھاگ گیا تھا۔"رینو رینو تمہارا میں کیا کروں کب عقل آئے گی تمہیں اگر اتنا ہی من تھا اسے گھمانے کا تو کسی کو ساتھ لے جاتی اکیلے ہی اکیلے بکرے کی ماں بننے کی کیا ضرورت تھی"۔

حمیرا شدید زچ ہوتیں اپنا سر پیٹ گئیں۔

"توبہ توبہ استغفراللہ یہ اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں بکرے کی ماں"۔

اس نے بڑبڑاتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اماں مجھے کیا پتا تھا کہ وہ بھاگ جائے گا مگر نہیں آپ سب کا صرف مجھ پہ ہی بس چلتا ہے ہر وقت ڈانٹتے ہی رہا کریں مجھے"۔وہ روہانسی سی ہوتی دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں چڑھنے لگی اور سیڑھیوں کی سائیڈ پر لائن سے لگے پلاسٹک کے گملوں میں سے دو اس کا پاؤں لگنے سے لڑھکتے ہوئے نیچے آ گرے تھے۔(اف پوری تباہی تھی یہ لڑکی)۔"بس بھی کر دیا کرو حمیرا بچی ہے ہو جاتی ہیں غلطیاں جان بوجھ کر تھوڑی نہ کیا ہے اس نے مل جائے گا بکرا فکر نہ کرو"۔دادا حضور بولے تو حمیرا چپ کر گئیں چپ تو خیر وہ پہلے ہی کر چکی تھیں۔دوسری طرف جب وہ کمرے میں آئی تو دروازہ بند کر کے "یاہو" کا نعرہ لگاتی بیڈ پر چڑھ گئی اور اچھلنے لگی بالکل کسی بندر کی طرح۔"گیا بکرا اڑے گیا بکرا"۔وہ لہرا لہرا کر بولنے لگی مگر اچانک سے ایک جانی پہچانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔"میں میں"۔۔اچھلتی ہوئی وہ دھرم سے بیڈ پہ گری۔

"ایں ہیں اں اں یہ پھر سے آ گیا"۔

"رینو رینو۔۔۔؟"۔ایک زوردار آواز اسے پڑی تو وہ کرنٹ کھا کر اچھلی۔یہ زوہاب کی آواز تھی۔"اللہ جی کہیں بکرے نے میری شکایت تو نہیں لگا دی"۔

"رینو نیچے آؤ"۔آواز ایک بار پھر پڑی تو اپنی بیوقوفانہ سوچ کو جھٹکتی وہ جلدی میں الٹی چپل پہنتی نیچے آئی۔"جی زوہاب بھائی"۔

آتے ہی وہ انجان بنی پوچھنے لگی۔

"بکرا مل گیا ہے رینو"۔زوہاب نے دروازے کے پار بکرے کی طرف اشارہ کیا تو رینو"ہائے اللہ جی" کہتی مصنوعی خوشی سے چلا اٹھی۔کوئی اگر جان لیتا کہ یہ صرف ڈرامہ ہے تو مر ہی نہ جاتا اس اداکاری پہ۔"کہاں سے ملا یہ آپ کو۔۔۔؟"۔من میں اٹکا سوال۔"مجھے نہیں بلکہ بلو کو ملا ہے باہر ہی تھا یہ۔جب میں نکلا تو یہ بکرے کے ساتھ آتا دکھائی دیا تم مزید شرمندہ ہوتی رہو تو سوچا تمہیں فوراً بتا دوں"۔"تم تو مر ہی جاؤ بلو کے بچے۔رینو نے دانت کچکچائے۔"تمہیں خوشی ہوئی ناں اسے دیکھ کر۔۔؟"زوہاب اب کہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔"ہاں ہاں کیوں نہیں بہت خوشی ہوئی میں مل کر آتی ہوں"۔یہ کہتی ہوئی وہ دروازے سے باہر آئی اور تقریباً کھا جانے والی نظروں سے بلو کو گھورتے ہوئے دیکھا اور ایک ہی جھٹکے سے اس سے رسی لی اور بکرے کو باندھنے چلی گئی۔"آپا رہنے دیں آپ میں باندھ لیتا ہوں یہ نہ ہو کہ آپ کے ہاتھوں بکرا پھر سے فرار ہو جائے بہت چسکے باز لگتا ہے یہ تو مجھے"۔بلو معانی خیز انداز میں بولا مگر اس نے کچھ خاص توجہ ہی نہ دی۔"لو پکڑو مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم ہی باندھو"۔رینو نے رسی اس کے ہاتھ میں تھمائی وہ دکھاوا تو بس گھر والوں کو دکھانے کے لئے تھا ورنہ اس کا کون سا دل مچلا جا رہا تھا بکرے کے لئے۔

✦✦✦

نیند میں ڈھوبی آنکھیں ملتی وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی جب سیڑھیوں کے بالکل ساتھ بنے نمیرہ کے کمرے کے آدھ کھلے دروازے سے اسے اپنے نام کی پکار سنائی دی تو وہ اپنی تجسس فطرت کے باعث بے اختیار وہیں ٹھہر گئی۔"گھر کی بچی ہے دیکھی بھالی ہے تم کیا کہتے ہو"۔نمیرہ زوہاب سے گھر کی بچی کے بارے میں رائے لے رہی تھیں جبکہ گھر کی بچی پر زوہاب کا ماتھا ٹھنکا۔"گھر کی بچی مطلب رینو اماں آپ رینو کی بات کر رہی ہیں"۔

وہ حیران ہوا تھا اتنا جتنا ہو سکتا تھا۔"ہاں تو اور کس کی کر رہی ہوں"۔توبہ ہے اماں کیا ہو گیا ہے آپ کو آپ اس طوفان کو میرے سر پر مسلط کرنے کا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں وہ لڑکی ہر دو منٹ بعد کوئی نہ کوئی الٹا سیدھا کارنامہ سر انجام دے کر گھر بھر کی ملامتیں اکٹھی کرتی ہے اس کم عقل، نکمی لڑکی کو آپ میری بیوی بنانے کا سوچ رہی ہیں۔۔۔نو نیور میں اس پاگل کو اپنی لائف پارٹنر کے طور پر ایکسیپٹ کر ہی نہیں سکتا پوری افلاطون ہے وہ تو اماں مجھے ہر جگہ اپنی انسلٹ نہیں کروانی"۔

زوہاب کے الفاظ تھے یا کچھ اور مگر رینو کو لگا کسی نے گرم کھولتا پانی اس پہ انڈیل دیا ہو اور وہ گرم پانی ہی تو تھا جو اس کی آنکھ کے کنارے سے ہوتا چہرے پر لکیر چھوڑتا جا رہا تھا۔کیا میں اتنی بے وقعت ہوں کیا میں واقعی پاگل ہوں جو وہ مجھے اپنے لائق نہیں سمجھتے۔۔۔؟۔دل نے شدت سے سوال کیا تھا۔"اب ایسی بھی بات نہیں

کرتی بیٹھتی ہے زوہاب مانا کہ بہت شرارتی ہے نک کرتی ہے مگر اس کی عمر بھی تو نہیں کافی بچپنا ہے اس میں ابھی تو اور ہم کون سا دیکھو انیس سال کی ہے ابھی تو اور ہم کون سا تمہاری آج ہی شادی کر رہے ہیں کچھ وقت گزرنے دو خود ہی سمجھدار ہو جائے گی اور تمہارے دباؤ میں دیکھو کیسے آجاتی ہے ویسے سمجھدار نہ ہوئی تو تمہارے ساتھ رہ کر تو ہو ہی جائے گی۔" وہ اسے منانا چاہ رہی تھیں۔

"اماں مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں اس پہ رعب جھاڑنے کے علاوہ رعب میں آجاتی ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں ہر وقت اسی کام لگا رہوں میں نے کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا اسے سدھارنے کا بیوی لانی ہے کوئی بگڑی ہوئی اسٹوڈنٹ نہیں جسے ٹیچر بن کے ہر وقت سمجھاتا رہوں کھپتا رہوں ڈانٹتا رہوں بلفرض ایسا کر بھی لیتا ہوں تو کوئی فائدہ بھی تو ہو کیونکہ اس پہ تو کوئی اثر ہی نہیں ہوتا وہ تو ہے ہی سدا کی ڈھیٹ بڈی"۔ وہ بیزاریت اور ناپسندیدگی سے بول رہا تھا۔"اتنی ڈھیٹ بھی نہیں ہے جتنا تم کہہ رہے ہو پیار سے سمجھ جاتی ہے بہت تمیز دار بچی ہے"۔

نمیرہ نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"ایگزیکٹلی اماں بچی ہے اور اس نے بچی ہی رہنا ہے برائے مہربانی آپ اس ڈفر کو میرے گلے مت ڈالیں مجھے سلجھی ہوئی، کم بولنے والی، میچور اور گھریلو لڑکی چاہیے نہ کہ اس رینو جیسی ناک میں دم کیے رکھنے والی، بچکانہ حرکتیں کرنے والی پھوہڑ لڑکی"۔ مزید اس سے سنا ہی نہ گیا وہ غصے اور دکھ سے تیز تیز قدم اٹھاتی لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھ گئی اور جاتے ہوئے زور سے ہاتھ مار کے گلدان کو فرش پر پٹخا تھا جو گرنے سے زخمی ہو گیا تھا بلکہ اس کے تو پرخچے اڑ چکے تھے۔"رینو کیا کروں میں تمہارا کہ کبھی تو آنکھیں کھول کے چل لیا کرو گھر کی آدھی چیزیں تو اب تک تم توڑ ہی چکی ہو پھر بھی نا جانے باقیوں پہ تمہیں رحم کیوں نہیں آتا" نمیرہ کے کمرے کی طرف جاتیں نمیرا نے ٹوٹے گلدان اور جاتی ہوئی رینو کو دیکھ کر بے بسی سے کہا کیونکہ وہ کچھ بھی کہہ لیتیں رینو کے نام کے آگے سے طوفان کا لفظ ہٹا نہیں سکتی تھیں لیکن اس بات سے وہ انجان تھیں کہ آج گلدان ٹوٹا نہیں بلکہ توڑا گیا ہے۔

رینو کے کانوں میں اپنی دوستوں کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔"ہائے رینو کتنا ہینڈسم کزن ہے تمہارا لڑکی کتنی خوش قسمت ہو تم میری مانو تو ایسے ہینڈسم بندے کو اپنے قابو میں کر لو یہ نہ ہو کوئی اور لے اڑے اسے ویسے بھی اس جیسے بندے پہ تو ہر دوسری لڑکی فدا ہو جاتی ہو گی"۔

زوہاب اکثر اسے کالج سے پک کرنے آجاتا تھا اور ایسے میں اس کی چڑیل دوستیں اسے دیکھ دیکھ کر ایسی ٹھنڈی آہیں اور اس کے کان بھرتی تھیں کہ رینو جل کر رہ جاتی اور تپ کر کہتی اتنے ہی پسند آگئے ہیں تو تم لوگ ہی رکھ لو دنیا جہاں کے اکڑو اور بددماغ انسان کو میں تو کبھی اپنے پلے باندھنے کا نہ سوچوں مگر سچ تو یہ تھا کہ ان لڑکیوں کی باتوں نے اس کا دل و دماغ کہیں نہ کہیں زوہاب کی طرف موڑ ضرور دیا تھا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں خود کو زوہاب کے ساتھ دیکھنے لگی مگر جب جب وہ اس پر غصہ کرتا رعب جھاڑتا تب تب اس کی یہ امیجینیشن ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتی مگر آج تو زوہاب نے حد ہی کر دی۔ اس نازک سے دل کی لڑکی کے دل کو توڑا نہیں بلکہ خون ہی کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ روتی ہوئی کب بکرے کے پاس آبیٹھی اسے پتا ہی نہ چلا۔

"تمہیں پتا ہے آج انہوں نے میرے بارے میں کیا کہا بلکہ یہ پوچھو کہ کیا کیا نہیں کہا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ مجھ سے اتنے تنگ ہیں مجھ سے اتنی خار کھاتے ہیں"۔ وہ ہوکے بھر بھر کے رو رہی تھی اور کھڑے ہو کر ادھر ادھر تکتا بکرا اس کے پاس بیٹھ گیا اور خاموشی سے اسے سننے لگا۔"انہوں نے کہا میں پاگل ہوں، کیا میں پاگل ہوں۔۔؟"۔

لمحے بھر کے لئے اس نے رک کر بکرے کی طرف دیکھا جس نے نفی میں سر ہلا دیا یوں جیسے سر سے مکھیاں اڑا رہا ہو مگر رینو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری۔"لیکن انہوں نے مجھے پاگل کہا نہ صرف پاگل ڈفر، کم عقل، نکمی، پھوہڑ، طوفان اور بہت بولنے والی بھی، کیا میں بہت بولتی ہوں۔۔؟"۔

بکرے نے اس بار کوئی جواب نہ دیا مگر رینو کو تسلی ہوئی کہ اس نے ہاں بھی تو نہیں کہا تھا۔"اور یہ بھی کہ میں ان کے لئے بے عزتی کا باعث ہوں"۔ یہ آخری جملہ بولتے ہوئے اس کی آواز کچھ زیادہ ہی بھرا گئی تھی وہ حقیقی معنوں میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔"بہت برے ہیں وہ کیا سمجھتے ہیں خود کو کہ وہ نہیں ملیں گے تو مر جاؤں گی میں ہونہہ رینو کسی کے لئے نہیں مرتی بڑے آئے مجھے ریجیکٹ کرنے والے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ان کی ریجیکشن سے میری بلا سے جس سے مرضی شادی کریں سنا تم نے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔ وہ بکرے کے کان کے قریب ہو کر چلائی تھی گویا زبردستی اس کے کانوں میں اپنے الفاظ انڈیلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ بکرے نے ایک دم سر گھما کر اپنی بڑی بڑی کنچے جیسی بھوری آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے سامنے اٹھا ہوا سر جھکا گیا گویا اقرار کیا تھا کہ وہ سن رہا ہے سب سن رہا ہے۔ رینو کو تسلی ہوئی۔"رینو کوئی گری پڑی نہیں ہے میری بھی کوئی عزت ہے بلکہ بہت عزت ہے اب میں انہیں بتاؤں گی کہ رینو اصل میں ہے کیسی ہونہہ بڑے آئے نواب کے بچے۔

اس نے ناک سے مکھی اڑائی سو سو کرتے ہوئے آنسو صاف کیے اور اٹھ کھڑی ہوئی جانے سے پہلے ایک نظر بکرے کی طرف دیکھا جو ابھی تک سر جھکائے ہوئے تھا شاید رینو سے ڈرتا تھا یا واقعی اس کی عزت کرتا تھا مگر رینو کو اس پل وہ بہت اچھا لگا تھا۔ وہ ممنونیت بھری نظروں سے اسے دیکھے گئی۔ کبھی کبھی دل کا غم ہلکا کرنے کے لئے بے جان چیزوں تک کا سہارا لینا پڑتا ہے جو ہمیں چپ کر کے سنیں یہ تو پھر بھی جاندار تھا اس کی زبان نہ سمجھ سکتا تھا نہ ہی بول سکتا تھا تو پھر کیا ہوا اسے خاموشی سے سن تو سکتا تھا ناں۔ رینو کا دل قدرے ہلکا ہوا تھا۔ وہ پیار سے بکرے کے دونوں کان کھینچتی"اتنے برے بھی نہیں ہو تم" کہتی ہوئی واپس اندر چل پڑی۔ اندر قدم رکھا ہی تھا کہ کمرے سے نکلتا زوہاب دکھائی دیا۔ ایک زخمی نگاہ اس پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گئی زوہاب بھی اس کی طرف دیکھ چکا تھا۔ رینو کی سرخ جلتی آنکھوں کو دیکھ کر اسے بے چینی سی ہوئی تھی مگر چپ ہی رہا۔ رات میں جب ڈنر لگا تو نمیرا خوشی خوشی سب کو بتا رہی تھیں کہ آج کھانے میں رینو نے اس کی کتنی مدد کروائی ہے۔

"ارے واہ یہ سورج آج کہاں سے نکل آیا بھئی مجھے تو رینو سے گھر کے کاموں کی بلکل توقع نہیں تھی"۔

زوہاب نے ہلکے پھلکے شرارتی لہجے میں مصنوعی حیرت ظاہر کی تو سب ہنس پڑے جبکہ رینو کا دل اندر تک چھلنی ہو گیا۔"امید تو مجھے بھی آپ سے نہیں تھی کہ آپ مجھے اتنا نالائق اور

پھوہڑ سمجھتے ہیں"۔ اس کو کھانا سرد کرتے ہوئے رینو نے ہولے مگر کاٹ دار لہجے میں طنز کیا جس پر زوہاب نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں صبح والا زخمی پن تھا جبکہ رینو نے نظریں تک ملانے کی زحمت نہ کی اور باقیوں کو روٹیاں دینے لگی۔ آج سے پہلے وہ صرف مزے سے بیٹھ کر کھاتی تھی مگر آج نہ صرف کھانا بنانے میں سرتوڑ مدد کی بلکہ سب کو سرو بھی کر رہی تھی۔ زوہاب وقفے وقفے بعد خاموشی سے سر جھکائے تیز سے کھاتی رینو کو دیکھتا رہا جو آج معمول کے برعکس کھاتے ہوئے بلکل نہیں بول رہی تھی اور ٹھیک سے کھا بھی نہیں رہی تھی مگر کسی کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا سوائے زوہاب کے اور پھر روز کا یہی معمول بن گیا رینو کو کالج سے چھٹیاں تھیں مگر اپنی دیر تک سونے کی عادت کے برعکس وہ صبح صبح ہی اٹھ جاتی تھی اور حمیرا کے ساتھ مل کر ان کا ہاتھ بٹاتی کام سمیٹتی، کام والی کے سر پر کھڑے ہو کر صفائی کرواتی۔ گھر بھر اسے یوں دیکھ کر بہت خوش تھا مگر کسی نے وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی سوائے زوہاب کے جو جانتا تھا کہ وہ خود بخود سدھر جائے وہ بھی یوں اچانک یہ ہو نہیں سکتا ضرور کوئی وجہ ہے اس کے پیچھے اور وہ وجہ وہ جانتا تھا۔

✤✤✤

"رینو تم اتنا کیسے بدل گئی یوں اچانک۔ نہ پہلے کی طرح شور مچاتی ہو چپ چپ رہتی ہو، نہ کوئی شرارت کرتی ہو، نہ کوئی توڑ پھوڑ؟"۔ آخری لفظوں پہ وہ ہلکے سے ہنسا تھا۔

توڑ پھوڑ کرنے کے لئے آپ کے الفاظ جو کافی ہیں مسٹر زوہاب اتنا کچھ کہہ دیا میری ذات کے بارے میں ابھی بھی حیرت زدہ ہیں کہ میں یوں اچانک بدلی کیسے۔ وہ صرف سوچ کر رہ گئی بولی تو صرف اتنا کہ "جب مان ٹوٹتا ہے تو چیزیں اور انسان یوں ہی پلٹا کھا جاتے ہیں" اور اتنا بول کر وہ رکی نہیں بلکہ باہر بکرے کے پاس چلی آئی جبکہ اپنے پیچھے زوہاب کو اپنی بات کی گہرائی میں غوطہ کھانے کے لئے چھوڑ آئی۔ زوہاب نے سختی سے آنکھیں میچیں رینو کی بات اندر کہیں بہت اندر زور سے لگی تھی اسے وہ یہ بھی نوٹ کر رہا تھا کہ وہ آج کل اس بکرے کے پاس کچھ زیادہ ہی رہنے لگی ہے جسے وہ کتنا ناپسند کرتی تھی یعنی وہ سب دکھاوا نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعی میں بدل گئی تھی۔

"میں نے کبھی ان کے بارے میں اس نظریے سے نہیں سوچا شیرو"۔ بے اختیار اس کے منہ سے شیرو پھسلا اور ہاتھ اس کی پیٹھ پر ٹھہر سا گیا۔ "مگر میرے دل نے سوچا تھا کہیں دور اندر میرا دل ان کے لئے دھڑکتا تھا مگر انہوں نے اس دھڑکن کو اپنے لفظوں کے دباؤ سے مسل کر رکھ دیا گلا ہی گھونٹ دیا میرے جذبات کا۔ میں بچی نہیں ہوں شیرو میں کم عقل بھی نہیں ہوں میں سب سمجھتی ہوں بس لاپرواہ ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس قدر سخت لفظوں میں میری ذات کی پہچان کروائیں"۔ اس کی آواز بھرا گئی بلکہ لڑکھڑا گئی ٹوٹ گئی آنکھ سے آنسو ٹوٹا اور بکرے کی پیٹھ پر جا گرا۔ بکرے نے میں میں کرتے ہوئے سر اٹھا کر اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو رو مت پلیز۔

"اتنا کچھ کہہ دیا انہوں نے میرے بارے میں مگر پھر بھی میرے دل کی مسند پہ بیٹھا وہ شخص اترتا کیوں نہیں ہے مجھے ان کی باتوں کا دکھ ہے بہت غصہ ہے مگر پھر بھی دل ان ہی کے لئے کیوں مچلتا ہے۔ جب یہ سوچ آتی ہے کہ وہ اپنی

زندگی میں کسی اور لڑکی کو شامل کریں گے تو دل ڈوب سا جاتا ہے"۔

وہ بکرے کے قدموں میں بیٹھی تو بکرے نے اس کے کندھے سے سر جوڑ دیا اور اس کا ہمدرد بن گیا۔ "دیکھو تو میری سیلف ریسپیکٹ ابھی بھی دل کہتا ہے کہ اس کے ساتھ پہلے سی ہو جاؤ اس سے باتیں کیا کرو مگر نہیں انہوں نے میرا دل توڑا ہے اب بھلے کچھ بھی ہو میں ان سے کبھی بات نہیں کروں گی انہیں میں پسند نہیں ہوں بری ہوں نکمی پاگل ان کی بے عزتی کا باعث بنتی ہوں ناں تو پھر یوں ہی سہی"۔ وہ بے رحمی سے اپنی آنکھیں ملتی آنسو پونچھتی اٹھی۔ "ایک بات بولوں شیرو۔۔؟"۔ اتنا کچھ تو وہ بول چکی تھی ابھی بھی ایک بات بولنا رہتی تھی۔ شیرو نے سر جھکایا یعنی اجازت دی۔ "یہ باتیں راز ہیں اور راز ہی رہنی چاہئیں تم کسی کو بتاؤ گے تو نہیں ناں، میں جانتی ہوں تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کیونکہ تم میرے دوست ہو شیرو اور بہت اچھے ہو"۔

"یہ آپ کا دوست کب سے بن گیا بھلا۔۔۔؟"۔

بیلو ایک دم سے ٹپکا۔ "تم کب آئے۔۔؟"۔ رینو نے اس کی آنکھوں میں کھوجنا چاہا کہ اس نے کیا سنا۔ "تب ہی جب آپ اسے اپنا دوست کہہ رہی تھیں مگر یہ آپ کا نہیں میرا دوست ہے اور اس کا نام بھی میں نے رکھا تھا تو آپ اسے شیرو کیوں کہتی ہیں"۔ وہ قدرے برا منا گیا تھا۔ رینو کچھ بھی نہ بولی بلکہ چپ چاپ اندر چلی گئی جبکہ بیلو حیران کھڑا رہا کہ آپا نے کوئی بحث کیوں نہیں کی۔ "چلو ہیرو تمہیں سیر کروا کے لاؤں"۔ وہ بکرے کی پیٹھ تھپتھپاتا بولا تو اس نے رخ پھیر لیا یوں جیسے اسے بیلو کا خود سے بے تکلف ہونا پسند نہ آیا ہو۔ شام ہوئی تو زوہاب چہرے پر خوش گواری لئے لاؤنج میں داخل ہوا اور رینو کو آوازیں دینے لگا۔ رینو ہاتھ میں چھری لئے جس سے غالباً وہ سبزی کاٹ رہی تھی کچن سے نمودار ہوئی۔ "جی فرمائیے"۔ وہ خود کو بے انتہا مصروف ظاہر کرتی بولی جبکہ زوہاب اس کی مصروفیت کو خاطر میں لائے بغیر اس کا ہاتھ پکڑے لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھا۔ "کہاں لے جا رہے ہیں آپ مجھے ہاتھ چھوڑیں میرا"۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور [illegible]دوران چھری کی نوک زوہاب کی ہتھیلی پر لگی مگر نہ رینو نے دیکھا نہ زوہاب نے پرواہ کی بلکہ زوہاب کی حیرت تو سوا تھی۔ اگرچہ اس کے ہاتھ پکڑنے سے رینو کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں مگر اس کا زوہاب پہ غصہ ابھی تک قائم تھا۔ "میں تو بس تمہیں تمہارا سرپرائز دکھانا؟"۔۔۔ وہ باقی کی بات ادھوری ہی چھوڑ گیا۔ وہ ابھی تک رینو کے غصے اور جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوانے پہ شاکڈ تھا۔ "رینو بات تو سنو"۔ وہ واپس کچن کی طرف بڑھی بغیر اس کی سرپرائز والی بات پہ توجہ دیے تو زوہاب نے پکارا وہ یکدم پلٹی اس کے قریب آئی اور ایک ایک لفظ چباتی بولی۔ "رانیہ نام ہے میرا سو آئندہ مجھے رینو کہنے کی زحمت مت کیجئے گا ویسے بھی رینو تو پاگل کم عقل نکمی تھی ناں مگر رانیہ نہیں"۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی بہت کچھ جتاتی پلٹ گئی۔ زوہاب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اداسی سے مسکرایا۔

"پاگل تم نہیں بلکہ میں تھا رینو جو تمہیں رانیہ بنانے چلا تھا مگر مجھے کیا پتا تھا کہ تمہیں رانیہ بنا دیکھ سب سے زیادہ تکلیف مجھے ہی ہونے والی ہے"۔

اتنے جوش سے وہ رینو کو لینے آیا تھا مگر اب سارا موڈ غارت ہو چکا تھا۔ ہتھیلی سے ٹپکتیں تھی

خون کی بوندوں کو اس نے اک نظر دیکھا اور پھر نظر انداز کرتا لان کی طرف بڑھ گیا۔

”رانی آپا جلدی باہر آؤ ناں دیکھو بھائی کیا لے کر آئے ہیں“۔ وہ کچن میں آئی چھری کاؤنٹر پر پٹخی اور سنک کا نل کھولے آنکھوں پر پانی ڈالنے لگی جس میں نمی سی اتر آئی تھی زوہاب سے اس طرح بات کرنے کے بعد۔ تائی اماں نے کہا کہ میں تمیز دار بچی ہوں لیکن آج زوہاب کے سامنے میرا تمیز داری والا بھرم بھی ٹوٹ گیا چلو اچھا ہی ہے آج سے میرے ناموں کی لسٹ میں بدتمیز بھی شامل ہوگیا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی جب بلو چلا آیا۔ ”تمہارے بھائی کچھ بھی لائیں میری بلا سے مجھے کچھ بھی نہیں دیکھنا“۔ دل تو بہت مچل رہا تھا مگر وہ لاپرواہی دکھاتی انکار کر گئی مگر بلو بھی اسے زوہاب کی طرح ہاتھ پکڑے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ لاؤنج کا دروازہ پار کر کے جب وہ لان کے اس حصے کی جانب آئی جہاں بکرا بندھا ہوا تھا تو آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بکرے سے قدرے فاصلے پر بلکل ویسی ہی سفید گائے بندھی ہوئی تھی جیسی اس نے مانگی تھی۔ ”چلو میری نہ سہی مگر آپ کی پسند کی گائے تو آ ہی گئی بھائی اور چاچو بتا رہے تھے کہ گائے تو انہوں نے لانی ہی تھی بس آپ سے انہوں نے مذاق کیا تھا“۔

بلو کچھ کچھ اداسی اور کچھ کچھ خوشی سے بولا مگر رینو اس کی سن کہاں رہی تھی۔ وہ گائے جس کے لئے اس نے پورا گھر سر پر اٹھائے رکھا جس کے آنے پر بچوں کی طرح اسی گھاس پر بیٹھ کے روئی آج جب وہ اس کے سامنے تھی تو اسے خوشی کیوں نہیں ہو رہی تھی بلکہ چہرہ کچھ اور بھی اتر گیا تھا۔ بے اختیار اس کی نظریں موٹی تازی خوبصورت سفید گائے سے ہوتی ہوئیں چھوٹے کالے بکرے پر جا ٹھہریں تو اسے اپنے ناخوش ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ وہ بکرا جو کب سے میں میں کر رہا تھا اب یوں ایک دم سے چپ کیوں کر گیا تھا اس کی وجہ بھی اسے سمجھ آ گئی تھی۔ رینو نے دوبارہ گائے کی طرف دیکھا بھی نہ کیونکہ اسے گائے نہیں چاہیے تھی اسے اپنا بکرا چاہیے تھا۔ وہ خاموشی سے چلتی بکرے کے پاس آئی گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر دل ہی دل میں آنسو بہانے لگی۔

بکرا پھر سے بول اٹھا بلکہ خوشی سے جھوم اٹھا اسے بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی دوست نئے دوست بلکل نہیں بنا رہی جبکہ بلو اور دور کھڑا زوہاب یہ منظر دیکھ کر حق دق رہ گیا۔ رینو اپنی من پسند گائے کو اگنور کیے اس بکرے کو گلے لگائے ہوئے تھی جسے اپنی ناپسندیدگی کے باعث دو ہفتے پہلے اس نے چوری چھپے بھگا دیا تھا۔ نا جانے کیوں دور کھڑے زوہاب کے لب ہولے ہولے مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے۔ ”تو تم واقعی میں بدل گئی رینو“۔

✦✦✦

آج عید تھی۔۔۔ وہ عید جس میں پہلے قربانی کے جانور خریدے جاتے تھے پھر ان کی خوب دیکھ بھال اور خاطر تواضع کی جاتی انہیں گھمایا جاتا اور پھر عید کے پہلے دوسرے یا تیسرے دن انہیں اللہ کے نام پر قربان کر دیا جاتا خدا کی رضا اور تقویٰ کی حصول کی خاطر۔ لیکن رینو کے ذہن سے تو یہ نکل ہی گیا تھا کہ اس کے اس پیارے سے دوست کو بھی آج قربان ہو جانا تھا وہ دوست جس کے سینے میں اس کے راز دفن تھے۔ پچھلے اٹھارہ سال تک اس کی کوئی بھی عید ایسی نہیں تھی جس میں اس نے عید سے بڑھ کر خوشیاں نہ منائی ہوں مگر آج وہ اداس تھی بلکہ بے حد اداس۔ بے

دلی سے وہ تیار ہوئی اور سیڑھیاں اترتی نیچے آنے لگی جب سفید کرتے میں ملبوس نکھرے نکھرے زوہاب کی نظر اس پر ٹھہر سی گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح حسین تو بہت لگ رہی تھی مگر شوخ نہیں نہ چوڑیاں پہنیں نہ مہندی لگوائی نہ ہی بال بنائے۔ سادی سی پیازی رنگ کی فراک پہنے جو کہ پیروں کو چھو رہی تھی گلے میں ہم رنگ دوپٹہ لئے اور جوتا تو دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا، وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

نہ اس بار آنکھوں میں کاجل نہ ہونٹوں پہ سرخی ہاں بس گولڈن آویزے پہن رکھے تھے جو اس پہ بہت بھلے لگ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سیڑھیاں اترتی اس کے پاس سے گزر گئی تو حیرت کا ایک اور جھٹکا زوہاب کو لگا۔ اس بار اس نے عید نہیں مانگی تھی عیدی تو دور کی بات اسے دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔ زوہاب کو اس کی ہر دفعہ کی بحث یاد آ گئی۔ ”زوہاب بھائی میری عیدی کہاں ہے جلدی سے نکالیں“۔ نک سک سی تیار ہوئی وہ اس کا راستہ روکے کھڑی ہو جاتی۔ ”ارے کون سی عیدی محترمہ یہ عید قربان ہے کوئی میٹھی عید نہیں“۔ وہ بھی پہلی بار میں عیدی نہیں نکالتا تھا پہلے اسے جی بھر کے تنگ کرتا اور انتظار کرواتا تھا۔

”میٹھی نمکین مجھے کچھ نہیں پتا مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ آج عید ہے سو مجھے عیدی چاہیے تو مطلب چاہیے“۔ وہ بھی ہٹ دھرمی دکھاتی سامنے سے نہ ہٹتی۔ یہ تو طے ہوتا تھا کہ رینو میڈم کم از کم عیدی مانگتے ہوئے زوہاب کے رعب میں نہیں آتی تھی اور اگر وہ تب بھی پیسے نہ نکالتا تو وہ دادا اور تایا ابا سے شکایت لگاتی تھی اور تب اسے عیدی دینی ہی پڑتی تھی اور ایسا ہمیشہ نمکین عید پر ہی ہوتا تھا میٹھی عید پر تو وہ مسکراتا ہوا پہلی بار میں ہی پیسے اس کے ہاتھ میں دے دیتا تھا مگر آج جب نمکین عید پر وہ اس کے عیدی مانگنے کے انتظار میں تھا اور اس کی عیدی بھی الگ کر رکھی تھی تو وہ آئی ہی نہ اور نہ ہی کسی اور سے مانگی بلکہ سیدھا اپنے بکرے کے پاس چلی گئی گائے کو آج بھی اگنور ہی کیا۔ نا جانے کتنے ہی لمحے وہ اسے تکتی رہی حسرت سے محبت سے تکلیف سے۔ ”تم اتنی جلدی مجھے چھوڑ کے مت جاؤ ناں تم گئے تو میں ایک اچھا دوست کھو دوں گی پھر میں کس سے باتیں شیئر کروں گی کون خاموشی سے مجھے سنے گا“۔

”میں سنو گا رینو میں بنوں گا تمہارا دوست اور میں تمہیں چھوڑ کر بھی نہیں جاؤں گا“۔

وہ خاموشی سے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا توقع کے خلاف وہ ایک دم سے بلکل نہ پلٹی بلکہ چپ چاپ اس کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی رہی۔ ”ہم چاہیں تو اسے اس بار قربان نہ کریں مگر اسے ایک نہ ایک دن تو قربان ہونا ہی ہے ناں رینو تو آج ہی سہی بلکہ یہ آج ہی قربان ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ جیسے جیسے تمہارے دل کی وابستگی اس کے ساتھ بڑھتی گئی تو اس سے جدا ہونا اور بھی مشکل ہو جائے گا“۔ وہ ابھی بھی کچھ نہ بولی بلکہ خاموش آنسو بہاتی رہی اس وقت اس کے دوست کے جانے کی بات ہو رہی تھی وہ چاہ کر بھی خود کو رونے سے باز نہ رکھ پائی۔ زوہاب بھی اس کے پاس آ بیٹھا اور دھیرے دھیرے بکرے کی پیٹھ سہلانے لگا اور اسی دوران اس کا ہاتھ رینو کے ہاتھ سے مس ہوا تو وہ جیسے ایک دم ہوش میں آئی اور کرنٹ کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”رینو رکو پلیز آج میری بات سنے بغیر مت جانا۔

زوہاب نے اسے پکارا اس کے لہجے میں ٹھہر جانے کی التجا سی تھی کہ رینو چاہتے ہوئے

بھی قدموں کو آگے نہ بڑھا پائی۔زوہاب نے جیسے مطمئن سی گہری سانس خارج کی اس کے رک جانے پر اور پھر چند قدموں کا فاصلہ طے کرتا اس کے روبرو آ کھڑا ہوا۔بکرے نے ناگواری سے سر جھٹکا یوں جیسے اسے زوہاب کا رینو کے قریب جانا اچھا نہیں لگا تھا وہ بیں بیں کرنے لگا مگر رینو نے اسے پلٹ کر نہ دیکھا۔"ابھی تک ناراض ہو مجھ سے۔۔۔؟" "میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی آپ سے"۔اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔"وہ اس لئے کیونکہ میں نے تمہارے پرپوزل کو ریجیکٹ کرتے ہوئے تمہیں لکی، پاگل، کم عقل اور طوفان جو کہا"۔زوہاب نے چہرے پر آئی مسکراہٹ کو واپس دھکیلتے ہوئے کہا تو رینو کو جھٹکا لگا۔یعنی یہ سب جانتے تھے کہ میری ان سے ناراضگی کی وجہ کیا ہے مگر پھر بھی خاموش رہی مگر جبڑوں پر زور بڑھا تھا۔(ویسے بھی رینو باتوں میں پہلے بھی زوہاب پر ناراضگی کی وجہ جتاتی جو آئی تھی)"اور ہاں شائد ڈھیٹ بڈی، ناک میں دم کیے رکھنے والی بچکانہ اور پھوہڑ بھی"۔وہ اپنے الفاظ کافی سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔"جی نہ صرف اتنا بلکہ آپ نے یہ بھی کہا کہ میں نے اسے سدھارنے کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا اور یہ بھی کہ آپ نے میری وجہ سے ہر جگہ اپنی انسلٹ نہیں کروانی، ٹھیک ہے اگر میں آپ کے لئے ہر جگہ بے عزتی کا ہی باعث ہوں اور اتنی ہی بری ہوں تو مجھ سے مخاطب ہونے کی زحمت بھی مت کیا کریں کوئی ضرورت نہیں آپ کو یاد رکھنے کی کہ ہم ایک دوسرے کے کچھ لگتے بھی ہیں"۔درد پھر سے جاگ اٹھا تھا آنکھیں پھر سے نم ہو رہی تھیں آواز پھر سے بھرا گئی تھی گال پھر سے نم ہوئے تھے۔وہ بھیگے لہجے میں کہتی پیر پٹختی آگے بڑھی مگر زوہاب نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی۔"وہ سب میں نے جان بوجھ کر کہا تھا رینو"۔وہ ایک دم رکی۔اس کے کلائی پکڑنے پر نہیں بلکہ اس کے الفاظ سن کر۔حیرت زدہ سی وہ پلٹی اور بے یقینی سے اس کے الفاظ دوہرائے۔"کیا کہا آپ نے۔۔۔آپ نے وہ سب جان بوجھ کر کہا"۔صدمے کے مارے اس کی آواز ہی اٹک گئی۔زوہاب نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

"آپ کو پتا بھی ہے آپ کے ان لفظوں سے میرے دل پر کیا گزری تھی میری کیا حالت ہوئی تھی مجھے اپنا آپ کس قدر بیکار لگا تھا مگر نہیں آپ کو کیوں پتا ہوگا آپ کو ذرا بھی احساس ہوتا تو آپ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتے"۔وہ درد سے چلائی۔"ایم سوری رینو پر میں۔۔۔کیا سوری ہاں کیا سوری۔۔آپ کے ایک سوری کہہ دینے سے میرا ٹوٹا ہوا دل جڑ جائے گا کیا بولیں جو تکلیف مجھے ملی اس کا ازالہ ہو جائے گا کیا گزرے دنوں میں جو رینو کہیں کھو گئی ہے وہ لوٹ آئے گی۔۔؟ بولیں جواب دیں"۔رینو نے اسے ٹوکا اور پھر خود ہی بولنے کا کہنے لگی۔زوہاب کا دل کٹ سا گیا رینو کو اس نے اس سے پہلے اس طرح روتے اور تکلیف سے چلاتے شدت سے جواب مانگتے نہیں دیکھا تھا رینو کا یہ انداز اس کے لئے مکمل طور پر نیا تھا۔"میں غلط تھا رینو میں بہت غلط تھا کہ مجھے لائف پارٹنر کے طور پر ایک سلجھی ہوئی، کم بولنے والی میچور اور گھریلو لڑکی چاہیے مجھے وہ نہیں چاہیے رینو مجھے تو تم چاہیے ہو صرف تم"۔زوہاب شدت جذبات سے بولا تو روتی ہوئی رینو کے آنسوؤں کو فوراً بریک لگی وہ ٹکٹکی باندھے اسے

تکے گئی۔یہ وہ کیا کہہ رہا تھا اسے رینو چاہیے تھی۔

"مگر میں نے اپنی ہی وجہ سے رینو کو کھو دیا۔جس وقت میں اماں سے بات کر رہا تھا میں نہیں یقیناً ہاں ہی بولتا مگر پھر آئینے سے تم مجھے دروازے کے پار کھڑی نظر آئی تو میں نے کچھ سوچتے ہوئے وہ الفاظ بولنے شروع کر دیے جن کے بارے میں مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا کچھ زیادہ ہی بھاری الفاظ۔۔۔میں نے یہ ضرور چاہا تھا کہ تم خود کو بدلو مگر تم نے جس طرح خود کو بدلہ مجھے پل پل یہی لگا کہ تم مجھ سے بدلہ لے رہی ہو۔۔۔میں تمہارا یہ بدلاؤ دیکھوں گا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا تمہارے بدل جانے کے بعد مجھے شدت سے احساس ہوا کہ مجھے تو ہمیشہ سے بس رینو ہی چاہیے تھی رانیہ تو کبھی چاہیے ہی نہیں تھی مجھے محبت تو صرف رینو سے ہی تھی رانیہ سے تو کبھی تھی ہی نہیں"۔زوہاب کے آخری جملے پر اس چھوٹی لڑکی نے جو بامشکل اس کے کندھوں تک آتی تھی اور بھی بے یقینی سے سامنے کھڑے دراز قد والے شاندار مرد کو دیکھا جس نے ابھی ابھی اس سے اپنی محبت کا اقرار اتنے واضح لفظوں میں کیا تھا۔وہ غصہ وہ ناراضگی وہ دکھ تو کہیں بہت پیچھے رہ گیا بلکہ بہہ گیا اور اس کی جگہ خوشگوار حیرت نے لے لی۔دل زور سے دھڑکا سانسیں رکنے لگیں وہ بڑی آنکھیں کھولے اسے دیکھے گئی۔

"میں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں اس لئے تم مجھے جو بھی سزا دو مجھے منظور ہے بس یہ ایک کام کر دو۔"

[illegible] التجائیہ لہجہ۔"مجھے میری رینو واپس لوٹا دو ایک بار لوٹا دو وعدہ کرتا ہوں اسے پھر کبھی کھونے نہیں دوں گا"۔یک ٹک اسے دیکھتی رینو کے ہونٹوں پر پہلے تو مسکراہٹ بکھری اور پھر وہ ایک دم سے ہنسنے لگی۔آس پاس جیسے بہاری چھا گئی رنگ برنگے پھول اور ان کی خوشبو بکھر گئی۔ندی کا پانی شور مچاتا اچھل پچھل ہونے لگا جبکہ جھیل کے پانی میں ننھی بطخیں اتری تھیں۔کئی پرندے ایک ساتھ دل کی مسند پر آ بیٹھے تھے۔ستارے جو بادلوں کی اوٹ میں منہ دیے بیٹھے تھے اس پر روشنی کرنے کو ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آسمان پر جا بجا پھیل گئے۔اس کی ہنسی سے کتنے ہی کھوئے لمحے واپس لوٹ آئے تھے۔زوہاب کے تپتے دل پر ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑی تو منوں سکون اندر تک اتر گیا۔"تھینک یو رینو تھینک یو سو مچ مجھے معاف کرنے کے لئے مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہیں کتنا ہرٹ۔۔۔۔"ایک منٹ کس نے کہا آپ سے کہ میں نے آپ کو معاف کر دیا"۔وہ اس کی بات رد کرتی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مصنوعی خفگی سے بولی جبکہ دل پہ پڑا کوئی بہت ہی بڑا بوجھ اترا تھا جس میں اب شرارت آسمائی تھی۔"کیا مطلب تم نے مجھے معاف نہیں کیا"۔زوہاب کا کھلا ہوا چہرہ پھر سے اتر گیا۔"جتنا آپ نے میرا دل جلایا ہے ناں اس کی تلافی تو بنتی ہی ہے"۔"اور یہ تلافی کس صورت ہوگی بتانا پسند کریں گیں آپ۔۔؟"زوہاب بھی اسی کے انداز میں سینے پر ہاتھ باندھے بولا۔

"پہلی بات تو آپ کو مجھے تین دن مسلسل ناشتہ بنا کر دینا پڑے گا اور ناشتہ بھی میری مرضی کا اور۔۔۔ایک منٹ ایک منٹ تم مجھ سے ناشتہ بنانے کا کہہ رہی ہو"۔زوہاب حیرت سے چلا اٹھا جبکہ اس کے برعکس رینو تحمل اور مزے سے بولی۔"جی بلکل اب جتنا میں کچن میں پتی رہی روز اٹھ اٹھ کے کچھ دن آپ بھی تو مزہ چکھیں اور ہاں دوسری بات آپ کو آج نہ

صرف مجھے مہندی لگوانے لے جانا پڑے گا بلکہ کل اور پرسوں کے دو جوڑے بھی لے کر دینے پڑیں گے"۔

ایک اور فرمائش۔۔نہیں بلکہ سزا۔

"یہ جوڑے میرے خیال سے تم لے چکی ہو"۔زوہاب کڑی نظروں سے اسے گھورتا بولا۔"جی مگر مجھے تو آپ کے لئے جوڑے پہننے ہیں ناں"۔وہ جان بوجھ کر لاڈ دکھاتی بولی۔(شیطان کہیں کی) زوہاب نے دل ہی دل میں اس کے اس انداز کی بلائیں لے ڈالیں مگر بظاہر چہرے پر تاثرات سخت ہی رکھے اب ظاہر ہے وہ تو ہرگز نہیں بدلا تھا۔"چوڑیاں جوتے جیولری الگ او کے اور ہاں تیسری بات ت ت۔۔۔اب کیا رہتا ہے"۔وہ جھنجھلایا۔"میری عیدی کہاں ہے نکالیں۔۔۔؟"۔

تو میرا انتظار ختم ہو ہی گیا۔من ہی من میں بولتا وہ بہت خوش ہوا۔وہ ایک ہاتھ اس کے سامنے کیے کھڑی تھی۔اس نے دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے اپنے کرتے کی جیب سے ایک مخملی سرخ ڈبیہ نکالی اور اسے کھول کے اس میں سے گولڈ کی ایک خوبصورت انگوٹھی نکالی۔"واؤ انس سو بیوٹیفل"۔۔بے اختیار رینو کے منہ سے پھسلا تھا۔زوہاب کو خوشی ہوئی اس نے شکر کیا کہ اسے انگوٹھی پسند آئی۔وہ نازک مخملی انگلیاں بھی اس کے سامنے ہی تھیں۔رینو انتظار میں کھڑی تھی۔زوہاب انگوٹھی اس کے ہاتھ کی تیسری انگلی تک لے جانے کے بعد کچھ پل رکا اور پھر شرارتی مسکراہٹ دباتا ڈبی میں قید کرتا واپس جیب میں ڈال گیا۔"یہ کیا پہنائی کیوں نہیں میرے لئے ہی تھی ناں"۔

رینو کے دل کو دھچکا لگا کہ اس نے یہ کیا کیا۔"ہاں تمہارے لئے ہی تھی اور میں پہناؤں گا بھی لیکن پرسوں اور وہ بھی سب کے سامنے"۔مدھم مسکان ابھی بھی ہونٹوں پر تھی۔رینو کو کچھ کچھ سمجھ آنے لگی اور اپنی سمجھ کو صحیح غلط ثابت کرنے کے لئے اس نے پوچھ بھی ڈالا۔"کیوں پرسوں کیا ہے"۔"پرسوں ہماری منگنی ہے رینو"۔رینو کو اندازہ تو ہو ہی گیا تھا مگر پھر بھی اس کے منہ سے سن کر عجیب شوخ رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے مگر پھر ایک دم غائب ہوئے۔"آپ سب نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔۔۔پرسوں میری منگنی ہے اور مجھے ہی نہیں پتا۔"

"ارے ارے زیادہ سینٹی مت ہو یار یہ منگنی کل رات ہی طے پائی ہے عید کے پہلے دو دن تو مصروف ہی گزریں گے سو تیسرا دن رکھ لیا آج بات کریں گے تم سے چاچو اور چچی اور ہاں میں نے تو اسی دن تمہارے جانے کے بعد اماں کو ہاں کہہ دی تھی اور سمجھا بھی دیا"۔"ہائے رینو کتنا ہینڈسم کزن ہے تمہارا لڑکی کتنی خوش قسمت ہو تم میری مانو تو ایسے ہینڈسم بندے کو اپنے قابو میں کر لو یہ نہ ہو کوئی اور لی اڑے اسے ویسے بھی اس جیسے بندے پہ تو ہر دوسری لڑکی فدا ہو جاتی ہو گی۔رینو کو اپنی سہیلیوں کی باتیں یاد آگئیں۔خوش قسمت تو میں واقعی میں ہوں کہ مجھے کچھ کرنا بھی نہیں پڑا اور خدا نے اس شاندار بندے کو میری قسمت میں لکھ دیا انہیں مجھ سے محبت ہے یہ جان کر اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اور انہیں لے اڑے۔کس سوچ میں پڑ گئی محترمہ لگتا ہے تمہیں کوئی عیدی نہیں چاہیے ٹھیک ہے پھر چلتا ہوں میں"۔

وہ اسے سوچوں سے نکالنے کو اونچا بولا۔نہیں نہیں ایسے کیسے مجھے میری عیدی تو دیتے جائیں"۔وہ اس کے پیچھے بھاگی اور تب

ہی شور اٹھا۔"بھائی بھائی قصائی آ گیا ابا کہہ رہے ہیں کہ بکرا کھولیں"۔بھاگتی ہوئی رینو کو ایک دم ٹھوکر لگی اور وہ گھاس پر جا گری۔زوہاب بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔"تمہیں چوٹ تو نہیں لگی رینو آر یو اوکے"۔مگر وہ کچھ نہ بولی۔زوہاب نے دیکھا وہ گھٹی گھٹی آواز کے ساتھ رو رہی تھی۔"رینو کیا ہوا بتاؤ تو کہاں چوٹ لگی"۔وہ بے چین ہوا مگر رینو ہنوز خاموش تھی بس پلٹ کر دور بندھے بکرے کو دیکھا اور پھر نظریں ہٹانا بھول گئی۔زوہاب نے گہری سانس خارج کی وہ سمجھ گیا کہ چوٹ تو کہیں نہیں لگی ہاں مگر درد ضرور ہو رہا ہے۔"جاؤ رینو آخری بار مل لو اپنے دوست سے اور ہاں اسے یہ ضرور بتا دینا کہ تمہیں ایک ایسا دوست مل گیا ہے جو نہ صرف تمہیں خاموشی سے سنے گا بلکہ تسلی بھی دے گا انفیکٹ تمہیں رونے ہی نہیں دے گا بتا دینا تا کہ وہ تمہاری طرف سے بے فکر ہو جائے اور ہاں اسے یہ احساس بھی دلانا کہ بھلے کوئی بھی آ جائے اس جیسا کوئی نہیں ہوگا"۔زوہاب نے اسے نرمی سے تھامتے ہوئے کھڑا کیا تو وہ سر ہلاتی اپنے پیارے دوست کے پاس آئی اور اس سے گلے لگ کر رونے لگی وہ سب کہنے لگی جو زوہاب نے کہا۔"مگر تمہیں پتا ہے جس طرح تم میرے لئے خاص ہو اس طرح کوئی نہیں ہے میں تمہیں بہت مس کروں گی ہمیشہ مس کروں گی تم بھولائے جانے کے قابل ہو ہی نہیں اور ہاں تم بہت پیارے ہو دوست"۔رینو نے محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پیچھے ہٹ گئی کیونکہ تایا ابا قصائی کو لئے اسی طرف آ رہے تھے۔"ویسے حد ہے آپا جس بکرے کو ناپسندیدگی میں آپ نے چوری چھپے بھگایا اب اسی کی محبت میں پاگل ہو رہی ہیں"۔ببلو ہولے سے بڑبڑایا۔زوہاب بکرے کی رسی کھولے اسے لے جا رہا تھا۔"تمہیں کوئی تکلیف"۔وہ اب پہلے سی رینو بن چکی تھی مگر پھر چونکی۔"لیکن ایک منٹ تم سے کس نے کہا کہ۔۔"۔ببلو نے اس کی بات کو بیچ میں ہی اچک لیا اور بولا۔"ارے آپا جس وقت آپ بکرے کی خوشامد کرتے ہوئے اس کی رسی کھول رہی تھیں اس وقت میں چھپ کر آپ ہی کو دیکھ رہا تھا آپ کے ارادے میں بھانپ چکا تھا سو آپ کا پیچھا کیا اور آپ کے جانے کے بعد بکرے کو جا لیا اور آپ کی ساری کاروائی بھائی کو بھی بتا دی مگر افسوس کہ بھائی نے آپ کو کچھ نہ کہا بلکہ الٹا مجھے بھی چپ رہنے کا کہا جبکہ آپ کو ڈانٹ پڑتا دیکھنے کی بہت خواہش تھی میری مگر بھائی نے۔۔۔"۔

وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر رینو کا ذہن ان ہی لفظوں پہ اٹک گیا کہ زوہاب کو پتا تھا مگر اس نے رینو کو کچھ نہ کہا۔ایک مان بھرا آنسو ٹوٹ کر آنکھ سے گرا۔زوہاب نے اس کا پردہ رکھا تھا ورنہ گھر والے اسے شدید قسم کا ڈانٹتے اسے معلوم تھا۔ایک تشکر بھری نگاہ اس نے بکرا لے جاتے زوہاب اور محبت و اداسی بھری بکرے پر ڈالی اور لاؤنج کی جانب چل پڑی۔اسے قربان ہوتا دیکھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی آج اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا دوست کھوئے گا نہیں بلکہ ہمیشہ اس کے پاس ہی رہے گا زوہاب کی صورت میں مگر پھر بھی وہ اپنے بکرے کو بہت مس کرے گی یہ وہ جانتی تھی۔آج اسے سمجھ آیا تھا کہ قربانی کا مطلب پائے، چانپیں، اور کچے قیمے کے کباب نہیں تھا بلکہ اپنی من پسند محبوب چیز کو قربان کرنا تھا صرف خدا کی رضا کے لئے۔اور آج اس نے اپنے محبوب بکرے کو قربان کرنے سے روکا نہیں تھا۔

✦✦✦

اتفاقیہ طور پر ملنے والے شخص سے اس کا اتنا قریبی تعلق نکل سکتا ہے اسے محسوس ہوا عبدالکریم اور اس کی ملاقات قدرت کی طرف سے طے شدہ تھی اور یہ احساس اس کے لئے خوش آئند تھا۔

✦✦✦

کوئی بہت دیر سے دروازہ کی گھنٹی بجا رہا تھا وہ بھی اتنی تیز آواز میں کہ اے سی میں بے سدھ سوئی حریم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ گھڑی میں ٹائم دیکھا تین بجنے والے تھے یعنی وہ کچھ دیر پہلے ہی سوئی تھی۔ گھنٹی بجنا بند ہوگئی تھی لیکن باہر کون تھا جو اتنی زوردار آواز میں مسلسل گھنٹی بجا کر اس کی نیند خراب کر گیا یہی سوچتی پاؤں میں سلیپر پھنسائے وہ کمرہ کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آئی پہلی نظر سامنے صوفے پر بیٹھی باسمہ پر پڑی جو برقعہ میں ملبوس زار و قطار رو رہی تھی۔ باسمہ کے قریب بیٹھی بی بی جان اسے خاموش کروانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر حریم کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں''

وہ تیزی سے بیٹی کی جانب بڑھی۔

''کیوں اتنا تماشا لگا رکھا ہے؟ کون چھوڑ کر گیا ہے اسے؟''

حریم نے ملازمہ کی جانب دیکھا۔

''میرا خیال ہے یہ اکیلی آئی ہیں''۔

باسمہ کے لئے پانی کا گلاس لئے کھڑی ثمینہ کا ہاتھ لرز گیا جس کے نتیجہ میں گلاس سے تھوڑا سا پانی چھلک کر بی بی جان پر گر گیا۔

''اے بہو سانس تو لو...... بچی کو ذرا دم لینے دو سب پتہ چل جائے گا جلدی کا ہے کی ہے جو اپنا بی پی ہائی کر رہی ہو''۔

''کیا سانس لیتا بی بی جان اس منحوس نے تو میرا جینا حرام کر دیا ہے نکمی لڑکی نہ کام کی نہ کاج کی۔ اتنے ماہ شادی کو ہوگئے ایک شوہر نہ سنبھالا گیا بھلا وہ بھی کوئی عورت ہوئی جو ایک مرد قابو نہ کر سکے''۔

بیٹی کو لتاڑتی حریم کی آواز بلند ہوگئی بی بی جان نے اسے دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔

''یہ بیٹی ہے تمہاری کوئی شریکہ نہیں جو اس طرح کے طعنے دے رہی ہو یہ وہی کرے گی جو تمہاری تربیت ہے۔ تمہارا فرض تھا اپنے گر سکھا کر اسے سسرال روانہ کرتیں تا کہ یہ بھی تمہاری طرح میاں کو کاٹھ کا الو بنا سکتی''۔

حریم کو باتیں سناتی بی بی جان نماز کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں جب باسمہ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''مجھے خاور نے بہت مارا ہے۔''

وہ باہر کھڑے کھڑے رک گئیں دیکھا باسمہ برقعہ اتار رہی تھی۔

''آنٹی نے بھی مارا ہے۔''

بازو سے قمیض ہٹا کر وہ ماں کو اپنا زخمی وجود دکھا رہی تھی۔

میں نے اب ان کے گھر نہیں جانا وہ سب مجھے مارتے ہیں۔

حریم نے دیکھا باسمہ کے منہ پر بھی نشان تھے وہ سمجھ گئی نوفل کے باہر جانے کا سن کر خاور بلیک میلنگ پر اتر آیا تھا۔ غصہ کی شدت میں حریم نے دل میں ایک فیصلہ کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود فون سے نوفل کا نمبر ملاتی لاؤنج سے باہر نکل گئی۔

✦✦✦

''آپ نے باسمہ کے سسرال فون کر کے میرے باہر جانے کا بتایا ہے؟''

روٹی پکاتی مسفرہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پسینہ میں شرابور نوفل کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

''تم دوپہر سے کہاں غائب تھے؟''

ہاٹ پاٹ میں روٹی رکھتی وہ نوفل سے جواب طلب تھی۔

''پہلے میرے سوال کا جواب دیں۔''

دروازہ کی چوکھٹ چھوڑ کر وہ ماں کے پاس آن کھڑا ہوا۔

''کیا ضرورت تھی آپ کو یہ سب کرنے کی۔ پہلے مجھے یہاں سے جانے تو دیتیں آپ نے تو میرے نکلنے سے پہلے ہی سارا کام خراب کر دیا کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟''

مسفرہ گھبرا گئی۔

''کہاں ٹھیک ہے انہوں نے باسمہ کو یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا ہے کہ اگر نوفل باہر گیا تو تم بھی واپس نہ آنا۔ بہت مارا ہے بیچاری کو۔''

''یہ کیا بات ہوئی دھوکہ تو حریم نے کیا اس میں نوفل کا کیا قصور''

مسفرہ کو غصہ آ گیا۔

''میں آپا سے بات کرتی ہوں اپنی لڑائی میں میرے بیٹے کو کیوں استعمال کر رہی ہیں۔ کمال ہے یہ تو نوفل نے آگے بڑھ کر کچن سے نکلتی ماں کو پکڑا۔

''ہر بات میں جذباتی نہ ہو جایا کریں ویسے بھی اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ آنٹی حریم اپنی بیٹی پر کئے جانے والے تشدد کی شکایت تھانہ میں کروا آئی ہیں انہوں نے باسمہ کا میڈیکل بھی کروا لیا ہے۔

''ہیں......''

مسفرہ نے حیرانی سے بیٹے کو دیکھا۔

''حریم خود تھانہ گئی تھی؟''

ان کے خاندان میں تو مرد کا تھانہ جانا معیوب سمجھا جاتا یہاں تو حریم تھانہ پہنچ گئی۔

''صرف آنٹی حریم نہیں باسمہ بھی ان کے ساتھ تھی میرا خیال ہے انہوں نے جو کیا درست کیا خاور جیسے مردوں کو سزا ملنی چاہئے''

یہ کہہ کر نوفل اپنے کمرے میں گیا اور مسفرہ، عبدالرحمان کی جانب دوڑی تا کہ اسے حریم کے اس تازہ کارنامہ سے آگاہ کر سکے۔

✦✦✦

کسی نے زور زور سے دروازہ بجایا۔

آٹا گوندھتی میرا نے جلدی سے نلکا کھول کر اپنے ہاتھ دھوئے اتنی دیر میں دروازہ ایک بار پھر سے بج اٹھا۔

''ارے سانس تو لو کیوں دروازہ توڑ رہے ہو۔''

غصہ میں بڑبڑاتی وہ بڑا صحن عبور کر کے دروازہ تک آئی۔

''کون ہے باہر''

خاور بھی کمرہ سے باہر نکل آیا تھا۔

''کیمرہ نہیں لگا رکھا میں نے جو کنڈی کھولنے سے قبل پتہ چل سکے باہر کون ہے۔''

غصہ میں جواب دیتی میرا نے جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے کھڑی پولیس موبائل دیکھ کر گھبرا گئی۔ ایک سپاہی اس کے دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔

''خاور کہاں ہے؟ باہر بھیجوا سے''

حریم نے دیکھا محلہ کے چند لوگ بھی موبائل کے پاس کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

''وہ گھر نہیں ہے۔''

میرا نے جھوٹ بول کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ اتنی دیر میں خاور خود دروازہ پر آ گیا۔

''میں خاور ہوں کیا بات ہے؟''

اس نے حیرت سے سپاہی کو دیکھا۔

"مجھے کیوں تلاش کر رہے ہو؟"

"یہ تو تھانہ چل کر پتہ چلے گا۔"

"تم چلو میں اپنی موٹر سائیکل پر آتا ہوں۔"

"نہیں تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہے۔"

سپاہی بضد تھا۔ خاور خاموشی سے پولیس موبائل میں جا کر بیٹھ گیا وہ سارے راستہ سوچتا رہا اس نے ایسا کیا کر دیا جو پولیس اس کی تلاش میں گھر کے دروازے تک آن پہنچی۔ تھانہ پہنچتے ہی اس کا یہ معمہ حل ہو گیا جیسے ہی وہ موبائل سے باہر نکلا نظر تھانہ کی دیوار کے ساتھ کھڑی کالی گاڑی پر پڑی جس میں حریم کا ڈرائیور موجود تھا۔ اسے ایک فیصد بھی امید نہ تھی حریم اس مسئلہ کو لے کر تھانہ تک پہنچ جائے گی۔ وہ اپنے دل میں حریم کی اس دیدہ دلیری پر حیران رہ گیا۔ ان کے ہاں تو مرد کے تھانہ جانے کا تصور نہ تھا ایسے وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا حریم گھر کے مسئلہ کو تھانہ تک لے جائے گی۔

+++

عبدالکریم ایک بار پھر سے حریم کی ذہانت کا قائل ہو گیا وہ تو شاید شادی کے فوراً بعد ہی خاور کو اپنے پاس بلا لیتا اگر حریم منع نہ کرتی۔ اس کی دور اندیشی تھی جو وہ خاور اور اس کی ماں کے ارادے بھانپ گئی تھی ورنہ صورت حال قدرے مختلف ہوتی۔ خاور اسے یہاں آ کر بہت پریشان کرتا اس لئے بہتر تھا۔ اسے پاکستان میں ہی کاروبار سیٹ کروا دیا جائے اس سلسلہ میں اس نے رات ہی حریم سے بات کی تھی جس نے تھانہ کے ذریعہ خاور پر دباؤ ڈال کر باسمہ کو اس کے گھر واپس بھیج دیا تھا لیکن کریم خاور کی طرف سے مطمئن نہ تھا اس لئے چاہتا تھا اس سے خود بات کرے جس کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس نے جب بھی خاور کو فون کرنا چاہا اس کا نمبر بند ملا اور اس دوران وہ حادثہ ہو گیا جس نے خاور کے سلسلہ میں عبدالکریم کے دل میں پیدا ہونے والے تمام خدشات درست ثابت کر دیے۔ ساتھ ہی اسے افسوس ہوا جس کے بعد پہلی بار اس نے سوچا حریم کی جلد بازی نے باسمہ کو مشکلات کے ان دیکھے سمندر میں دھکیل دیا ہے۔ جہاں سے اس کا نکلنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

+++

آج صبح سے اس کے فون پر نیٹ بند تھا اپنی مصروفیات میں سوہا نے بھی دھیان نہ دیا رات فرصت ملتے ہی اس نے جیسے ہی نیٹ ان کیا واٹس ایپ میکائیل کے میسجز سے بھرا ہوا تھا اس کے علاوہ کوئی دس مس کالز تھیں جو میکائیل اسے وقتاً فوقتاً کرتا رہا اس کے پاس سوہا کے لئے کوئی خوشخبری تھی جو اس کی ملازمت کے متعلق ہی ہو سکتی تھی یہ ہی سوچ کر سوہا نے فوراً میکائیل کو کال کی دوسری طرف سے فون ریسیو نہیں کیا گیا۔ شاید وہ کہیں مصروف تھا سوہا نے دو بار کال کرنے کے بعد فون بند کر دیا اب اسے انتظار تھا میکائیل کی کال کا کب وہ اس سے رابطہ کرے اور سوہا جان سکے وہ کون سی خوشخبری ہے جس کے لئے میکائیل صبح سے اسے درجنوں کالز کر چکا تھا۔ اس دن وہ دیر تک میکائیل کے فون کا انتظار کرتی رہی لیکن اس نے سوہا کو کال بیک نہ کی شاید وہ کہیں بہت زیادہ مصروف ہو گیا تھا یہی سوچ کر سوہا اس سے اگلے دن بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہوئی اپنے بستر پر جا لیٹی۔

+++

"یہ کیا ہے؟"

کمرے میں قدم رکھتے ہی خاور نے بستر پر بکھرا سامان دیکھا تو باسمہ سے پوچھ بیٹھا۔

"ممی نے بھیجا ہے یہ دیکھو میرے لیے کتنے اچھے کپڑے ہیں۔"

وہ بیڈ پر رکھے ایک ایک سوٹ کو اٹھا کر خود سے لگا کر دیکھ رہی تھی اس وقت اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ خاور اسے ہی دیکھ رہا تھا جب میرا کھانے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔

"تمہاری ساس نے صبح ڈرائیور کے ساتھ یہ سامان بھیجا ہے۔"

میرا نے کھانے کی ٹرے خاور کے سامنے رکھ دی جو بیڈ پر بکھرا ہوا سامان ہی دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے سارا سامان بیٹی کا ہی ہے داماد تو اسے یاد ہی نہیں۔"

میرا دیکھ چکی تھی سامان میں باسمہ کے کپڑے، جوتے، کانچ کی چوڑیاں اور کچھ میک اپ کا سامان تھا۔

"بڑی فنکار چیز ہے اس کی ماں۔ شکر کرو تم نے اس دن تھانہ میں نہیں دیکھا کیا تور سے بیٹھی تھی پولیس والوں کی تو اس کے آگے زبان بند تھی سارے کے سارے بھیگی بلی بنے ہوئے تھے جب تک وہ تھانہ میں بیٹھی رہی وہاں فون گھماتی رہی کبھی! ادھر کبھی عبدالکریم کبھی کسی وکیل اور پتہ نہیں کسے کسے۔ جانے کیا توپ چیز ہے۔"

"اے بیٹا کوئی توپ نہیں ہے وہ بس پیسے کا کمال ہے اور یہ پاکستان ہے، تو بس پیسہ پھینک اور تماشا دیکھ والی بات ہے۔"

میرا جلے بھنے انداز میں بولی۔

"ویسے یہ اتنا سامان آیا کیوں ہے؟"

خاور نے دیکھا باسمہ شیشہ کے سامنے کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔

"چھوٹی بیٹی کا نکاح جو کر رہی ہے اس لیے بڑی بیٹی کو سامان بھیجا ہے اس کے خیال میں ہم اس قابل نہیں ہے کہ اس کی بیٹی کا خرچہ اٹھا سکیں۔" میرا نے بات کو نیا رخ دینا چاہا۔

"بھیجا ہے تو بھیجے کونسا ہم پر احسان کیا ہے اپنی بیٹی کو دیا ہے احسان تو ہمارا ہے جو اس کی پاگل بیٹی کو رکھ کر بیٹھے ہیں میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا اس سے جان کیسے چھڑوائی جائے۔"

بات کرتے ہوئے خاور کی نظر باسمہ پر تھی جو آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ وہ ایک دم چڑ گیا۔

"اوئے پاگل ادھر آ یہ برتن اٹھا کر رکھ کر آ کچن میں۔"

باسمہ نے گھبرا کر اسے دیکھا اور جلدی سے شیشے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

"یہ وہ ہڈی ہے اماں جو میرے گلے میں پھنس گئی ہے میں سمجھ گیا ہوں گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا اب انگلی ٹیڑھی کرنا پڑے گی اس حریم کو اسی کی زبان میں جواب دوں گا انشاءاللہ بس کچھ دن صبر کر لے۔"

خاور برتن اٹھاتی باسمہ کو دیکھ کر پرسوچ انداز میں بڑبڑایا میرا سمجھ نہ سکی اس وقت خاور کے دماغ میں کیا منصوبہ بن رہا ہے لیکن خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

+++

ستائش کے نکاح کو آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ عبدالکریم چاہ کر بھی بیٹی کے نکاح میں شریک نہ ہو سکا جس کی وجہ اس کی طبیعت کی خرابی تھی جس کے باعث اسے ڈاکٹر نے سفر کی اجازت نہ دی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا حریم جلد واپس آ جائے وہ گھر کی تنہائی سے تھک گیا تھا اس لئے آج حریم، نوفل کے ساتھ ایمبیسی جا رہی تھی اسے تیار ہوتا دیکھ کر سوہا جس وقت کمرہ میں آئی۔ حریم دراز سے ستائش کا پاسپورٹ نکال رہی تھی کیونکہ اسے

بھی ان دونوں کے ساتھ ہانگ کانگ واپس جانا تھا۔ سوہا ماں کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

''ممی مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے۔''

''کہاں؟'' ''کیسی؟''

حریم نے دراز بند کر کے سوہا کی جانب دیکھا۔

''ہانگ کانگ!'' اب میرا یہاں رہنا غیر ضروری ہے باسمہ اپنے گھر کی ہو گئی سائکش واپس جا رہی ہے جب کہ میرا پہلے بھی وہاں کوئی مسئلہ نہ تھا تو بہتر ہے میں بھی اپنے گھر واپس جاؤں۔''

''فی الحال تو یہی تمہارا گھر ہے۔'' عبایہ پہنتی حریم نے بیٹی کو دیکھا ''تم باسمہ کے مسائل جانتی ہو نا؟ ایسی حالت میں ہم اسے تنہا چھوڑ کر واپس نہیں جا سکتے۔ میں خود مشکل میں پھنس گئی ہوں نہ یہاں رہ سکتی ہوں نہ واپس جا سکتی ہوں۔''

''وہ سب ٹھیک ہے لیکن آپ کو باسمہ کا مسئلہ جلد حل کرنا چاہیے کیونکہ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی اس لیے بہتر ہوگا آپ یہاں رک کر اس کے مسائل حل کریں۔''

سوہا کا لہجہ حتمی تھا۔

''جب باسمہ یہاں رہ رہی ہے تو تمہیں یہاں رہنے میں کیا حرج ہے؟ بلکہ اچھا ہے یہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرو۔ تمہاری یہاں موجودگی میں باسمہ کے لئے میکہ کا دروازہ کھلا رہے گا۔''

حریم کی باتیں سوہا کو حیران کر رہی تھیں۔

''اب اگر ہم سب یہاں سے چلے جاتے ہیں تو خاور اس کا جینا حرام کر دے گا۔''

''پھر زیادہ بہتر یہ ہے آپ اسے بھی اپنے ساتھ واپس لے جائیں۔''

بالآخر حریم چڑ گئی۔

''اس کی شادی ہو گئی ہے اسے اپنے گھر بسنے دو کوئی ماں باپ شادی شدہ بیٹی کا بوجھ نہیں اٹھائے پھرتے اور نہ یہ دنیا کی ریت ہے کہ بیٹی کے ساتھ داماد بھی پالو۔ نوفل تمہارے باپ کا بھتیجا ہے اس لئے مجبوری ہے لیکن یہ طے ہے میں خاور کو وہاں لے جا کر برداشت نہیں کر سکتی۔''

''میں اپنی بات کر رہی ہوں خاور یا باسمہ کی نہیں۔ مجھے واپس جانا ہے میں یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''ابھی تم بھی واپس نہیں جا سکتی ہو۔''

برقعہ پہن کر دبنگ چال چلتی حریم دروازے کی سمت بڑھی جب سوہا اس کے سامنے آ گئی۔

''مجھے میرا پاسپورٹ دیں ممی۔ میں اب مزید یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''میں واپس آ کر تم سے بات کرتی ہوں۔''

اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹاتی حریم باہر نکل گئی۔ غصہ میں بھری سوہا الماری کی جانب بڑھی اس کی دراز کو زور زور سے باہر کی جانب کھینچا مگر بے سود۔ مایوسی کی حالت میں اس نے اپنا فون کارپٹ پر اچھال دیا جب وہ بج اٹھا۔ سوہا نے دیکھا اسے خاور کے نمبر سے کال آ رہی تھی یقیناً باسمہ ہو گی کیونکہ اس کے پاس اپنا ذاتی سیل نہ تھا۔ یہی سوچ کر اس نے یس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!''

دوسری جانب خاور تھا جس کی طرف سے دی جانے والی اطلاع نے سوہا کو لرزا دیا۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

✦✦✦

میکائیل نے دیکھا وہ رو رہی تھی اس کے

رونے کی آواز میکائیل کو بے چین کر گئی وہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اسے کندھوں سے تھام کر اپنی جانب متوجہ کیا وہ جاننا چاہتا تھا وہ کیوں رو رہی ہے مگر شاید اس کی آواز سوہا تک نہیں جا رہی تھی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ میکائیل نے کمرہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی کمرہ سوہا کی وجود سے خالی تھا اس نے شکر کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا لیکن اس کا دل ابھی بھی بے چین تھا۔ اسے لگ رہا تھا سوہا کسی مشکل میں ہے میکائیل نے گھڑی میں وقت دیکھا جب رات کا ایک بج رہا تھا اس نے پاکستانی ٹائم کا حساب لگایا وہاں اس وقت رات کے دس بجے تھے یقیناً سوہا جاگ رہی تھی یہی سوچ کر وہ اسے کال کیے بنا نہ رہ سکا۔ سوہا نے دو بیل کے بعد فون اٹھا لیا جس کی روتی ہوئی آواز سن کر ہی میکائیل کے بدترین خدشہ کی تصدیق ہو گئی باسمہ کی مشکلات میں اضافہ ہو چکا تھا جس نے سوہا کو پریشان کر دیا تھا اسے افسوس ہوا اتنی دور بیٹھ کر وہ کسی معاملہ میں سوہا کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا اپنی خوشی جو وہ کچھ دنوں سے سوہا کے ساتھ سیر کرنا چاہ رہا تھا ایک بار پھر پس پشت چلی گئی۔ مناسب وقت کے انتظار میں اس نے اس خبر کو پھر سے اپنے دل میں چھپا لیا۔

✦✦✦

حریم کے ساتھ بی بی جان، سوہا، نوفل اور مسفرہ بھی تھے خاور کے فون کے بعد جب وہ باسمہ کے سسرال پہنچے وہاں محلہ کے کچھ اور لوگ بھی موجود تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خاور نے قریبی پولیس اسٹیشن سے دو سپاہی بھی بلا رکھے تھے۔ حریم ان سب کو نظر انداز کرتی تیزی سے باسمہ کے کمرے کی جانب بڑھی جس کے دروازہ کے باہر تالا لگا تھا۔

''باسمہ کہاں ہے؟''

بی بی جان نے میرا سے سوال کیا۔

خاور نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا وہ سب تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ جہاں سامنے ہی باسمہ کارپٹ پر نیچے بیٹھی تھی اس کا چہرہ میک اپ سے لال تھا دونوں گال غازہ سے لتھڑے ہوئے، گہرے سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹ، سر کے کھلے بالوں کے ساتھ وہ اپنے حواسوں میں دکھائی نہ دے رہی تھی جبکہ بستر پر موجود سارا سامان ادھ جلا تھا جس میں باسمہ کے کپڑے، جوتوں کے علاوہ خاور کے کچھ کپڑے بھی تھے وہ سب دروازے پر ہی رک گئے کسی میں اندر داخل ہونے کی ہمت نہ تھی۔ باسمہ نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اس لئے وہ تیزی سے اپنے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بھاگ کر بی بی جان کے گلے لگ کر رونے لگی۔

یہ سب میں نے نہیں کیا۔ میں نے آگ نہیں لگائی یہ جھوٹے ہیں اور یہ سب مجھے مارتے بھی ہیں مجھے اب یہاں نہیں رہنا آپ کے ساتھ گھر واپس جانا ہے۔

وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی بی بی جان کا دل پسیج گیا جب کہ سوہا کی آنکھیں بھی پانی سے بھر گئیں۔

شکر کریں یہ بچ گئی ہے ورنہ اس نے کسر کوئی نہ چھوڑی تھی آج پورا گھر جلا کر رکھ کر دیتی۔ شکر ہے جی خاور ٹائم پر آ گیا ورنہ میرے تو یہ قابو ہی نہ آ رہی تھی۔ اللہ معاف کرے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر کوئی جن آ گیا ہو۔ اچھا ہوا جو خاور نے گھر پہنچتے ہی تھانے فون کر کے پولیس بلا لی ورنہ میری بات پر کسی نے یقین نہیں کرنا تھا کچھ ہو جاتا تو کہتے ہماری دمی سسرال والوں

نے جلا کر راکھ کر دی۔

میرا ادھائی دے رہی تھی اور آس پاس موجود تمام لوگ تاسف اور ہمدردی بھری نگاہوں سے خاور کو دیکھ رہے تھے جو سر جھکائے کھڑا تھا۔

"آپ خود دیکھ لیں کیا کوئی ہوش مند شخص ایسی حرکت کر سکتا ہے اور اگر کرلے تو یاد رکھتا ہے۔ بھول نہیں سکتا۔"

خاور کا اشارہ بستر پر لگی آگ کی طرف تھا۔

جب سے شادی ہوئی ہے اس کا پاگل پن ہی بھگت رہا ہوں پھر بھی آپ کی طرف سے الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم اس پر تشدد کرتے تھا۔

"میری بہن پاگل نہیں ہے۔"

سوہا نے خاموش کھڑی اپنی دادی اور ماں کی جانب دیکھا اور دو قدم آگے چل کر خاور کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"یہ بالکل بھی پاگل نہیں ہے آپ لوگ اس پر الزام لگا رہے ہیں یہ اٹھارہ سال ہمارے ساتھ رہی اس نے آج تک ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ جو یہاں آٹھ ماہ میں کر دیں۔"

"میں الزام نہیں لگا رہا سارا محلہ اس بات کا گواہ ہے محلہ کے ان لوگوں نے بھی اسے کمرے میں آگ لگاتے دیکھا ہے۔"

سوہا کی زبان خاموش ہوگئی اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے آس پاس کھڑے محلے کے تمام افراد تصدیق کر رہے تھے کہ باسمہ نے اپنے کمرہ میں خود آگ لگائی ہے۔

❖❖❖

نوفل بہت دنوں بعد ہادی سے ملنے آیا تھا جب وہ دشمن جاں اپنے گھر کے گیٹ سے باہر نکلی۔ گولڈن بال، فل میک اپ شوخ وشنگ کپڑوں میں ملبوس نائمہ کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگ رہی تھی۔ نائمہ کے ساتھ ایک اونچا لمبا مرد بھی تھا جو یقیناً اس کا شوہر تھا جس سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی یہ سب دیکھ کر نوفل کا دل دنیا سے ہی بیزار ہوگیا نائمہ اپنے شوہر کے ساتھ گیٹ کے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئی نوفل جب بھی اسے دیکھتا تھا دل میں اک کسک سی پیدا ہو جاتی تھی اسے کچھ کھو جانے کا احساس ہوتا تھا اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ نائمہ کو اپنی محبت کی شدت سے آگاہ کر سکے جو ناممکن تھا نائمہ آج بھی اس کے پاس سے کس اجنبی کی طرح گزر گئی وہ اس کی گاڑی کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ گلی سے باہر نہ نکل گئی وہ دور جاتی گاڑی کو ہی دیکھ رہا تھا جب ہادی کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تو کب تک جا رہا ہے؟"

بس یار کام شروع ہے کل بھی اسی سلسلے میں ایمبیسی جا رہے تھے کہ اچانک سوہا کا فون آگیا باسمہ نے اپنے کمرہ میں آگ لگا دی تھی بس پھر سارا دن وہیں گزر گیا اب دیکھو کل جائیں گے۔ پھر تیرا بھائی جلدی یہاں سے نکل جائے گا۔

ہادی کو ساری تفصیل بتاتے ہوئے بھی نوفل کا دھیان مسلسل نائمہ کے گھر کی جانب تھا جس کا گیٹ اب مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے کچی عمر کی محبت سانپ سیڑھی ہو جس میں الجھا انسان مشکل سے منزل تک پہنچتا ہے۔

❖❖❖

اس کے چاروں طرف آگ تھی جس کی تپش اسے جھلسا رہی تھی اور دھواں اتنا کہ اس کا دم گھٹنے لگا وہ چلانا چاہتی تھی مگر آواز اس کے حلق سے نہ نکلی اسے محسوس ہوا جیسے اس کا سانس بند ہو جائے گا اور وہ مر جائے گی اسی خوف میں وہ بستر پر اٹھ بیٹھی۔ کمرہ میں مکمل اندھیرا تھا شاید لائٹ

چلی گئی تھی وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی جب کسی نے اسے چھوا اس سے قبل کہ وہ چلاتی آنے والے نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اس لمس کو وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھی جسے محسوس کرتے ہی اس کا من شانت ہو گیا۔

"اچھا ہوا تم آ گئے میں اکیلی ڈر رہی تھی۔"

وہ اسے دیکھتے ہوئے بہت پیار سے بولی

"مجھے پتا تھا تم اندھیرے میں ڈرتی ہو اسی لئے آ گیا۔"

اس کے قریب بیٹھا وہ بہت پیار سے اس کے بال سہلا رہا تھا اس کا لہجہ اور لمس دونوں ہی محبت بھرا ایک ایسا احساس تھے جن میں وہ ڈوبتی چلی گئی۔

❖❖❖

"مجھے پورا یقین ہے خاور اور اس کی ماں جھوٹ بول رہے ہیں۔"

بیڈ پر سوئی باسمہ کو دیکھتے ہوئے وہ عبدالکریم کو ساری تفصیل سنا رہی تھی۔

"اور محلے والے؟"

حریم کا لگایا جانے الا ہر تجزیہ عبدالکریم کو یوں ہی حیران کرتا تھا۔

"وہ اصل بات جانتے ہی نہیں انہیں جو جس طرح دکھایا گیا وہ ویسا ہی بتا رہے ہیں"۔

"میں تمہاری بات سمجھا نہیں"

دراصل میرا نے کمرے میں آگ لگا کر باسمہ کو بند کر دیا اور اسی وقت محلے میں شور مچا کہ لوگ اکٹھے کر لئے ان کے سامنے کمرہ کا دروازہ کھولا گیا تو باسمہ آگ بجھا رہی تھی جسے غلط رنگ دیا گیا۔

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

عبدالکریم حیران تھا۔

"ظاہر ہے باسمہ نے۔ دوسرا میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں جو میرا اور اس کے بیٹے کی چالیں نہ سمجھوں اور تو وہاں جاتے ہی سب کھیل سمجھ گئی تھی۔ پھر بھی میں نے باسمہ کو اپنے ساتھ لے آئی ہوں تا کہ کسی ڈاکٹر کو دکھا سکوں بڑی مشکل سے آج ایک اچھے ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہے۔ خاور بھی میرے ساتھ جائے گا سوچا ہے اسی بہانے باسمہ کا علاج کروا لیا جائے یہ تو میں جانتی ہوں وہ کسی نفسیاتی عارضہ میں مبتلا ہے لیکن ہم ہم اسے پاگل نہیں کہہ سکتے۔ حریم بالکل درست کہہ رہی تھی اس کی ہر بات سے عبدالکریم متفق تھا۔

"تم کچھ رقم میرے اکاؤنٹ میں بھیج دینا اس ڈاکٹر کی فیس بہت زیادہ ہے خاور کو بھی کچھ دے دلا کر اس کا منہ بند کر دوں۔"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا تم اسے کوئی کاروبار......"

"ٹھیک ہے عبدالکریم میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں پہلے ذرا خاور سے بات کرلوں۔"

عبدالکریم کی بات درمیان سے کاٹ کر اس نے فون بند کر دیا پھر خاور کا نمبر ملاتے ہوئے اسے یاد آیا وہ کافی دن پہلے خاور کو اپنے پاس بلاک کر چکی تھی یہی وجہ تھی جو اس نے باسمہ کے حادثے کی اطلاع سوہا کے نمبر پر دی۔ یہ یاد آتے ہی حریم نے خاور کا نمبر ان بلاک کر دیا۔

❖❖❖

سوہا نے نماز پڑھ کر جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ رو رہی تھی آنسو اس کی انگلی پر خود بخود بہتے جا رہے تھے اس کا دل کئی دنوں سے بھرا ہوا تھا جو آج اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہی آنسوؤں کی صورت ہلکا ہو گیا۔ جانے وہ کب تک یوں ہی روتی رہتی اگر اس کا فون نہ بجتا اس

نے دیکھا اسکرین پر میکائیل کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اس نے آج عشاء بہت لیٹ پڑھی تھی۔ اس وقت میکائیل کا فون اسے حیرت ہوئی کیونکہ وہاں آدھی رات گزر چکی تھی سوہا نے خاموشی سے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!''

اس کی آواز رندھی ہوئی تھی جو میلوں دور بیٹھے میکائیل نے فوراً محسوس کر لی۔

''تم رو رہی ہو؟''

''نہیں بس ایسے ہی نماز پڑھتے ہوئے دل بھر آیا۔''

''جھوٹ مت بولو سوہا تم پریشان ہو اور میں نے ابھی ابھی خواب میں تمہیں روتے دیکھا ہے۔''

میکائیل نے رات کے اس لمحہ اپنے فون کرنے کی توجیہہ بھی پیش کر دی سوہا کو حیرت ہوئی وہ جب بھی کسی مسئلے پر پریشان ہوتی میکائیل اسے یوں ہی فون کیا کرتا جانے اس کے دل کا کون سا کنکشن میکائیل کے دماغ سے جڑا تھا۔

''باسمہ کے لئے بہت دعا کرنا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

ساتھ ہی اس نے باسمہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بھی سنا دی۔

''میں کل جمعہ کی نماز میں خصوصی دعا کروں گا۔''

''ارے واہ تم نماز پڑھنے جاتے ہو؟''

سوہا کو یہ سن کر خوشی ہوئی۔

''ہاں یہ سب تمہاری محبت کا نتیجہ ہے۔''

''میری جاب کا کیا بنا؟''

سوہا نے ہمیشہ کی طرح میکائیل کی اس بات کو پھر سے نظر انداز کر دیا جسے میکائیل نے محسوس تو کیا مگر ہمیشہ کی طرح خاموش رہا۔

''تمہاری جاب بھی ہو جائے گی پہلے تم اپنی واپسی کا انتظام کرو۔''

میکائیل نے ابھی تک اسے اپنی اور عبدالکریم کی ملاقات کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا جس کے لئے وہ کسی خاص وقت کا منتظر تھا جو ابھی تک نہ آیا تھا وہ سوہا کو اپنے متعلق کچھ اور خاص بھی بتانا چاہتا تھا مگر نہ بتا سکا پھر کچھ دیر کی گفتگو کے بعد اس نے فون بند کر دیا وہ جانتا تھا اس وقت سوہا کے لئے اصل مسئلہ اپنے پاسپورٹ کا حصول تھا جو باسمہ کے حادثہ کے بعد کافی مشکل ہو گیا تھا سوہا بھی سمجھ چکی تھی ممی اسے ان حالات میں بھی اپنے ساتھ واپس لے کر نہیں جائیں گی۔ جب تک باسمہ پاکستان میں موجود ہے وہ بھی یہاں سے نہیں جا سکتی ایسے میں اسے اپنے لئے جو کچھ کرنا تھا خود ہی کرنا تھا اور یہ تو طے تھا وہ مزید یہاں نہیں رہ سکتی تھی اسے ہر حال میں واپس جانا تھا جس کے لئے اسے فوری طور پر اپنے واپسی کے منصوبہ پر عمل درآمد شروع کرنا تھا اسے ڈر تھا کہیں اس کی ماں اس کا حشر بھی باسمہ جیسا نہ کر دے۔

✦✦✦

جاتی گرمیوں کی دوپہر تھی چار بج گئے تھے صحن میں پھیلی دھوپ پہلے سے نرم ہو گئی تھی مگر فضا میں موجود حبس کے باعث گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لاؤنج کے شیشے کا دروازہ کھول کر سوہا نے باہر جھانکا صحن میں پرندے بیٹھے تھے اس نے آگے بڑھ کر دیکھا پانی کے تمام برتن خالی تھے وہ خاموشی سے کچن میں گئی اور پانی کی بوتل لا کر تمام برتن بھر دیئے اس وقت ہی سارے پرندے اپنی جگہ سے اڑ کر ان برتنوں کے گرد جمع ہو گئے یعنی وہ پیاسے تھے

پرندوں کو دیکھتی سوہا کی نظر گیٹ کے عین سامنے پڑی جہاں گاڑی موجود نہ تھی جس کا مطلب یہ تھا ممی گھر نہیں ہیں جب کہ ستائش بھی اکیڈمی جا چکی تھی اس نے جلدی جلدی تمام پیالوں کو ایک بار پھر پانی سے بھرا اور بی بی جان کے کمرہ میں جھانکا وہ بھی خالی تھا شاید وہ نوفل لوگوں کے فلور پر تھیں۔ موقع ایسا تھا وہ بھاگ کر حریم کے کمرے میں آئی اس کا ارادہ دراز کی چابی تلاش کرنے کا تھا۔ دو دن قبل آنے والے میکائیل کے فون نے اس کے اندر یہ تحریک پیدا کی تھی کہ وہ پاسپورٹ کا اصل مقام معلوم کر سکے تاکہ بوقت ضرورت اسے وہاں سے نکال کر ایمبیسی جایا جا سکے۔ سوہا نے نہایت احتیاط سے پورے کمرے کی تلاشی لی تاکہ اس کی ماں کو شک نہ ہو ورنہ اس نے جو حشر سوہا کا کرنا تھا وہ جانتی تھی نہایت احتیاط سے اس نے الماری میں کپڑوں کے نیچے یہاں وہاں ہاتھ مارا کہیں بھی دراز کی فالتو چابی نہ تھی جس کی مدد سے وہ دروازہ کھول سکتی کرسی گھسیٹ کر اس نے الماری کے قریب کی پھر اس پر کھڑی ہو کر سوہا نے الماری کے اوپر بھی دیکھ لیا وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ اب اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا جیولری باکس بیڈ پر انڈیل دیا شاید ممی نے چابی یہاں رکھی ہو اسی وقت دروازہ کھول کر کوئی کمرے میں داخل ہوا سوہا نے پلٹ کر دیکھا دروازے کے عین وسط میں نوفل کھڑا اسے دیکھ رہا تھا وہ بھول گئی تھی کہ نوفل کے گھر کے کسی بھی فرد کو وہ اپنے پورشن میں آنے سے نہ روک سکتی تھی کیونکہ تالا بیرونی گیٹ کو لگا تھا باقی گھر کھلا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے تم کوئی خاص چیز تلاش کر رہی ہو۔''

سینہ پر دونوں ہاتھ باندھے نوفل نہایت دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''ہاں مجھے اپنے پاسپورٹ کی تلاش ہے۔''

وہ سمجھ گئی تھی جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس لئے اس نے سچائی بتانے کا فیصلہ کیا۔

تمہارا پاسپورٹ اس الماری کی دراز میں ہے۔

نوفل کمرے میں داخل ہو کر الماری کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''میرے لئے یہ دراز کھولنا مشکل نہیں ہے میں کھول دوں گا لیکن یہ بتاؤ تم اسے دوبارہ بند کیسے کرو گی؟''

''تم رہنے دو مجھے ایسے دراز نہیں کھولنا۔ میں بنا چابی کے کوئی رسک نہیں لے سکتی۔''

نوفل نے دیکھا پریشانی اس کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔

چابی کہاں سے لاؤ گی وہ تو آنٹی کے پرس کی اندر والی جیب میں ہے۔''

''پرس میں تو ایک چابی ہو گی باقی دو اسپیئر کہاں ہیں؟''

سوہا پرسوچ انداز میں بولی۔

''وہ مجھے نہیں پتہ لیکن یہ چابی میں نے دیکھی تھی جب انہوں نے ستائش کا پاسپورٹ نکالا تھا اگر تم پرس سے چابی نکال سکو تو مجھے بتا دینا میں فوری طور پر تمہیں ڈپلی کیٹ بنوا کر لا دوں گا جسے تم جب چاہو استعمال کر سکتی ہو۔''

''آئیڈیا برا نہ تھا اس پہلو پر تو سوہا نے غور ہی نہیں کیا تھا۔''

''تم تو کافی ذہین آدمی ہو''

وہ نوفل کو سراہے بنا نہ رہ سکے۔

''میں کوشش کروں گی جلد ہی ممی کے پرس سے چابی نکال لوں۔''

''سوچ لو بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنا

آسان نہیں ہے۔''
نوفل مسکرا رہا تھا۔
اب آسان ہو یا مشکل باندھنی تو پڑے گی۔
سوہا کا لہجہ اٹل تھا۔
''چلو جب چابی مل جائے تو مجھے ٹیکسٹ کر دینا۔
اسے ہدایت دیتا نوفل کمرے میں باہر نکل گیا۔
اتفاق کی بات یہ تھی کہ سوہا اسی رات اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئی جب حریم واک کے لئے گھر کی چھت پر گئی۔ سوہا نے اس کے ہینڈ بیگ میں موجود کی چین سے دراز کی چابی نکال کر نوفل کو بھیج میسج کر دیا۔

✦✦✦

اسے بہت دنوں سے باسمہ کی یاد ستا رہی تھی۔ بقول حریم اس کا کسی سائیکاٹرسٹ سے علاج چل رہا تھا جس کے باعث ان دنوں اس کا گھر آنا مشکل تھا۔ البتہ حریم اس سے ملنے ضرور جاتی اور واپس آ کر اس کی خیریت سے متعلق سب کو آگاہ کر دیا کرتی باسمہ کے پاس اس کا اپنا ذاتی فون بھی نہ تھا۔ اس سے بات کرنے کے لئے خاور کو کال کرنا پڑتی جب کہ خاور کے نمبر پر کال کر کے باسمہ سے بات کرنا سوہا کو کبھی پسند نہ آیا تھا اس لیے اس نے اب بھی خاور کے نمبر پر فون نہیں کیا اسے انتظار تھا جب باسمہ صحت یابی کے بعد خود رابطہ کرے۔ نوفل نے اسے چابی بنوا کر لا دی تھی دراز سے پاسپورٹ نکالنے کے لئے وہ مناسب موقع کے انتظار میں تھی اس نے اپنے داخلے کے لئے مختلف یونیورسٹیز میں اپلائی کر دیا تھا اور وہ چاہ رہی تھی انٹر کا رزلٹ آتے ہی اپنا کام شروع کرے اس سے پہلے میکائیل اگر اس کی جاب کا بندوبست کر دیتا تو بھی اسے یہاں سے نکل جانا تھا جس کے لئے وہ ذہنی طور پر بالکل تیار جب اس کی زندگی میں کالی رات آئی جس نے سوہا کی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا اور اس کی زندگی سے بہت کچھ نکال دیا۔ وہ ایک رات جس نے اس کی زندگی کی کئی صبحیں کالی کر دیں۔

✦✦✦

آج سوہا کا آخری پیپر تھا اس لئے جب وہ گھر آئی تو تھکن سے برا حال تھا لہٰذا ایک گلاس اوولٹین کا پی کر وہ اپنا کمرہ بند کر کے سوگئی۔ اسے کسی نے ڈنر کے لئے بھی نہیں اٹھایا۔ سوہا صبح تک یوں ہی سکون سے سوئی رہتی اگر اس کے کان میں کسی کے رونے کی آواز نہ آتی وہ بہت گہری نیند میں تھی۔ جب اسے احساس ہوا کوئی بری طرح رو رہا ہے وہ ڈر کر اٹھ بیٹھی کمرہ میں نظر دوڑائی کوئی نہ تھا۔ رات کے اس سناٹے میں باہر بھی ہو کا عالم تھا پھر رونے کی آواز کس کی تھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے ایک بار پھر ہلکی سی سسکی کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی حریم کی غصہ بھری آواز اس کے کان سے ٹکرائی وہ کسی پر ناراض ہو رہی تھی۔ سوہا اٹھ بیٹھی یہ آوازیں ٹیرس میں کھلنے والی کھڑکی سے آ رہی تھیں شاید صبح آنٹی ثمینہ ڈسٹنگ کے بعد کھڑکی بند کرنا بھول گئی تھی۔ سوہا نے سامنے لگی گھڑی میں وقت دیکھا رات کا ایک بجا تھا اسے حیرت ہوئی اس وقت ممی کس سے اس لہجے میں بات کر رہی ہیں؟ باہر کون ہے؟ یہی تجسس اسے کھڑکی کے قریب لے آیا جس کا پردہ ہلکا سا سرکا کر اس نے جیسے ہی باہر نظر ڈالی حیران رہ گئی۔ دروازے میں اندر کی جانب برقعے میں ملبوس باسمہ کھڑی رو رہی تھی۔ اس کے بالکل سامنے دونوں ہاتھ سینے پر

باندھے حریم اس طرح کھڑی تھی کہ باسمہ گھر کے اندر داخل نہ ہو سکے۔ سوہا کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہے وہ جلدی سے اٹھی اور دروازہ کی جانب بڑھی جب اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔
''میں تمہیں شروع دن سے ایک بات سمجھا رہی ہوں اب تم خاور اور اس کی ماں کے ساتھ رہنے کی عادت ڈالو شادی کے بعد عورت کا گھر وہی ہوتا ہے جہاں اس کے سر کا سائیں رہتا ہے۔ روز شوہر سے جھگڑ کر آنے والی عورت کی میکہ میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ عورت کی عزت اس کے اپنے گھر میں ہے فی الحال تم وہیں واپس جاؤ جہاں میں تمہیں چھوڑ آئی تھی کیونکہ تمہیں علاج کی ضرورت ہے ویسے بھی اب یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔''
اس کے ساتھ ہی سوہا کے کانوں سے گیٹ بند ہونے کی آواز سے ٹکرائی وہ اپنے کمرہ کا دروازہ کھول کر ننگے پاؤں باہر کی جانب بھاگی جب لاؤنج میں داخل ہوئی تو حریم سے بری طرح ٹکرا گئی۔
''کیا ہوا ہے تمہیں آدھی رات کو منہ اٹھا کر کہاں بھاگی جا رہی ہو۔''
اپنا ماتھا سہلاتے حریم نے سوہا کا بازو پکڑ کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔
''ممی...... وہ باسمہ......''
مارے دکھ الفاظ اس کے حلق میں کہیں پھنس گئے جنہیں وہ چاہ کر بھی باہر نہ نکال سکی۔
''کیا ہوا باسمہ کو؟''
حریم نے حیرت سے پوچھا وہ اتنی مطمئن تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔
وہ ابھی باہر کھڑی رو رہی تھی آپ نے اسے اندر نہیں آنے دیا وہ بہت رو رہی ہے۔ پلیز ممی

دروازہ کھول دیں اسے اندر آنے دیں۔ رات کے اس اندھیرے میں وہ کہیں گم ہو جائے گی اسے یہ اندھیرا نگل جائے گا پلیز ممی۔
ماں کے سامنے ہاتھ جوڑے وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''میرا خیال ہے تم نے کوئی برا خواب دیکھا ہے۔''
حریم حیران پریشان بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔

''رات کے دو بج رہے ہیں اور کیا ڑی سے یہاں اتنا دور ہے کہ اکیلی باسمہ ہمارے گھر نہیں آسکتی اور پھر اہم بات یہ ہے کہ وہ آئے گی بھی کیوں؟؟''

ماں کے اطمینان نے سوہا کو چکرا دیا اسے لگا شاید اس کی ماں درست کہہ رہی ہے یقیناً اس نے کوئی خواب دیکھا ہے لیکن اگر وہ خواب تھا تو رات کے اس پہر ممی کہاں سے آرہی ہیں وہ بھی تنہا اور اپنے سلیپنگ ڈریس میں۔ اس خیال نے اس کے جسم میں توانائی بھر دی۔ اس نے سامنے کھڑی اپنی ماں کو بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹانا چاہا۔

''ایک دفعہ مجھے دیکھ لینے دیں میرا دل کہہ رہا ہے باسمہ باہر ہے پلیز ممی۔''

''لگتا ہے تمہارا دماغ بھی خراب ہو گیا ہے۔''

غصہ سے حریم کے چہرہ کا زاویہ بگڑ گیا۔

''آپ کچھ بھی کہہ لیں لیکن میں ایک بار باہر دیکھوں گی ضرور۔''

ماں کو سامنے سے ہٹاتی وہ گیٹ کی جانب دوڑی۔ آج حریم کو اندازہ ہوا سوہا عادات واطوار کے لحاظ سے اس کے جیسی تھی ضدی اور فیصلہ میں اٹل۔ جسے اس وقت کچھ بھی کہنا رات کے اس پہر تماشہ کھڑا کرنا تھا یہ سوچ کر وہ خاموشی آگے بڑھی اور ہاتھ میں موجود چابی سے گیر لاک کھول دیا۔ سوہا تیزی سے باہر نکلی جہ پوری گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی دور تک سڑک خالی تھی وہ حیران پریشان کھڑی حریم نے اسے بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر کیا

''میں نے کہا تھا نہ کہ تم نے کوئی خو دیکھا ہے مگر تمہیں تو کسی پر اعتبار ہی نہیں۔''
حریم بیزاری سے بولی۔ سوہا شرمند گئی۔

سوری ممی۔

شاید اس نے کوئی خواب ہی دیکھا سوچ کر وہ اپنے کمرہ کی جانب بڑھتے رک گئی۔

''اب اس وقت باہر کیا کر رہی تھیں؟
سوہا کے دل کی خلش اس کی زبان پر

''دل گھبرا رہا تھا صحن میں واک کے تھی کہ تم نے آدھی رات کو تماشا لگا دیا ہے تمہارے اس تماشہ سے'' بڑبڑاتی حر کمرہ کی جانب بڑھی جبکہ سوہا نے سوتے جاگتے اس فکر میں گزار دی اس دیکھا تھا وہ سچ تھا یا سپنا اس نے دل میں کر لیا۔ صبح ہوتے ہی خاور کے نمبر کے باسمہ سے ضرور بات کرے گی۔

☆☆☆

سفید ململ کے دوپٹے کے ہالے میں بکھرا اس کا سانولا چہرہ غضب ڈھا رہا تھا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ بڑی معصوم لگ رہی تھی۔ کوئی اور مرد ہوتا تو شاید ثناء کو دنیا کی میلی نگاہوں سے بچا کر اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپا لیتا۔ لیکن خدا نے تو اس کی قسمت کا سودا ایک ایسے شخص سے کر دیا تھا جو تھوڑے فاصلے پر چارپائی پہ بیٹھا تمام فکروں سے آزاد۔ کمانے سے ناآشنا، بھوکوں کی طرح کھانے میں مشغول تھا۔ بائیں پہلو ثناء کی چار سالہ بچی مائرہ نظریں نیچی کئے ماں کی لمبی دعا ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اتنی سہمی ہوئی تھی جیسے کوئی ہرنی کا بچہ شکاری کے خوف سے اپنے ماں کی آغوش میں پناہ لینے کو تڑپ رہا ہوں۔ معصوم ذہن دور بیٹھے نوالے توڑتے حاذق کی خون خوار نگاہوں سے بہت کچھ اخذ کر کے مزید سہم گئے۔

ثناء کے کانپتے لبوں پر اپنی بچی کے بہتر مستقبل کی دعائیں تھی دوڑ تو ایسے نکھٹو شخص کے ساتھ بندھی ہوئی تھی پھر بھی صابر و شاکر ثناء نے اف تک نہ کی۔ اپنے معبود سے کبھی شکایت نہ کی۔ لیکن اپنی بیٹی کے لئے اچھے مستقبل کی دعائیں اس کا معمول تھیں۔ وہ شعور کی وادیوں میں قدم رکھنے لگی۔ باپ کی طرف سے اُسے سرد مہری ہی ملی۔ لیکن بے تحاشا دانش مند ثناء نے اسے بے پایاں محبت کا سایہ فراہم کئے رکھا۔ رات کو سوتے سمے ہمیشہ سے وہ ایک بازو مائرہ کے منے سے سر کے نیچے رکھ کر اُسی ہاتھ سے اس کے نرم ریشمی بال سہلاتی اور ساتھ ساتھ میٹھی سی لوری اس کے کانوں میں اس گھولتی رہتی۔ ایسے میں مائرہ کو دنیا جہاں کا پیار میسر آ جاتا۔ کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہوتا۔ باپ کے پیار کی ضرورت تک محسوس نہ ہو پاتی۔ مگر وہ سامنے دیوار میں پیدا شدہ چھوٹے سوراخ کو تکتی رہتی اسی طرح وہ جاننے کی کوشش کرتی کہ ماں لوری میں جس وادی کی کہانی سناتی ہے۔ وہ یقیناً اس سوراخ کے اندر سے گزر کر جانے کے بعد ملے گی۔ اس وادی کو دیکھ لینے کی کوشش۔ تجسس اس کے معصوم ذہن کا مسئلہ بن گیا۔ اس چھوٹے سے سوراخ کی بدولت لوری کے الفاظ اور بھی میٹھے لگتے۔ جونہی ثناء لوری شروع کرتی۔ مائرہ کا تصور سوراخ کے اندر قدم بڑھا دیتا اور وہ ایک سرسبز شاداب، حسین وادی میں جا نکلتی۔ جہاں صرف پیار ہی پیار اور ہر سو امن اور سکون کا راج ہوتا۔ آگے کی طرف ہر بڑھتا ہوا لمحہ اُسے گزرتے ہوئے لمحات سے زیادہ سکون و طمانیت بخش جاتا۔ نئی سحر کو وہ تر و تازہ کھلی کلی کی طرح خوش آمدید کہتی۔ سارا دن باپ سے ملنے والی سرد مہری کو وہ بڑی آسانی سے ثناء کی طرف سے ملنے والی مٹھاس میں لپیٹ کر نکل جاتی۔ باوجود یہ کہ مائرہ مرد ذات کو اتنی اہمیت نہ دیتی تھی کہ وہ اس کے لئے اپنی دنیا میں کوئی گنجائش نہ رکھتی۔ تمام برائیوں اور نفرتوں سے پاک دنیا اُسے بے حد عزیز تھی۔ وہ اس میں گم ہو کر رہ گئی تھی لیکن آج شام کے واقعہ نے مائرہ کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ جب نشہ میں دھت اس کا باپ لڑکھڑاتا اندر آیا۔ تخت پر بیٹھی آلو چھیلتی ثناء کو اپنے مضبوط اور کھردرے ہاتھوں سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکیل دیا۔ وہ بھی ماں کی طرح ہر ظلم سہتی آئی تھی۔ اس کے باپ نے کبھی بھی اس مٹی کے مادھو کو روتے نہ دیکھا تھا۔ اس کے وجود میں تو خاموشیوں کا ایک سمندر تھا۔ جو بے حد پرسکون نظر آتا تھا۔ لیکن وہ یہ دل خراش منظر نہ دیکھ سکی اور اپنے خول سے باہر نکل کر چل پڑی۔

اس کا ننھا سا ذہن اس منظر کی ہولناکی پر پھٹ پڑا بظاہر پرسکون سمندر کا غصہ کا جوار بھاٹا آ گیا۔

قصہ یہ تھا ساتھ والے میاں جی کے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی۔ تمام بری کے جوڑے ثناء کے پاس سلنے آ گئے۔ شب و روز کی محنت کے ساتھ اس نے سات دنوں کے اندر ہی گیارہ جوڑے تیار کر رہے تھے۔ مشین پر تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھوں سے کہیں زیادہ چلتا ہوا اس کا ذہن گلاب کی کلی کی طرح چٹکے ہوئے خیالات کے طلوع و غروب میں مصروف تھا۔ یہ خیال تو اس کی روح کو مسرور کر جاتا کہ اب ان کپڑوں کے سلنے کا معاوضہ اتنا مل جائے گا کہ وہ ہفتہ بھر سکون سے راشن خرید سکے گی۔ پھر باقی پیسوں سے وہ مائرہ کے لئے ایک نیا بہت ہی خوبصورت گھیر دار چمکدار فراک اور پاجامہ بنائے گی جو وہ میاں جی کے بیٹے کی شادی میں پہن کر غربت کو چھپا سکے گی۔ لیکن اس کی نصیبوں کی طرح سیاہ رات کو جب حاذق گھر میں داخل ہوا تو اس کی نظر سلے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر پر پڑ تو چمکیلے کپڑوں سے زیادہ ہی چمک اس کی آنکھوں میں در آئی۔ چہرے پر تھوڑی نرمی بکھیر کر وہ ثناء کے قریب کھسک آیا۔ ''دیکھ ثناء صرف چند دنوں کی بات ہے میں تمہیں تمام رقم لوٹا دوں گا۔ خدا کے واسطے پینے کے لئے ایک پائی بھی پاس نہیں جتنی بھی تیرے پاس رقم ہے دے دے۔ دوگنے پیسے واپس کروں گا۔

حاذق کا یہ ارادہ دیکھ کر ثناء ایک بار پھر لرز گئی۔ اس بار اس کے اندر کی عورت جل ہی تو گئی۔ وہ کسی قیمت پر اپنی شبینہ روز کی محنت کا معاوضہ حاذق کو دینا نہیں چاہتی تھی۔ اب تک وہ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتی آئی تھی۔ لیکن اپنی بیٹی کے لئے وہ یہ زیادتی برداشت نہ کر پائی۔ ہوش میں رہو حاذق اس بار ایک پائی بھی تمہارے حوالے نہ کروں گی۔ چاہے میرے ٹکڑے کر ڈالو۔ لیکن میں مائرہ کے لئے دیکھے گئے خوابوں کو ریزہ ریزہ نہ ہونے دوں گی، وہ زخمی ناگن کی طرح پھنکاری۔

حاذق کے لئے یہ بالکل غیر متوقع جملہ تھا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ پھر معاملہ بگڑتا ہی چلا گیا۔ تین زناٹے دار تھپڑ اس کے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھے۔ وہ ایک لمحے کے لئے لڑکھڑا گئی۔ اس کا ارادہ متزلزل ہونے لگا۔ لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی۔ وہ اپنی اس قربانی کو یونہی رائیگاں نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ وہ ایک دم پھر سے سنبھل گئی۔ خوب پٹائی کرنے کے بعد طیش میں گالیاں بکتا ہوا حاذق باہر چلا گیا۔ حاذق کے نکلتے ہی ثناء نے لمبی سی سانس لی۔ سکھ کی سانس اس کے خیال میں آج وہ جیت گئی تھی۔ اُسے ناکام و نامراد واپس لوٹا کر وہ دل ہی دل میں بہت مسرور ہوئی صبح وہ میاں جی کے ہاں سلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر دینے چل پڑی۔

باقی پیسے بھی لے کر اس نے تمام پیسوں کو گنا تو وہ کل ساڑھے تین ہزار بنے۔ اگرچہ اس کی محنت ان پیسوں سے بڑھ کر تھی لیکن وہ خوش تھی دوپہر کے کھانے کے بعد مائرہ کو اپنے پہلو میں لٹائے وہ ان پیسوں کا مصرف سوچنے لگی۔ ان کا ٹھکانہ کرنے کے منصوبے بنانے لگی۔ وہ نہال سی ہو گئی۔ جب تصور میں مائرہ کو میاں جی کے بیٹے کی شادی پر گھیر دار چمکیلا فراک اور پاجامہ پہلے دیکھنے لگی۔ اس کی تمام خوشیاں مائرہ کی خوشیوں سے منسلک تھیں۔ یہ سوچ کر وہ خود ہی مسکرا دی۔ لیکن شام کو آتے ہی حاذق نے

اس سے رات والی شکست کا بدلہ اس انداز میں لیا۔ کہ گھونسوں، مکوں اور لاتوں سے اُس کے ٹوٹے ہوئے وجود کو ادھ موا کر دیا۔ بالوں سے پکڑ کر اس کو باہر دھکیلا اور اندر سے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ مائرہ تڑپ کر روئی اور پچھاڑیں کھا کھا کر روتی رہی۔ اس بات سے بے خبر کہ ثناء کا کہیں اور ٹھکانہ نہیں۔ کہاں بھٹکے گی۔ وہ پرسکون کھڑا تھا، ظالم شخص پر اس بات کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس پر تو اپنی شکست کا بھوت سوار تھا جو شاید اب ماں کو بیٹی سے جدا کر کے اتر گیا تھا۔ ثناء مائرہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تڑپتی رہی لیکن اس ظالم کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ مارے خوف کے مائرہ ماں کے قریب ہونا چاہتی مگر باپ کی آنکھوں کے شعلے اس کا رستہ روک دیتے باہر کا شور سُن کر ہمسائے حسب معمول گھروں میں استراحت کرتے رہے۔ حاذق پر ثناء کی چیخوں اور مائرہ کے آنسوؤں کا کچھ اثر نہ ہوا اور اب مائرہ کے لئے قیامت خیز رات بن گئی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ تو شروع سے ہی نرم گرم بازو پر سر رکھ کر سونے اور لوری سنتے اور سامنے دیوار پر بنے چھوٹے سے سوراخ کے اندر کی دنیا میں سیر کرنے کی عادی تھی۔ مگر آج گھر میں وہ تھی اور اس کا اپنا باپ تھا۔ جس سے اُسے نفرت اور خوف کے ملے جلے جذبات نے خوفناک دیو بنا دیا۔ رات گئے تک وہ اپنی آنکھوں کو نمکین پانی کا چشمہ بناتی رہی۔ اس کی نگاہیں بے اختیار سامنے دیوار پر بنے سوراخ پہ جا پڑیں۔ ایک ہی لمحے میں وہ سسکیوں کے ساتھ چپ ہو گئی۔

آہستہ آہستہ اُس کے کانوں میں ماں کی میٹھی لوری کی مانوس آواز اس گھولتی گئی اور اس کے ذہن میں میٹھے دنوں کا سہارا لے لیا۔ وہ پھر اسی سوراخ کے اندر کی وادی میں جا نکلی۔ وہاں سے گھومتے گھامتے ایک کونے میں دبکی ہوئی ماں بیٹی نظر آئی۔ وہ لپٹ ہی تو گئی۔ صبح اگرچہ وہ تر و تازہ تھی لیکن رات گئے تک رونے جاگنے سے اس کی آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔

آج پہلی بار اس نے صبح کی روشنی میں دیوار میں بنے سوراخ کو غور سے دیکھا۔ اب تک اُسے سوائے رات کے دن کے اجالے میں اس کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ وہ رات کو تکے جاتی۔ یہ وہی تو تھا جو اُسے اس کی ماں کے پاس جانے کا خوبصورت اور آسان ذریعہ تھا۔ جو اُسے ڈھیروں سکون کی دولت سے مالا مال کرتا۔ اس کی دولت ہی وہ تھوڑی سی دیر کے لئے ہی سسکیوں کے درمیان چپ چاپ سکون کی وادی میں جا نکلتی۔ یہ ننھا سا سوراخ اُسے تھوڑا تھوڑا عزیز ہوتا گیا۔ مگر وہ اچانک تصورات کی دنیا سے نکل کر ماں کی تلاش اور اس کی آمد کا یہ شب بے چینی سے انتظار کرتی۔

ماں سے ملنے کی خواہشیں ہی دن اُس سے کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ رات وہ سونے کی کوشش کرتی لیکن اُس کے پاس ماں کی طرح نیند بھی نہ آتی۔ اچانک ہی اس سوراخ کے ذرا اوپر کی طرف دیوار کے اکھڑے پلستر پر اس کی نظر جا پڑی۔ ارے یہ تو بالکل امی کی شکل ہے۔ ذرا بھی تو فرق نہیں ویسے ہی ساڑھی باندھ رکھی ہے۔ جوڑا تو بالکل ویسا ہی ہے۔ جس طرح امی ہمیشہ سے بالوں کو گول کر کے پن لگا دیتی تھیں۔ وہ ایک دم چونکی۔ دیوار کے اکھڑے پلستر سے جو جگہ میں بے ترتیب شکل سے بنی ہوئی تھی۔ مائرہ کے تشنہ ذہن نے اُسے ثناء کی شکل دے ڈالی۔ کافی دیر اسی شکل کو تکے جانے کی وجہ سے اس کی نظر وہاں پر رک گئی۔ لیکن اس جگہ پر امی

نے اپنے لمبے بال پوری طرح کھول رکھے ہیں۔ ہاں شاید امی ابھی نہا کر آئی ہیں۔ کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ لمبے بال وہ ڈھیر سارا وقت اپنی خود ساختہ خیالی پیکروں کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی گزار دیتی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک نیا مشغلہ لگ گیا تھا۔ اس نے اپنی تنہائی کو خوش رکھنے کا نیا انداز اپنا لیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ پرچھائیوں چمٹتی گئی۔ سائیوں کے پیچھے بھاگنے لگی۔ اس نے سائیوں میں سایہ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ گھر میں پڑے باپ کے وجود کو بالکل ہی خاموش کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس کی یہ ذہنی صلاحیت نشوونما پاتی گئی۔ اب وہ بڑی آسانی کے ساتھ شکستہ دیواروں پر اکھڑے پلستروں سے اپنی ذہنی اپج کے مطابق ماں کے تصوراتی ہیولوں سے آگے بڑھ آئی تھی۔ مائرہ نے اسی خیالی دنیا میں رہتے ہوئے تیزی سے اپنی عمر کے کئی سال بتا دیئے تھے۔ لیکن اپنا دکھ۔ اپنی تشنگی کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔ چپکے چپکے تمام درد و غم اکیلے ہی اپنے اندر ہی اندر سمو لی رہی۔ اب تو راہ چلتے وہ ہر گزرتی عورت کو گھور گھور کر دیکھتی۔ لیکن بعد میں اپنی اس حرکت پر کافی پشیمانی ہوتی۔ گھورنے سے بھی جب کام نہ بنا تو بعض اوقات وہ بے اختیار ہو کر کسی عورت کے ڈوپٹے کا پہلو پکڑنے کو ہاتھ بڑھاتی۔ پیچھے سے اُسے اپنی ماں کا وجود نظر آتا۔ لیکن چہرے سے مایوس ہو کر ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا۔ نہ جانے اس کی ماں کی لمبی دعاؤں کا اثر تھا یا پھر اُس کے صبر کو قرار آ گیا کہ گھر بیٹھے بٹھائے بن ماں کی لڑکی کا ایک بڑا ہی اچھا رشتہ آ گیا۔ باپ بھی نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ اُس نے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی اور منظور کر لیا۔

یقیناً ابا میرے وجود کا بوجھ اُتر جانے کی وجہ سے خوش خوش پھر رہے تھیں۔ پھر تو انہیں اور بھی کھلی آزادی ہوتی۔ خوب عیاشی کریں گے۔ جب اس کے کان میں اپنے رشتہ کی بھنک پڑی تو اس نے اپنے باپ کے متعلق یہ سب سوچ ڈالا جو آج کل کافی خوش تھا۔ اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے مستقبل سے ہراساں اور خوف زدہ بھی تھی۔ نہ جانے وہ لوگ کیسے ہوں۔ میرے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہوگا۔ جس کے ساتھ عمر بھر کا بندھن بندھ رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہیں ابا کی طرح تو...... اب یہیں آ کر اُس کی تمام سوچنے سمجھنے کی قوت جواب دے جاتی۔ شادی کے دوسرے دن ہی اُس نے اپنے تمام گزشتہ خیالات پر ہزاروں بار لعنت بھیجی وہ اتنی مسرور تھی کہ اس کا ماں کی محبت سے محرومی کا احساس تھوڑے دنوں کے لئے مٹ گیا شیراز نے بھی تو مائرہ کو لڈ نوٹ کر چاہا تھا۔ نہ جانے کونسی ادا میرے بدھو کو بھا گئی یہ سوچ کر خود ہی مسکرا پڑی۔ لیکن یہ مسکراہٹ امر نہ تھی۔ پائیدار نہ تھی۔ ایک بلبلے کی مانند تھی پیدا ہوتے ہی ہزاروں قوس قزاح کے رنگ دکھلاتا ہے اور پلک جھپکتے ہی میں اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے۔ مائرہ کے دو ماہ بڑے آرام سکون اور خوشیوں کے پنڈولوں میں جھولتے ہوئے گزرے لیکن پھر شیراز ہوش میں آ گئے اور مائرہ کو بھی ہوش دلا گئے۔ دن رات اپنے کام میں مصروف وہ مائرہ کو تقریباً بھول چکے تھے۔ ایک بار وہ پھر اکیلی ہو گئی۔ دوبارہ اس کے ذہن کے دروازے میں پرانی سوچیں خوبصورت خیالی پیکر اثناء کے ہیولے در آئے۔ وہ انہی میں کھو کر رہ گئی۔ شیراز کو جب بھی ٹائم ملتا وہ مائرہ کے تمام گلے شکوے دور کرنے کی بھرپور کوشش کرتا لیکن اس کی کوشش خواہش بن

جاتی اور مائرہ کے لئے وہ حسرت شیراز کے پاس وقت کم ہوتا اور کام زیادہ اس نے بھی دنیا بھر کے بکھیڑے اپنے ساتھ لگا رکھے تھے۔ وہ پھر پرچھائیوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے لگی اور سائے میں اپنے لئے سایہ تلاش کرنے لگی۔

شیراز جب بھی آفس ہوتے تو وہ ڈھیروں ماضی کی باتیں دہرا پاتی جگہ جگہ سے اکھڑے پلستروں اور شکستہ دیواروں والی جگہیں اُسے بے حد عزیز تھیں۔ ان کو بھول کر پہلے دن سے ثناء کی مختلف انداز میں شبیہیں بناتی پھر وہ جگہیں اس کو بے حد پیاری ہو جاتیں۔ اس کی زندگی میں دو ماہ کے ٹھہراؤ آ جانے کے بعد سے اس کے ذہن کی مشینری پر کسی غیر اہم سے دھبے کو بھی دیکھ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ دوپہر کو روٹیاں پکاتے وقت اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ لاشعور میں اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں۔ اُس نے ثناء کے اٹھنے بیٹھنے اور حرکت کرنے کے مختلف انداز ان آٹے کی روٹیوں میں سمو دیئے۔ ہر پکنے والی روٹی اپنی الگ شکل لے آتے۔ ذہنی طور اور باہر کی دنیا سے بالکل الگ ہو کر اس نے دوپہر کو ہر ڈیزائن کی روٹی بنا ڈالی۔ ایسے میں بے تحاشا سکون اس کی روح میں اتر گیا۔ ایک دم وہ مسرور ہو گئی۔ ساس نے پہلی دفعہ اس کو کھانے کے دوران زبردست ڈانٹ پلائی۔

پھوہڑ، بدسلیقہ، دوسروں کو الو بنانے والی نجانے کیا کیا کچھ کہہ ڈالا۔ وہ بڑے سکون و اطمینان سے یہ ساری کی ساری ڈانٹ سہہ گئی۔ کیونکہ اس ڈانٹ سے کہیں زیادہ اس کو الٹی سیدھی روٹیاں پکانے میں اطمینان اور خوشی ملی تھی۔ شیراز کو وہ سب کچھ بتا ڈالتی تھی لیکن وہ ہمیشہ اس کی مزے مزے کی باتیں بھی خالی ہوں ہاں میں ٹال دیتا۔ آج بھی جب شیراز آفس سے گھر آیا وہ اس کو آج کی واردات کہہ سنائی۔ لیکن وہ ہنس کے ٹال گیا۔ اس کا ذہن پھر بدک گیا اور تشنگی کا احساس اور بڑھ گیا۔ صبح وہ جب ناشتہ بنا کر فارغ ہوئی تو شیراز نے اسے کچن میں ہی اپنے کپڑے استری کرنے کے لئے لا دیئے۔ وہ جلدی سے برتن اٹھا کر اکٹھا کرنے لگی۔ اور ہاتھ دھو کر استری کرنے چل دی۔

شیراز کی شرٹ ہلکی گلابی زمین پر سفید اور میرون رنگ کے بے حد چھوٹے بڑے دائرے پوری شرٹ پر پھیلے ہوئے تھے۔ جونہی اس نے استری کرنے کے لئے شرٹ کو پھیلایا۔ اس کے شعور کی دنیا ایک دم بٹ گئی۔ لاشعور اپنی پرانی روش پر چل پڑا۔ مائرہ ان دائروں میں الجھ کر رہ گئی۔ معمولی اور غیر اہم اشیاء کو ایک خاص شکل دے کر اپنے ذہن کو محرومیوں سے بچانے والی اس کی حس بیدار ہوتی گئی۔ اس کو یوں لگا جیسے ایک دن جب وہ کسی چیز کے لئے ضد کر رہی تھی تو ثناء نے اُسے بہلانے کے لئے ایک چھوٹے سے مگ میں پانی صابن ملا دیا۔ اور شیشے سے بنی ایک نلی اس کے منہ میں ڈالی اور دوسری نلی اس کے منہ میں ڈالی اور دوسری اپنے منہ میں پکڑ لی۔ اب دونوں ماں بیٹی نے اس پانی سے رنگین بلبلے بنا بنا کر ہوا میں چھوڑنے شروع کر دیئے (ساتھ ہی ساتھ غیر ارادی طور پر اس کو ہاتھ قمیض کو استری کر رہے) جو بلبلے دھوپ میں چلے جاتے وہ میرون رنگ کے یا کسی شوخ سے رنگ کے بن جاتے اور جو ہلکی پھونک مارنے کی وجہ سے سایہ میں جا پڑتے وہ عموماً سفید ہی ہوئے اس کی امی سے اس کے نسبت بڑے بڑے بلبلے بن رہے تھے۔ مائرہ کی بہت کوشش ہوتی کہ وہ بھی امی کی طرح بڑے بڑے بلبلے بنائے۔ لیکن ایسا نہ کر سکی ایک دفعہ جو اس نے شیشے کی نلی میں زور سے پھونک ماری۔ ایک لمبی سی چھوٹے بڑے بلبلوں کی قطار ثناء کے منہ پر جا پڑی۔ دونوں ماں بیٹی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ یہ سب سوچتے ہوئے وہ خود بھی مسکرا پڑی۔ لیکن نتھنوں میں جلی ہوئی قمیض کے بو گھس جانے سے وہ لاشعور میں سے واپس آ گئی۔

شرٹ کی تقریباً آدھی آستین جل چکی تھیں۔ اُسے نہایت شرمندگی ہوئی۔ اب شیراز کو وہ کیا جواب دے پائیگی۔ وہ دل ہی دل میں خجل ہوئی۔ اتنے میں شیراز کپڑے لینے کے لئے کمرے میں آئے تو پریشان و ہراساں مائرہ کی شکل اور جلی شرٹ کی طرف دیکھ کر ساری چویشن سمجھ گئے۔

کوئی بات نہیں لاپرواہی سے کہہ کر دوسری شرٹ پہن کر وہ چلے گئے۔ ان کی سرد مہری مائرہ کا دل جلا گئی۔ ایسے میں اس کی خواہش ابھری کہ دل جلا گئی ایسے میں اس کی یہ خواہش ابھری کہ شیراز ابا کی طرح اس بات پر میرے ساتھ بگڑ پڑے۔ تقریباً ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ لیکن ہنگامہ کرنے کا شیراز کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ ساس تو پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی اس بات پر اور بھی بھڑک اٹھی۔ جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ یہاں تک کہ محلے کی عورتوں کو بھی بڑھا چڑھا کر باتیں سنائیں۔ تب سے وہ اب نارمل اور پاگل کہلانے لگی۔

شیراز نے ان باتوں کی پرواہ نہ کی اور مائرہ کو بھی اس بات پر دھیان نہ دینے کی نصیحت کرتے ہوئے اس کا دل بہلانے کے لئے شادی کے دو سال بعد آج پہلی بار شاپنگ کرانے کے لئے اپنے ساتھ لے گئے۔ کافی دکانیں گھومنے کے بعد آخر ایک دکان پر اُس کو ایک پرنٹ پسند آ ہی گیا۔

''کیا ہے شیراز یہ پرنٹ اچھا لگے گا۔ لے لوں؟''

''اچھا ہے لے لو۔'' تمام جذبات سے عاری ٹھنڈا جواب سن کر وہ بجھ سی گئی اور خاموشی سے سوٹ کا کپڑا لے کر گھر آ گئی۔

ذہن بوجھل ہونے کے باوجود بھی وہ آ کر سوٹ اسٹیچ کی تیاری میں مشغول ہو گئی۔ قینچی لے کر جب اس نے کپڑا چیک فرش پر پھیلا دیا تو پھر اس کا ذہن پٹڑی سے اتر گیا۔ اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپنے لگے۔ کالی ساڑھی میں لپٹا ثناء کا وجود اس کے ذہن میں در آیا۔ جس نے اپنے لمبے سیاہ بالوں میں سرخ گلاب کے پھول اڑس رکھا ہو۔ کپڑے پر ایک تصویر کے ڈھیروں عکس تھے اس نے بڑے آرام سے جہاں جہاں پر ثناء کا ساڑھی میں لپٹا وجود اور بالوں میں لگا پھول الگ ہوتا اتنے ہی احاطے کا کپڑا وہ الگ کر لیتی۔ باقی کپڑے کے ساتھ بھی اس نے یہی سلوک کیا۔ حتیٰ کہ سارے کپڑے کا ستیاناس کر کے وہ بہت نہال تھی۔ اتنا خوش تو وہ سوٹ پسند کرنے پر بھی نہ ہوئی تھی یہ تمام کپڑے اس نے سنبھال کر اپنے سوٹ کیس میں حفاظت سے رکھ دیئے۔ ساس نے جب دیکھا تو سر پیٹ کر رہ گئی۔ تو اس کے علاوہ اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

شیراز حسب معمول اس بات کو نظر انداز کر گیا۔ اصل وہ بخوبی جانتا تھا کہ مائرہ کن محرومیوں کا شکار ہے۔ لیکن بے حد مصروف ہونے کے باعث وہ مائرہ کی مدد بھی نہ کر سکتا تھا اپنی جگہ پر مجبور تھا۔ شادی کے پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی مائرہ کی گود سونی تھی۔ ساس کی ڈانٹ پچھلے دو سالوں سے لڑائی جھگڑے اور طعنوں میں بدل گئی تھی۔ قدم قدم پہ اس کی دل

بکنی کر کے اس کے اندر ٹھنڈک سی پڑ جاتی۔ ایسے میں مائرہ کی آنکھیں جل تھل ہو جاتیں۔ ان ہی لمحات میں کوئی غمگسار ہستی بری طرح یاد آئی۔ سوائے تڑپا دینے کے وہ بھی کیا کر سکتی تھی۔ ایسے میں خدا سے ڈھیروں شکوے گلے کر ڈالتی۔ روزانہ کی زہر بھری باتوں سے وہ ذہنی مریضہ بنتی گئی۔

اس کی بے تکی حرکات میں اضافہ ہونے لگا جو اس کی ساس کے لئے نا قابل برداشت تھا۔ لیکن مائرہ کو کچھ حد تک شیراز کا سہارا تھا۔ کیا ہوا اس کا رویہ میرے ساتھ سرد سا ہوتا ہے۔

وہ میرے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ لیکن وہ نفرت بھی تو نہیں کرتا۔ اس نے تو کبھی بھی کسی بات کا احساس نہیں ہونے دیا کبھی نہ شکایت کیا حرف نہیں ان کی زبان سے نہ نکالا۔ یہ خیال مائرہ کے دل کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ اپنی زندگی کو محدود رکھے۔ چپ چاپ وہ گھٹتی چلی گئی۔

شیراز کو کچھ خیال آیا تو وہ زور زبردستی کر کے ضد کر کے اسے سرسبز پہاڑی علاقے میں لے گیا۔ شاید وہ کچھ عرصہ تک وہ بہل جائے اُسے گھٹے ماحول سے نکال کر شیراز نے نہایت عقل مندی کی لیکن اپنی مصروفیت کے باعث مائرہ کے خیالات تک پہنچنے کی کبھی کوشش کی یہاں آ کر مائرہ کچھ حد تک بہل گئی شام کے وقت بادلوں کی ہلکی سی تہہ آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ تھوڑے وقفے کے بعد سورج نکلا تو دھوپ بہت خوبصورت لگتی۔ وہ اونچے لمبے درختوں اور سرمئی لمبی سی قطار میں کھڑے پتھریلے اونچے پہاڑوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ سورج کی کرنیں اونچے اونچے پہاڑوں کے پیچھے چھپ جانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ اس نے دیکھا کہ شیراز خاموش بیٹھا ندی کے کنارے اپنی کاروباری گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا۔ نظارہ کرتے ہوئے وہ شعور و لاشعور میں ڈولنے لگی۔ پہاڑوں کی سرمئی رنگت اور ڈوبتے سورج کی زردی اس کے ذہن میں عجیب حال ڈال رہی تھی۔ دوسرے لمحے وہ دونوں سے سرمئی اور زردی کے رنگوں کو گھورنے لگی۔ بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا ماں بچپن میں جو لوری سناتی تھی۔ اس کے آخر میں وادی کا یہی منظر تو ہوتا تھا۔ یہی سورج چھپنے کا انداز اور پہاڑوں کا رنگ ہاں بالکل یہی۔ ویسے کا دیا امی کا ٹھکانہ ادھر ہی ہوگا۔ اسی وادی میں انہی رنگوں میں اس کے دل نے اس کے دماغ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ ایک جذب کے عالم میں اٹھی اور بے تابانہ ان رنگوں میں کھو جاتے اپنے آپ کو ان کے اندر سمو لینے کے لئے بھاگتی گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ چند قدم آگے نگاہوں سے اوجھل ایک عمیق کھائی اُسے اپنی آغوش میں چھپا لینے کو بے تاب ہے۔

✧✧✧

سحرش خان

”جب آئے گا عمران سب کی جان بنے گا نیا پاکستان“ ٹی وی پر سر لگا کر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی گا رہا تھا اور جاوید منزل کے بڑے سے ٹی وی لاونج میں صوفے پر دونوں پاؤں رکھے ماہی اور اس کی ستر سالہ دادی شمیم آرا اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھیں۔ اور ساتھ ساتھ فروٹ بھی کھا رہی تھیں۔

”دادی آپ کی آواز تو بہت اچھی ہے یقیناً آپ جوانی میں کافی مشہور ہوں گی“، ماہی نے سیب کاٹ کے دادی کو پکڑایا اور ساتھ ہی ان کی تعریف بھی کی جس سے دادی کھل اٹھیں۔ عمر کوئی بھی ہو تعریف ہر عورت کو ہمیشہ خوش کرتی ہے۔

”اور نہیں تو کیا بڑے چرچے تھے میرے اور اللہ بخشے تمہارے دادا وہ تو اکثر مجھ سے غزلیں سنتے تھے“، دادی کی بات ابھی جاری تھی کہ عمران خان صاحب نے مائیک سنبھال لیا اور پھر دادی پوتی اپنے پسندیدہ لیڈر کی تقریر کے دوران بلکل خاموش بیٹھی رہیں۔ بولیں تو تب جب اکبر صاحب تشریف لائے اور اپنی ماں اور بیٹی کو ٹی وی کے سامنے براجمان پایا وہ لاحول ولا پڑھتے کمرے میں چلے گئے جہاں پہلے ہی پروین ٹی وی لاونج کے خالی ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔

”آپ یقیناً اس لیے یہاں بیٹھی ہیں کیونکہ لاونج میں دادی پوتی کا قبضہ ہے؟“ اکبر نے مسکرا کر پروین سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور ساتھ ہی بولیں۔

”ان کو چھوڑیں آپ یہ بتائیں کہ ماہی کے لیے جو لڑکا دیکھنے گئے تھے اس کا کیا بنا؟“

”لڑکا اچھا ہے جاب بھی اچھی ہے لیکن

مسئلہ یہ ہے کہ اس کا نام صارم ہے جبکہ یہ دادی ہوتی تو عمران نام کی ضد لگا کر بیٹھی ہیں۔ ماہی تو بچی ہے لیکن اماں بھی دیکھو ساتھ بچی بن چکی ہیں۔ بھلا نام سے کیا فرق پڑتا ہے اور دوسری بات کون بے وقوف ہے جو کسی لیڈر کے لیے اتنا جذباتی ہو،، اکبر پریشانی سے بولے۔ اور مایوس سے چینج کرنے گھس گئے کیونکہ اپنی ماں اور اکلوتی بیٹی کی ضد سے بہت پریشان تھے۔ جن کا کہنا تھا کہ ماہی کی شادی ہوگی تو بس عمران نام کے لڑکے سے۔

دوسرے دن اکبر دفتر گئے تو وہاں ایک نیا لڑکا آیا تھا جسے دیکھ کر اکبر نے پہچان لیا وہ اکبر کے دوست کا بیٹا تھا۔ اس نے بھی اکبر کو پہچان لیا اور بتایا کہ میں مانی ہوں جہانگیر کا چھوٹا بیٹا۔ مانی نے ہی اکبر نے جہانگیر کو نمبر لیا تو یوں ایک بار پھر ٹوٹی دوستی بحال ہوگئی۔ جہانگیر کے دو بیٹے تھے وہ اکبر سے ملنے گھر آیا تو اسے ماہی بہت اچھی لگی اس نے جھٹ ہی مانی کے لیے ماہی کا رشتہ دے دی دیا لیکن اکبر نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ پریشان ہوگیا جہانگیر کو اپنی مجبوری بتا کر انکار کر دیا۔ لیکن جہانگیر مسکرانے لگا اور کہنے لگے بہو تو میری ماہی ہی بنے گی،،

دوسرے دن ہی جہانگیر اپنی بیوی اور دونوں بیٹوں کامی اور مانی کے ساتھ باقاعدہ رشتہ لے کر حاضر ہوگیا۔ اور دادی جان سے اپنے بیٹے عمران عرف مانی کے لیے ماہی کا رشتہ مانگ لیا۔ دادی نے جھٹ سے ہاں کر دی اور ایک ہفتے بعد منگنی اور پھر مہینے بعد ہی شادی رکھ دی گئی۔ مانی کو ذہین آنکھوں والی ماہی بہت پسند آئی اور ماہی نے بھی چائے رکھتے ہوئے چپکے سے مانی کو دیکھ لیا تھا ماتھے پر آتے سلکی بال بار بار ہٹاتے ہوئے اسے مانی بہت بھلا لگا۔ مانی بھی ماہی کی عمران نام والی شرط سن چکا تھا اس لیے وہ ماہی سے بات کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے ایسی انوکھی خواہش یا شرط وہ بھی شادی جیسے بندھن کے لیے پہلی بار سنی تھی۔ اگر انسان سچے دل سے کوئی خواہش کرے تو اللہ کوئی نہ کوئی رستہ نکال ہی دیتا ہے اور یہ ہی مانی کے ساتھ بھی ہوا۔ گھر والوں نے کچھ سامان ماہی کے گھر دینے کو بھیجا تو دروازہ ماہی نے ہی کھولا۔

،،آپ یہاں ۔۔؟ مانی کو اچانک اپنے دروازے پر دیکھ کر ماہی گھبرا گئی۔

،،جی یہ امی نے کچھ سامان بھیجا ہے،،

،،اچھا،، ماہی شاپر لے کر اندر جانے لگی تو مانی نے آواز دی۔

،،اس انوکھی خواہش کی وجہ جان سکتا ہوں؟

،،نہیں جان سکتے بس اتنا جان لیں کہ یہ مجھ سے زیادہ میری دادی کی خواہش ہے۔ ان کو عمران نام کا داماد ہی چاہیے تھا۔ جو الحمدللہ مل گیا ،، ماہی نے مسکرا کر کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ مانی یہ بھی نہ کہہ سکا کہ اپنے ہونے والے شوہر کو چائے پانی ہی پوچھ لو۔

✣✣✣

منگنی کے پنک جوڑے میں ماہی حوروں کو شرما رہی تھی۔ مانی بار بار چور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کامران نے بھائی کی بے چینی دیکھی تو کہا۔

،،اپنے دل کو سنبھالو بھیا بس چند دن کی دوری ہے۔ پھر یہ عجیب وغریب شرطوں والی عجیب وغریب مخلوق تیرے ساتھ ہوگی ،، مانی نے بھائی کو گھورا مبادا ماہی کے بارے جو وہ کہہ رہا ہے کوئی سن نہ لے اور کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔ منگنی کے بعد شادی کی تیاریوں میں دن پر لگا کر اڑ گئے۔ ہر روز شاپنگ، بازار کرتے

کرتے آخر کار وہ دن آ گیا کہ جب مولوی صاحب نے اجازت طلب کی۔

،،ماہین اکبر آپ کو نکاح نعمان ولد جہانگیر کے ساتھ قبول ہے ،، ماہی نے جلدی سے گھونگھٹ اٹھایا اور آنکھیں پھاڑ کے پہلے مولوی پھر اپنے بابا اور پھر جہانگیر کو دیکھا۔ اکبر نے آنکھوں آنکھوں میں منت کی کہ بیٹا اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ماہی نے دادی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن سب نے بہت چالاکی کے ساتھ انہیں مہمانوں میں الجھائے رکھا تھا۔

رخصتی کے وقت ماہی دادی کے گلے لگ کر بہت روئی لیکن دادی ماہی کا اتنا شدید رونا یہ سمجھ کے برداشت کر گئیں کہ ہر لڑکی رخصتی پر آنسو بہاتی ہے اور ماہی چونکہ لاڈلی ہے تو زیادہ رو رہی ہے۔ سسرال میں ضروری رسمیں کرنے کے بعد ماہی کو جب حجلہ عروسی میں پہنچایا گیا تو ماہی ہنوز غصے میں بھری بیٹھی رہی۔ نعمان کو بھی اندازہ تھا اس لیے خاموشی سے اندر آیا اور بیڈ کی سائیڈ پر ٹک گیا

،،مجھے پتا ہے میں نے غلط کیا لیکن میرا گناہ اتنا بڑا نہیں کہ معافی نہ مل سکے۔ کیا ملکہ عالیہ کے دربار میں اس غلام کو معافی نہیں ملے گی،، نعمان نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔

،،آپ نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور دادی۔۔۔۔۔۔ دادی بہت غصہ ہوں گی،، ماہی بس اتنا ہی کہہ سکی۔

،،اصل میں جب ہم آپ کو دیکھنے گئے تو مجھے اس انوکھی خواہش کا علم نہیں تھا۔ مجھے آپ بہت اچھی لگیں لیکن ابو نے جب آپ کی اس خواہش کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ آپ کو میرا نام مانی بتایا جائے۔ بعد میں میں آپ کو منا لوں گا۔ کیونکہ آپ کی یہ شرط مجھے بے تکی سی لگی اور اس بے تکی شرط کی وجہ سے میں آپ سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اتنی ہمت کر لی،،

لیکن۔۔۔۔۔۔،، ماہی نے کچھ کہنا چاہا لیکن نعمان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

،،ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ ہمیں زندگی میں کئی لوگ پیارے ہوتے ہیں اور ہمارے آئیڈیل بھی ہوتے ہیں تو ضروری نہیں کہ شادی جیسے بڑے معاملے میں اس کو شامل کیا جائے۔ تم دادی کو سمجھاؤ گی تو دادی سمجھ جائیں گی کہ تم اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہو اور تمہارا شوہر کسی بھی عمران سے بہت اچھا ہے۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو میں تم کو مایوس نہیں کروں گا تم مجھے معاف کر دو تاکہ میں تم کو منہ دکھائی کا تحفہ دوں ،، نعمان نے جیب سے مخملی ڈبیہ نکالی جس میں خوبصورت کنگن تھے۔ ماہی نے ایک بار میاں کو دیکھا پھر کنگنوں کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ نعمان بہت خوش ہوا جانتا تھا وہ ماہی کو منانے میں کامیاب ہو جائے گا اور صبح ماہی کے ساتھ جا کر دادی کو بھی منا لے گا کیونکہ بزرگوں کے دل سخت نہیں ہوتے وہ بچوں جیسے معصوم دل رکھتے ہیں۔ دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا تو ماہی نے سوچا جب اللہ نے میرا ساتھ نعمان کے ساتھ لکھ دیا تو میں کون ہوتی ہوں اپنی انوکھی شرطیں منوانے والی۔

✣✣✣